قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2014، قیمت -/15

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

68واں جشن آزادی

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط 3

انٹرویو
خیام — صدر عالم گوہر 5

کور اسٹوری
جدوجہد آزادی ابھی جاری ہے! — انیس الحسن صدیقی 10
پیر علی شہید: 1857 کی جنگ آزادی کا گم شدہ مجاہد — محمد انوار الحق تبسم 14
جنگ آزادی کی فراموش کردہ شخصیت مجاہد آزادی نجو خان — عبداللہ خالد 17
دو مشہور انگریز شاعر اور ہندوستان کی آزادی — ظفر سعیدی 20
مولانا فیض احمد بدایونی دور غلامی کے محب وطن عالم دین — محمد تنویر خاں قادری 22
تحریکِ آزادی اور اردو — درخشاں تاجور 26
اردو زبان کے فروغ میں ریشمی رومال تحریک کا کردار — ابرار احمد اجراوی 29

زبان و تعلیم
اسکولی سطح پر اردو زبان کی تدریس کے مسائل اور تقاضے — محمد نعمان خان 33
اردو زبان کی تاریخی اہمیت — محمد نور الحق 36

تخلیق و تجزیہ
چاند نزدیک ہے — زکی انور 38
'چاند نزدیک ہے' کا تجزیہ — اختر آزاد 40

ادبی مباحث
افسانے میں کردار نگاری کی اہمیت — محمد بشیر مالیر کوٹلوی 43
نسائی شاعری اور صنفی مساوات — حلیمہ فردوس 47
ڈاکٹر محمد حسن کی فراق شناسی — ریحان حسن 49
ساغر نظامی کی قومی شاعری کا جائزہ — بے بی تبسم 51

مشاہیر ادب
نجیب محفوظ کی روشن عبارتیں — جسیم الدین 54
'شوگر اسٹریٹ' کا ایک باب — نجیب محفوظ 56

ہماری مطبوعات
غالب اور عیوبِ قوافی — حنیف نقوی 58

ہم نے جنھیں بھلا دیا
ڈاکٹر مطیع اللہ خاں درانی، حسرت کمالی — خالد حسین خاں 60
اعظم کریوی: افسانہ نگار — جہاں گیر حسن مصباحی 63

تہذیب و ثقافت
پاکستانی افسانے پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات — حسین الحق 65

صحت
منفعت سے بھرپور پھلوں اور

سبزیوں کے رنگ — شمیم ارشاد اعظمی 70

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف 73

عالمی اردو نامہ
چند سیپیاں سمندروں کی — سید یحییٰ نشیط 83
عالمی خبریں — ادارہ 86

خبر نامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 88

ماہنامہ اردو دنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi
قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:16 شمارہ:08 اگست 2014

مدیر : ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539000

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

ہماری بات

کسی ملک یا کسی قوم کی آزادی کا صرف یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اس کی حکومت اور اس کا نظم ونسق آزاد ہو جائے۔ آزاد ملک اور آزاد قوم کہلانے کی حق دار صحیح معنوں میں صرف وہ قومیں اور وہ ملک ہیں جو حکومتی سطح پر ہی نہیں سماجی، اقتصادی، معاشی اور فکری سطحوں پر بھی آزاد ہوں۔ جہاں سماج ان تمام رسموں اور رواجوں سے چھٹکارا پا چکا ہو جو اسے پیچھے لے جاتے ہیں اور بحیثیت مجموعی پورے ملک کی ترقی کی راہ میں روکاوٹ بنتے ہیں جو اقتصادی اور معاشی طور پر اتنے مضبوط ہو چکے ہوں کہ ان شعبوں میں عوام کی خوش حالی کے لیے سبھی طرح کے فیصلے کسی بھی اندرونی یا بیرونی دباؤ کے بغیر لے سکیں۔ جس کے عوام اظہار رائے کے لیے آزاد ہوں۔ ہر متنازعہ امر پر وہ غیر جانب داری سے کسی بھی تعصب یا جھکاؤ کے بغیر کھلی بحث کرنے اور پھر سبھی کی انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود اور مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر کوئی ایک متفقہ رائے قائم کرنے کے عادی ہو چکے ہوں۔

پندرہ اگست کی تاریخ ہر سال آتی ہے۔ اس روز صبح سویرے لال قلعے پر قومی پرچم لہرایا جاتا ہے۔ وزیر اعظم پوری قوم سے خطاب کر کے اسے موجودہ صورت حال اور مستقبل کے عزائم سے متعلق اپنی جمہوری حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں بتاتے ہیں کہ قومی و ملکی ترقی کے لیے حکومت نے کیا نقشہ تیار کیا ہے۔ پورا ملک ان کی قیادت میں آزادی کی خوشی مناتا ہے۔ ہر شہر ہر قصبے اور ہر بستی میں جشن آزادی کے جلسے ہوتے ہیں۔ قومی ترانے گائے جاتے ہیں۔ رنگارنگ محفلیں سجتی ہیں۔

لیکن یہی تاریخ اپنے ساتھ وہ موقع بھی لاتی ہے کہ ہم سنجیدگی سے اپنے حالات پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ پچھلے برسوں میں ہم نے کیا پایا اور کیا کھویا ہے۔ کہاں ہم آگے بڑھے ہیں۔ کہاں پیچھے رہ گئے ہیں۔ کس شعبے میں کتنا کام ہم کر چکے ہیں اور کتنا ابھی کرنا باقی ہے۔ اس کے ساتھ یہ ملک وقوم کے سماجی اور فکری رویّوں کا جائزہ لینے کا بھی موقع ہوتا ہے۔ بہت گہرائی میں نہ جا کر اوپر سے ہی موٹے پر دیکھیں تو ہم پائیں گے کہ ہمارا سماج ابھی تک فرسودہ خیالات اور عادتوں کے جال میں جکڑا ہوا ہے۔ عورتوں کو ہم میں بہت سے لوگ آج بھی مرد سے کم تر سمجھتے ہیں۔ سائنس کے میدان میں ہم بہت آگے بڑھ چکے ہیں لیکن سائنسی سوچ ہمارے یہاں ابھی تک فروغ نہیں پا سکی ہے۔ ہم میں بہت سے لوگ آج بھی تنتر، منتر اور جادو میں یقین رکھتے ہیں چنانچہ آئے دن نقلی باباؤں، تانترکوں اور 'سفلی علم' کے دعوے داروں کی وحشیانہ اور شرم ناک حرکتیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ ہمارے آس پاس دن رات جھوٹ بولا جاتا رہتا ہے مگر ہم بہرے بن جاتے ہیں۔ لوگ چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ہماری آنکھوں کے سامنے رشوتیں دیتے رہتے ہیں اور ہم ایسے ہر منظر کو دیکھ کر بھی نہ صرف نظر انداز کر دیتے ہیں بلکہ بعد میں خود بھی اس کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ہم اپنے کئی سیاسی رہنماؤں پر طرح طرح سے انگلیاں اور سوال اٹھاتے ہیں لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ انھیں ہم نے ہی اپنا رہنما بنایا ہے۔ اسی طرح ہمارے سیاست کار بھی صرف حصول اقتدار کو نصب العین بنائے رہتے ہیں۔ سماجی رویّوں کو صحیح سمتوں میں لے جانا بھی ان کی ایک بڑی ذمہ داری ہے یہ بات وہ بھول جاتے ہیں۔ یاد کیجیے بابائے قوم مہاتما گاندھی کو۔ گاندھی جی کے لیے حصول آزادی اصل قومی مقصد ضرور تھا مگر سماجی مسئلوں کو انھوں نے کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ چھوا چھوت کے خلاف انھوں نے بڑی مضبوط تحریک چلائی۔ قومی طور طریقوں میں ہر قسم کے تشدد کی مخالفت کرنا جب ان کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا تو انھوں نے سول نافرمانی کی تحریک تک واپس لے لی تھی۔ تقسیم وطن کو وہ اپنی سب سے بڑی ناکامی مانتے تھے چنانچہ انھوں نے آزادی کا جشن بھی نہیں منایا اور دمِ آخر تک ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں خود کو کھپائے رکھا۔

ان سبھی زاویوں سے دیکھا جائے تو ہم آج بھی خود کو پوری طرح آزاد نہیں کہہ سکتے۔ ہم آج بھی اپنی سماجی، ذہنی اور فکری خامیوں کو دور نہیں کر پائے ہیں اور اپنے رویّوں کو نئے تقاضوں کے مطابق نہیں ڈھال پائے ہیں۔ پہلے ہم انگریزوں کے غلام تھے۔ آج ہم اپنی اجتماعی اور انفرادی کج روی اور ذہنی کشاکشوں کے اسیر ہیں۔ ہمارے سامنے مواقع کا بھرپور سمندر موجزن ہے۔ آگے بڑھنے کے ہزاروں راستے ہمیں اپنی طرف بلا رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان موقعوں اور راستوں کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ تبھی ہم غریبی، بے روزگاری، مہنگائی اور کرپشن جیسے اُن بنیادی معاشی اور اقتصادی مسئلوں کو سلجھا سکیں گے جن کے حل میں ہی ہمارے باقی سماجی اور ذہنی مسئلوں کے حل بھی چھپے ہوئے ہیں اور جن سے نجات پانے کے بعد ہی ہم خود کو پوری طرح آزاد کہہ پائیں گے!

(پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

کرشن بھاوک

گورونانک نگر، گلی نمبر 18-k، پٹیالہ (پنجاب)

جولائی کا 'اردو دنیا' اتنی آب و تاب کے ساتھ پاکر ہمیشہ کی مانند میری باچھیں کھل گئیں! نایاب و کمیاب موضوعات سے متعلق تمام مضامین ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ نصیر احمد خاں مختلف الصفات شخص ہیں اور بعید از قیاس اپنے تخلیق کردہ ادب کی بنا پر بجائے خود ایک تنظیم کی حیثیت سے مزین ہیں۔ اس راقم الحروف خاکسار کے پاس تقریباً 50 لغات موجود ہیں، لیکن ان کے مرتب شدہ دو جلدوں میں 3268 صفحات والے ضخیم 'جدید ہندی اردو لغت' سے مجھے اردو ہندی دونوں زبانوں میں ادب تخلیق کرنے میں ازحد فائدہ ہوتا رہا ہے۔

شائستہ فاخری نے اپنے مضمون میں جس طرح سے ہندوستان کو منعکس کیا ہے، وہ لائقِ تحسین ہے۔ انھوں نے اپنے مقالے میں محولہ اشعار کے سوا بھی جا بجا ہندی الفاظ کا بخوبی استعمال کیا ہے مثلاً بمبِ، بمبوِں، دھروہر، گھاس، گھاگھرے، چوبارے، گھونگھٹ، پنگھٹ وغیرہ۔

معروف شاعر خمار بارہ بنکوی سے متعلق مقالہ بھی بلند پایہ ہے۔ صرف ان کے اس ایک طنزیہ، لیکن شاندار شعر کے صحیح متن کی بابت دریافت کرنا چاہتا ہوں، جس کے دوسرے مصرعے میں اول لفظ 'یہ' ہی مجھے اپنی یادداشت کے بموجب اِضافی یا زائد لگتا ہے۔ ''یہ کیوں گھر میں پتھر نہیں آرہے ہیں۔'' (ص 58) آپ یا کوئی ماہر عروض صاحب مجھے بتانے کی زحمت فرمائیں۔

شاداب عالم کا مضمون بھی اردو کی شعری روایات میں ہندوستانی عناصر کی کاملاً صحیح نشان دہی کرتا ہے۔ اول صفحہ 18 پر لفظ 'اصناف' سے قبل لفظ 'کی' بھی ایک غلط تصرف ہے، 'کے' چاہیے تھا۔

اردو ہندی کے ہمہ گیر تصور والے شاعر اعظم حالی پانی پتی (ص 19) حاصل ہونے پر بھی اپنے ملک کی 'اِک مشتِ خاک کے بدلے' 'بہشت' قبول نہ کرنے اور سبھی انسانوں کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں کی ہی مانند سمجھنے کی جو کارآمد نصیحت اوروں کو بھی دیتے ہیں، وہ ان ہی کا حصہ ہوسکتا تھا۔

علامہ اقبال کی بھگوان رام پر مبنی نظم کا اقتباس (ص 19) جتنا حیران کن ہے، اس سے بھی مزید حیران و ششدر کردینے والا مسلم جنگ باز و میسور ریاست کے شیر کہلانے والے بادشاہ ٹیپو سلطان کی انگشتری (یا 'انگشترین') میں کندہ، تابندہ و

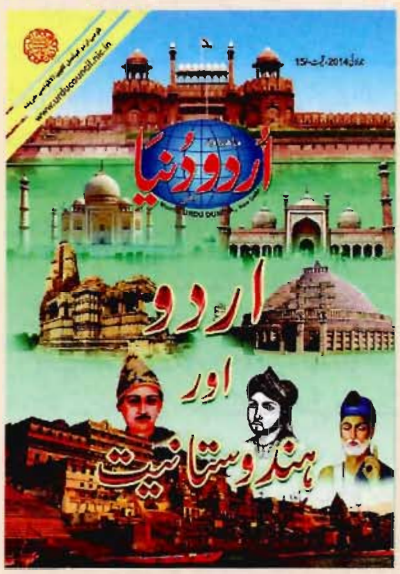

درخشاں 'رام' لفظ (ص 88) کا حوالہ ہے، جو کہ ایک تاریخی نوعیت کی دستاویز ثابت ہوا ہے۔ ادارہ کا یہ قدم باعثِ صد تہنیت ہے، یہ بات بنا کسی تعصبی رجحان کے کسی بھی عالم و فاضل شخص کے مقابل برملا کہی جاسکتی ہے۔

'برمحل اشعار اور ان کے ماخذ' جیسی مشہور و مقبولِ عام کتاب کے خالق ادیب و صحافی جناب خلیق الزماں نصرت کا 'اردو اشعار میں ہندوستانیت' کی خط کشی کرنے والا معرکۃ الآرا مضمون ہے۔ یہ بے حد عمیق و دقیق مطالعوں کے ساتھ ساتھ لاتعداد مشاہدات و تجربات کا ماحصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پیش کردہ تمام تر حوالے من و عن صحیح ثابت ہوئے ہیں۔ صرف صفحہ 27 پر محسن زیدی کے محولہ شعر کے دوسرے مصرعے کے آخر میں لفظ 'ہندوستان' کی جگہ 'ہندوستاں' چاہیے تھا اور حالی کی نظم میں میری دانست میں 'سمجھ' لفظ کی بجائے 'سمجھو' لفظ درکار ہے۔

اسی طرح راشد انور راشد کا مقالہ بھی بلند پایہ ہے اور ان کے تعلیمی عہدے کے بموجب واقع ہوا ہے۔ لفظ 'فوبی' (ص 21) کی بجائے 'خوبی' درکار تھا۔ لفظ 'وجہ' کی جمع 'وجوہ' صحیح ہے، تو پھر دیگر ادبا کی طرح راشد صاحب سے بھی 'وجوہات' غلط لفظ لکھنے کی غلطی کیسے سرزد ہوئی ہے؟ اس مقالے میں انھوں نے اردو غزل کے ارتقائی سفر کو ہندوستانی تہذیب کے تناظر میں بے حد مناسب طریقے سے نشان زد کیا ہے۔

قاسم خورشید

پٹنہ (بہار)

انتہائی معیاری شمارے کی اشاعت کے لیے دلی مبارکباد! یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ آج بھی ساری دنیا میں ہندوستان ہی واحد ملک ہے جہاں ہم تہذیبی وراثت کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ بازارواد کے باوجود اب بھی مٹی کی خوشبو باقی ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی

سابق ممبر راجیہ سبھا، ریٹائرڈ استاد سیاسیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

عین عالم انتظار میں 'اردو دنیا' جون 2014 کا شمارہ موصول ہوا۔ یہ شمارہ بھی پچھلے شماروں کی طرح امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن کتابت و طباعت سے مالامال ہونے کے ساتھ متعدد گراں قدر، معلوماتی اور محققانہ مضامین و مشمولات کا مجموعہ ہے۔ اس میں مضامین صرف اردو ادب تک محدود نہیں بلکہ اس میں تہذیب و ثقافت، صحت و تعلیم پر بھی گراں قدر مضامین شائع ہوئے ہیں۔

پروفیسر عتیق اللہ کا انٹرویو، گوشہ خواجہ احمد عباس کے تحت نصرت ظہیر کا مضمون خواجہ احمد عباس کے تین عظیم تحفے، پروفیسر ارتضیٰ کریم کا باکردار صحافی، اردو ادب میں تذکرہ کشمیر، ایک نسخہ گوشاعر ساحر لدھیانوی، پرانے لکھنؤ کی یادیں، ادب اور نفسیات، ہم نے جنھیں بھلادیا کے تحت پریم وار برٹنی، اردو ادب اور تیسری دنیا اور تبصرے بہت زیادہ پسند آئے۔

محمود الظفر رحمانی ایڈوکیٹ

جنرل سکریٹری، انجمن ترقی اردو اتر پردیش، ٹانڈہ، ضلع: رام پور

جون 2014 کا شمارہ اردو دنیا بذریعہ ڈاک ملا۔ سرورق پر خواجہ احمد عباس کی بولتی تصویر نے خصوصی شمارہ میں جان ہی ڈال دی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے خواجہ احمد عباس کی علمی، افسانوی، فلمی و دیگر خصوصیات کو جس انداز میں پیش کیا ہے ان کا جواب نہیں۔

پروفیسر عبدالرشید نے اپنے مضمون میں 'اردو ادب میں تذکرہ کشمیر' کو جس حسن اور خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے اور وادی کشمیر کے نظاروں کی اردو اشعار کے ساتھ منظر کشی کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج، موڑ تاڑ، ضلع نظام آباد

اردو دنیا جون 2014 کا شمارہ ہمدست ہوا۔ خواجہ احمد عباس کی زندگی، سیرت، شخصیت، کردار، ادبی خدمات، فلمی خدمات وغیرہ پر سیر حاصل مضامین و مقالے پیش کیے گئے۔ خواجہ صاحب نے بالی ووڈ کو بہت کچھ دیا لیکن ان کو جو ملنا تھا وہ نہیں ملا۔ اردو دنیا کے مشمولات انفرادیت لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک تجویز یہ ہے کہ اردو کی نئی نسل کے ادیب و شاعروں کے انٹرویو شائع کریں تاکہ ان کا رجحان معلوم ہوسکے کہ ان کا کیا موقف ہے اور نوجوانوں میں اردو کا چلن کہاں تک ہے باقی مشمولات معلومات کا مخزن ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز مہدی

16-3-806/2، چنچل گوڑہ، حیدرآباد 500024 تلنگانہ

جون 14 کا 'اردو دنیا' اس لحاظ سے بہت ہی یادگار ہے کہ سو سالہ تاریخ پیدائش خواجہ احمد عباس کے پیش نظر خواجہ احمد عباس کا گوشہ محنت، جانفشانی سے سجا کر خوب خراج عقیدت ادا کیا گیا ہے۔ عباس صاحب سے متعلق دو باتوں کی جانب توجہ کا طالب ہوں:

1. نصرت ظہیر صاحب نے 'خواجہ احمد عباس کے تین عظیم تحفے' میں لکھا ہے کہ عباس صاحب کے ان کی فلم 'سات ہندوستانی' میں امیتابھ بچن کو متعارف کرنے کے بعد دوسرا بریک 'آنند' اور 'نمک حرام' میں رشی کیش مکھرجی نے دیا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ محمود کی فلم 'بمبئی ٹو گوآ' دیکھنے کے بعد پرکاش مہرہ نے فلم 'زنجیر' میں لیا۔ اس فلم کو دیو آنند، راجکمار اور دھرمیندر نے ٹھکرا دیا تھا۔ محمود نے امیتابھ بچن کو رقص کرنا سکھایا۔ ان کے بتائے ہوئے Steps امیتابھ بچن نے کئی فلموں میں دہرائے۔ یہ Steps محمود کو محمود کے والد ڈانس ڈائرکٹر ممتاز علی نے سکھائے تھے۔ محمود کے بعد سلیم جاوید نے امیتابھ کے کریئر کو بنانے میں بہت ہی اہم رول ادا کیا تھا۔ ریشماں اور شیرا، آنند سے امیتابھ کو کوئی فائدہ نہیں ہوا جبکہ 'نمک حرام' 1975 میں آئی۔ 'زنجیر' کے بہت بعد میں، اسی سال یعنی 1975 میں 'نمک حرام' کے علاوہ امیتابھ نے جتنی سائیڈ ہیرو والی فلمیں سائن کی تھیں، ریلیز ہوگئیں جیسے 'روٹی کپڑا اور مکان'، 'شعلے' وغیرہ 1973 میں زنجیر 1974 میں مجبور کے ساتھ ہی امیتابھ اپنا مقام بنا چکے تھے اور 1976 میں 'دیوار' کے ساتھ ہی امیتابھ، امیتابھ بنے۔ انھوں نے عباس صاحب کا نام شاذ و نادر ہی لیا ہوگا لیکن صد سالہ تقاریب میں تعریف ضرور کی۔ پرکاش مہرہ سے اختلاف ہوگیا لیکن ان کے بستر مرگ پر انھیں معاف کردیا۔ محمود سے کیا اختلاف تھا نہیں معلوم بستر مرگ پر بھی معاف نہیں کیا۔ البتہ انور علی سے وعدہ کے مطابق ان کی فلم 'خوددار' میں کام کیا جس میں محمود اور امیتابھ کا ایک ساتھ کوئی منظر نہیں۔ سلیم جاوید سے اختلاف ہوگیا جو شاید ابھی بھی جاری و ساری ہے۔

2 جناب ارشاد انصاری کے مضمون 'اردو کا ہمہ جہت فنکار خواجہ احمد عباس' سے یہ بات علم میں آئی کہ عباس صاحب کی شادی 1947 میں مجتبائی خاتون سے ہوئی جن کا انتقال 1958 میں ہوا۔ کہیں بھی عباس صاحب کی شادی کے بارے میں نہیں پڑھا تھا۔ ایک تجسس تھا جو ختم ہوا لیکن اب یہ تجسس ہے کہ عباس صاحب کے کوئی اولاد تھی یا نہیں؟

ارتکاز احمد ارتکاز

معاون مدرس اقرا شاہین اردو ہائی اسکول، جلگاؤں (مہاراشٹر)

آپ اور کونسل کے تمام ہی اراکین کو اردو دنیا جون 2014 کے مواد، مزاج و معیار کے لیے صدق دل سے مبارکباد۔ خواجہ احمد عباس کا گوشہ رسالے کی جان ہے۔ اس گوشہ نے خواجہ صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مواد بھی بہت معیاری اور جاندار ہے۔ جس میں پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر اختر الواسع کی ملاقاتیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ اردو دنیا ہر مرتبہ متنوع نظر آتا ہے۔ اپریل کا شمارہ بالخصوص اس لیے بھی متاثر کر گیا کہ اس کے صفحہ اوّل پر کھلونا، شمع، بانو جیسے رسالوں کی تصاویر چھپی ہیں۔ جنھیں کچھ دیر دیکھتا ہی رہ گیا۔ رسالوں کی دنیا اور اردو اس موضوع پر نصرت ظہیر، سہیل انجم، شگفتہ یاسمین، زرنگار اور مشتاق کریمی کے مضامین متوجہ بھی کرتے ہیں اور دعوت فکر بھی دیتے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے مشتاق کریمی کا مضمون بہت مثبت اپروچ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ انھوں نے کہیں بھی یہ نہیں لکھا کہ 'بچوں کی دنیا' نکلنا ہی نہیں چاہیے تھا تاہم تفہیم صحیح طرح سے نہ ہونے کے سبب کوئی بندہ یہ نتیجہ اخذ کرسکتا ہے۔ آپ سے التماس ہے کہ نو آموز قلمکاروں کی رہنمائی و ذہن سازی کے لیے مزید مواد شامل اشاعت کیجیے۔ ایک مرتبہ پھر کونسل کو اور نئی حکومت کو مبارکباد۔

فخر عالم بن ذوالفقار

سنسار پور، ضلع لکھیم پور، کھیری، (یوپی)

'اردو دنیا' جون 2014 کا شمارہ خواجہ احمد عباس کی خوبصورت تصویر سے مزین کور پیج کے ساتھ دستیاب ہوا۔ ابھی چند مہینہ قبل ہی اکتوبر کے شمارے میں خواجہ احمد عباس پر ایک مضمون شائع ہوا تھا اس وقت دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ اس عظیم شخصیت پر مزید کچھ اور پڑھنے کو ملے۔ واللہ آپ نے مجھ حقیر کی یہ خواہش اسی شمارے میں گوشۂ خواجہ احمد عباس کے ذریعے پوری فرمادی۔ اس کے لیے راقم آپ کا شکرگزار ہے۔ پچھلے شمارے میں ساحر صاحب سے کی ہوئی 'ادھوری ملاقات' اس شمارے میں انجام کو پہنچی۔

عبدالرب کوثر رحمانی

اے ایس ووڈ، انڈسٹریز، نوپاڑہ، وویا وہار روڈ، امبیڈکر نگر، کرلا ممبئی

جون کا شمارہ دستیاب ہوا۔ خواجہ احمد عباس پر گوشے کے لیے مبارکباد قبول کریں۔ لیکن کالم آپ کی بات میں مرزا عبدالقیوم ندوی کے خط کے جوابی نوٹ نے رنجیدہ کردیا، ایک خادمِ اردو ساٹھ دنوں میں بچوں کی دنیا ایک لاکھ کاپیاں فروخت کروادے۔ سہ ماہی فکر و تحقیق کے سو سالانہ خریدار بنوادے اور اسی طرح 'اردو دنیا' کے تین سو خریدار بنوادے۔ اس کا تو شکریہ نمایاں طور پر کرنا چاہیے نہ کہ صرف آپ نے ایک محدب شیشے سے پڑھنے جیسی باریک خط میں نوٹ لگادیا۔ کہ بس شکریہ!

آپ مرزا عبدالقیوم ندوی جیسے خادم اردو کو ہندوستان کی تمام ریاستوں میں تلاش کریں۔ تو یقینا رسالوں کے خریدار ضرور مل جائیں گے، آپ کی خدمات کا اعتراف اور آپ جیسے پورے ہندوستان بھر کے مدیروں کی اردو خدمات کا اعتراف ایک فریضہ ہے۔ آپ جیسے لوگ واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

طاہر علی ہاشمی

بلند شہر، یوپی

ماہ مئی 2014 کا شمارہ اپنی آب و تاب سے میرے ہاتھوں میں ہے جس کے مطالعے میں مشغول ہوں پہلے کرشن چندر کا 'پشاور ایکسپریس' حقیقت پر مبنی مضمون اور اس ماہ شفیع ایوب صاحب کا جناب کلدیپ نیر سے لیا گیا انٹرویو نیز جناب وقار ناصری کا 'ایک بھولی بسری یاد' عطیہ فیضی سے متعلق کافی معیاری درجہ کے ہیں اور بہت پسند آئے اس میں شک نہیں کلدیپ نیر صاحب ایک مفکر، دانشور اور بیباک صحافی ہیں۔ ان کے بہت سے مضامین ہندی کے اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں جنھیں میں پڑھتا ہوں اور ان کے بارے میں جو رائے رکھتا ہوں اس کی ترجمانی یہ انٹرویو کرتا ہے۔ ■

صدر عالم گوہر

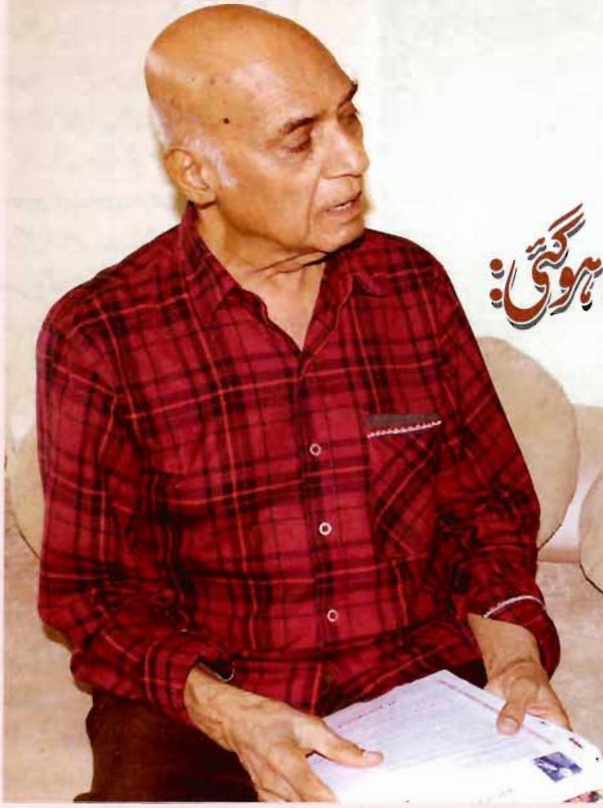

آشا بھوسلے نے کہا تھا آپ کی صبح ہو گئی:

خیام

ہندوستانی فلمی دنیا کے مشہور موسیقار خیام صاحب کو بھلا کون نہیں جانتا۔ان کا اصل نام محمد ظہور ہاشمی اورعرفیت خیام ہے۔ اردو کے بڑے شاعروں نے ان کے لیے نغمے لکھے اور ان نغموں کو خیام صاحب نے کچھ اس طرح دھنوں سے سنوارا کہ وہ ہر دلعزیز اور سدا بہار نغمے بن کر خاص و عام کے ہونٹوں پر آگئے۔ان شاعروں میں ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر، شہر یار، ندافاضلی، گلزار اورنقش لائل پوری وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ پرائیویٹ ریکارڈز کے ذریعے خیام صاحب اردو کے کلاسیکی شعرا کے کلام کو اس طرح اپنی موسیقی سے سنوار کرفلموں میں پیش کیا کہ وہ کلام ہر خاص وعام تک پہنچ کر مقبول ہو گیا۔ ان میں اردو کے پہلے شاعر حضرت امیر خسرو سے لے کر میر تقی میر، مرزا غالب، داغ دہلوی اور مرزا شوق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔اس طرح اردو زبان اور اس کے اعلیٰ شعری ادب کو فروغ دینے میں بھی خیام کا بڑا ہاتھ ہے۔خیام صاحب نے اپنی فلمی موسیقی کے لیے کبھی نغمگی اور شعریت سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش و جستجو میں رہے اور خوب سے خوب تر دھنیں بنائیں۔اس روش پر قائم رہنے کے لیے انہیں بڑی مشکلوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔1953 کی فلم فٹ پاتھ خیام کی پہلی فلم تھی جس کے بیشتر گیت مجروح سلطانپوری نے لکھے تھے لیکن ٹائٹلز میں سردار جعفری کانام بھی جڑاہواتھا۔ اس فلم کے ایک گیت 'شام غم کی قسم آج تنہا ہیں ہم' نے سب کو چونکا دیا مگر خیام کو اصل مقبولیت 'پھر صبح ہو گی' سے ملی جو دوستو فسکی کے ناول 'کرائم اینڈ پنشمنٹ' پر مبنی تھی اور جس کے ہیرو راج کپور تھے۔ ساحر نے اس فلم کے لیے بہترین گیت لکھے تھے جو آج بھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہیں۔ اس کے بعد کبھی کبھی اور امراؤ جان جیسی فلموں تک خیام نے ایک شاندار سریلا سفر طے کیا ہے۔ صدر عالم گوہر نے 'اردو دنیا' کے لیے خیام صاحب سے جو انٹرویو کیا اس کے چند اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

صدر عالم گوہر: فلموں میں آنا محض اتفاق تھا یا کسی منصوبے کے تحت آپ آئے اور اتنی اچھی معیاری موسیقی دی؟

خیام: دراصل میں ہیرو بننے کے لیے فلمی دنیا میں آیا تھا اور اسی سلسلے میں میں نے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ کیونکہ میں سوچتا تھا موسیقی میرے فلمی کیریئر میں معاون ثابت ہوگی۔ سرتال کا اگر علم ہو تو فلمی دنیا میں کام حاصل کرنا میرے لیے آسان ہو جائے گا۔

ص ع گ: موسیقی کی تعلیم کہاں حاصل کی؟

خیام: موسیقی کے میرے پہلے استادوں میں تھے، حسن لال بھگت رام اور پنڈت امرناتھ۔ ان کا ایک ہی گھرانا تھا۔ پھر میں نے غلام احمد چشتی صاحب سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی۔ انھیں لوگ چشتی بابا کہتے تھے۔ انھوں نے لاہور اور کلکتہ میں بہت کام کیا۔ بمبئی نہیں آئے۔ بٹوارے کے بعد پاکستان چلے گئے۔ فلمی موسیقی کے رموز و نکات مجھے چشتی بابا نے ہی سکھلائے۔ میں ان لوگوں کے پاؤں کی دھول بھی نہیں ہوں۔

ص ع گ: سنا ہے آپ ملٹری میں بھی تھے؟

خیام: جی ہاں، تب ہندوستان آزاد نہیں ہوا تھا۔ میں 1943 سے 1946 تک آرمی میں رہا پھر آرمی کی نوکری چھوڑ دی اور 1947 میں بمبئی آیا۔ بمبئی میں میرا ادیبوں اور شاعروں سے تعلق رہا۔ انھیں لوگوں سے جو ملا اسی کا فیض میری موسیقی میں ہے۔ گرانٹ روڈ میں ناز سنیما کے پیچھے کھیت واڑی میں سارے ترقی پسند شاعر اور ادیب جمع ہوتے تھے۔ علی سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، مخدوم محی الدین، امرتا پریتم، خواجہ احمد عباس، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور ان کے چھوٹے بھائی مہندر ناتھ۔ میں ان لوگوں کی صحبت میں بیٹھا۔ ان لوگوں سے جو ملا اسی کا ریفرنس میری موسیقی میں ہے۔ با مقصد فلموں پر ہی میں نے کام کیا اور با مقصد موسیقی دی۔ میں شروع سے ہی choosy اور moody ہوں، کبھی اپنے فن کے معاملے میں میں نے سمجھوتہ نہیں کیا جس کا مجھے خمیازہ بھی بھگتنا پڑا۔ بچپن سے ہی مجھے علمی ادبی ماحول ملا، میرے والد علم دوست تھے، بڑے بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ میرے گھر میں با ذوق اہل علم ادبا و شعرا کا آنا جانا تھا۔ میرے گھر میں کے ایل سہگل اور ملکہ پکھراج کی غزلوں کے ریکارڈ آتے تھے تو ان میں کیا اوصاف ہیں، ان پر گفتگو ہوتی تھی۔ میرے گھر میں علامہ اقبال کی دو کتابیں آئیں 'بال جبرئیل' اور 'بانگ درا' میں نے علامہ اقبال کے ہی دو شعروں کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔

پہلا شعر:

اے طائر لا ہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتا ہی

اور دوسرا شعر ہے:

خیام کی فلمیں

فلم	سال	فلم	سال
فٹ پاتھ	1953	امراؤ جان	1981
گل بہار	1954	ناخدا	1981
پھر صبح ہوگی	1950	ڈر	1981
لالہ رخ	1958	آہستہ آہستہ	1981
شعلہ اور شبنم	1961	دل نادان	1982
شگن	1964	بازار	1982
محبت اس کو کہتے ہیں	1965	باوری	1982
خاندان	1979	سوال	1982
آخری خط	1966	دل... آخر دل ہے	1982
سنکلپ	1975	رضیہ سلطان	1983
کبھی کبھی	1976	مہندی	1983
شنکر حسین	1977	لوری	1984
ترشول	1978	بے پناہ	1985
نوری	1979	انجمن	1986
تھوڑی سی بیوفائی	1980	اک نیا رشتہ	1988
چنبل کی قسم	1980	جان وفا	1990
		یاترا	2006

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

میں اس وقت چھوٹا تھا۔ پانچویں کلاس میں پڑھتا تھا۔ میرے بڑے بھائی نے ان شعروں کا مطلب مجھے سمجھایا تھا۔

ص ع گ: ساحر لدھیانوی صاحب کے ساتھ آپ کی اچھی جوڑی بنی تھی۔ کئی ہٹ فلمیں آپ نے ان کے ساتھ کی۔ پھر صبح ہوگی، کبھی کبھی، ترشول وغیرہ یادگار فلمیں ہیں اور ان کے نغمے بھی سدابہار ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ بتائیے؟

خیامؔ: ویسے ہم دونوں لدھیانہ کے ہیں۔ لیکن میری ملاقات عصمت چغتائی کے گھر ہوئی۔ عصمت چغتائی اور ان کے شوہر شاہد صاحب فلم 'لالہ رخ' بنا رہے تھے، جس کی موسیقی میں دے رہا تھا، گیت لکھ رہے تھے کیفی اعظمی۔ ایک دن، ہم لوگ بیٹھے تھے کہ ساحر صاحب آئے، شاہد صاحب نے فلم 'لالہ رخ' کا ایک نغمہ ساحر صاحب کو سنایا اور پوچھا کیسا ہے؟ ساحر صاحب نے کہا، اچھا ہے۔ شاہد صاحب نے کہا، یہ نغمہ انھوں نے ہی کمپوز کیا ہے۔ پھر میں ساحر صاحب سے متعارف ہوا۔ میں نے ساحر صاحب سے کہا، میں نے آپ کے مجموعہ کلام 'تلخیاں' کی ساری نظمیں ٹیون کردی ہیں اور ایک نظم 'فنکار' ترنم میں سنائی:

میں نے جو گیت تیرے پیار کے خاطر لکھے
آج ان گیتوں کو بازار میں لے آیا ہوں

ساحر صاحب بہت خوش ہوئے اور سننے کے بعد کہا، ''ایسا لگتا ہے کی نظم بھی آپ نے ہی لکھی ہے'' پھر اس کے بعد میرا اور ساحر صاحب کا ساتھ کئی فلموں میں رہا۔

ص ع گ: فلم کبھی کبھی کا کوئی یادگار واقعہ سنائیے؟

خیام: میں چاہتا تھا کہ فلم 'کبھی کبھی' ساحر صاحب کی نظم 'میں پل دو پل کا شاعر ہوں' سے شروع ہو۔ میں نے یش چوپڑا سے اس کا ذکر کیا مگر ساحر صاحب نے کہا، ''چھوڑو یار یہ میری ادبی شاعری ہے اسے فلم میں کیوں شامل کرتے ہو؟'' لیکن میری ضد پر یہ نغمہ اس فلم میں شامل کیا گیا۔ میں نے بہت پہلے ساحر صاحب سے یہ نظم سنی تھی اور مجھے یہ نظم بہت پسند آئی تھی۔ اس لیے میری ضد پر ہی اسے فلم میں شامل کیا گیا اور بہت مقبول ہوا۔ اس نغمے کی پکچرائزیشن بھی بڑی اچھی ہوئی تھی۔ میرے نغمے فلم کو روکتے نہیں بلکہ فلم کو آگے بڑھاتے ہیں یا آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ میں ہمیشہ سچویشن کے مطابق ہی نغمے لکھواتا ہوں جس کا فلم کی کہانی سے سروکار ہو اور وہ فلم کا حصہ بن جائے۔

فلم امراؤ جان میں میں نے امیر خسرو کا کلام شامل کیا اور 'کاہے کو بیاہی بدیس رے لکھی بابل مورے' کو اس کی مخصوص دھن میں ہی فلم میں شامل کیا جو فلم کی کہانی کو تو آگے بڑھاتی ہے ساتھ ہی عوام نے بھی اسے کافی پسند کیا

ص ع گ: حضرت امیر خسرو کی اس تخلیق کو آپ کی شریک حیات جگجیت کور صاحبہ نے اپنی آواز دی ہے۔ ذرا ان کے بارے میں کچھ بتائیے؟

خیام: میں جو کچھ بھی ہوں اور جو بھی کامیابی ملی ہے اس میں سب سے پہلے تو اللہ کا کرم ہے۔ اللہ کا شکر گزار ہوں اور اس کے بعد میری شریک حیات جگجیت کور کا احسان مند ہوں کہ اس نے میرا قدم قدم پہ ساتھ نبھایا۔ ساحر لدھیانوی کے لکھے گیت 'تم اپنا رنج و غم اپنی پریشانی مجھے دے دو' کو انھوں نے گایا ہی نہیں بلکہ اس کی زندہ تصویر بن گئیں۔ کبھی شکایت نہیں کی۔ میرے رنج و غم میری پریشانی سب حقیقت میں مجھ سے مانگ لیے زندگی میں کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا جب کہ وہ بڑے گھر کی ہیں محلوں والی ہیں بگھیوں والی ہیں۔ پھر بھی میرے ساتھ جو دکھ کے دن گزرے وہ ہنس کر گزارے۔ جب میں بسوں میں ٹیکسیوں میں آٹو میں چلتا تھا تو وہ بھی میرے شانہ بہ شانہ چلتی تھیں۔ کبھی اپنے دکھوں کا رونا نہیں رویا۔ آج میں جو کچھ ہوں اس میں میری شریک حیات جگجیت کور کا بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے اپنی گائکی میرے لیے قربان کردی۔ جب کسی پروڈیوسر ڈائریکٹر نے کہا تو گا دیا لیکن اس کے لیے بضد نہ ہوئیں، جد و جہد نہیں کی۔ میرے گھر اچھے برے ہر دن میں جیسے مہمان آئے ان کی میزبانی اسی کے شایان شان کی۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ بیوی اپنے شوہر کو کہتی ہے کی گھر میں کیا بیٹھے ہیں جائیے کہیں کام تلاش

کیجیے لیکن میری شریک حیات نے مجھے ایسا کبھی نہیں کہا۔ میری بیکاری سے کبھی نالاں نہیں ہوئیں۔ بلکہ ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کی۔ فلمی نغموں کی دھنیں بنانے میں بھی جگجیت کور جی کا بڑا ہاتھ ہے۔ ہر گانے کی دھن میں اپنی رائے دیتی ہیں۔ اسے اچھے سے اچھا بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہیں۔ میں جو کچھ ہوں اپنے شریک حیات کے بدولت ہوں۔

ص ع گ: خیام صاحب! جب پہلے دن آپ سے ملاقات ہوئی تھی تو تفصیلی گفتگو نہیں ہوئی تھی مگر آپ فرما رہے تھے میں نے اردو کی بڑی خدمت کی ہے، جب اردو پر برا وقت آیا تھا تو اس وقت ہم لوگوں نے مل کر بڑی لڑائیاں لڑی تھیں۔ کیا اس کی کچھ تفصیل بتائیں گے؟

خیام: ہندی میری قومی زبان ہے میں اس کا احترام کرتا ہوں۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ ہے مگر اردو کے ساتھ آزادی کے بعد عجب رویہ اپنایا گیا تھا۔ چند لوگوں نے زبردست مخالفت کی تھی۔ اس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو ختم کرنے کے لیے باضابطہ سازش رچی گئی، کچھ تنگ دل لوگوں نے کہنا شروع کیا کہ اردو پاکستان کی زبان ہے کیونکہ پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنالیا گیا تھا۔ اس لیے دلیل دی جانے لگی کی اردو بدیسی زبان ہے، غزلیں اور فلمی گانے بجانے بند ہوگئے۔

یہ پالیسی حکومت کی نہیں تھی چند لوگوں نے مل کر یہ سازش رچی تھی۔ اس وقت گانے والے کی روٹی بند ہوگئی کیونکہ اس وقت کی آمدنی کا ذریعہ ریڈیو اسٹیشن، گراموفون کمپنی، موسیقی کی تعلیم کے لیے ٹیوشن دینا محفلوں میں گانا گانا تھا۔ اردو والوں کی بے روزگاری کا وقت آگیا تھا۔ ہندی والوں کو بلا کر مشکل ہندی میں ریڈیو کے لیے پروگرام بنائے جانے لگے۔ پروگراموں کو ہندی الفاظ سے اتنا بوجھل کر دیا گیا کہ لوگوں نے آل انڈیا ریڈیو سننا ہی بند کر دیا۔ اس وقت گوا آزاد نہیں ہوا تھا۔ گوا میں ایک ریڈیو اسٹیشن تھا اس پر فلمی گانے بجتے تھے اور پھر بعد میں ریڈیو سیلون شروع ہوا تو لوگ اس کے شیدائی ہوگئے اور اس طرح فلمی گانوں کے ذریعے اردو ہر خاص و عام تک پہنچتی رہی۔ تب سردار جعفری، ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ نے مل کر ایک وفد کی صورت میں اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو اور وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کی اور اردو پر ہونے والے ظلم وستم کا حال سنایا۔ نہرو جی نے اس وفد سے کہا کہ سرکاری طور سے تو ایسا کوئی حکم جاری نہیں ہوا ہے۔ اردو نہ پاکستان کی زبان ہے نہ بدیسی۔ یہ ہندوستان کی زبان ہے اور اس مٹی میں پلی بڑھی ہے۔ اس طرح ہم فلم والوں نے اردو کو عوام میں مقبول کرانے میں حتی الامکان کوشش کی۔ فلمی نغموں میں اردو الفاظ کا زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے اس کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔ میں ناچیز حقیر فقیر اردو کا ایک ادنی سپاہی اردو کی لڑائی کے لیے ہمیشہ کمر بستہ رہا۔

اس وقت آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن ڈائرکٹر ملک صاحب تھے۔ انھوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ آپ آل انڈیا ریڈیو کے لیے چار نغمے کمپوز کیجیے جو عوام میں مقبول ہوں۔ میں نے کہا، چار نغموں میں سے دو بھجن کے ہوں گے اور دو غزلیں ہوں گی۔ پھر میں نے رفیع صاحب کی آواز میں دو بھجن 'تیرے بھروسے ہے نندلال' اور 'شیام سے نیہا لگائے رادھا نیر بہائے' اور دو غزلیں 'غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا' (داغ دہلوی) اور 'درد منت کش دوا نہ ہوا' (غالب) محمد رفیع صاحب کی آواز میں ریکارڈ کرائیں۔ یہ ریکارڈ دوسرے دن ہی ریڈیو پر بجنا شروع ہو گئے اور پورا ہندوستان گونج اٹھا۔

ص ع گ: آپ نے اپنی موسیقی سے غزلوں کو بھی سنوارا ہے۔ میر، داغ اور غالب جیسے اساتذہ کے کلام کے آپ کے پرائیویٹ میوزک البم ہیں۔ کچھ ان کے بارے میں بتائیے؟

خیام: فلمی دنیا میں کامیابی ہی کسوٹی ہے۔ آپ چاہے لاکھ ہنرمند ہوں، اپنے فن کے ماہر ہوں مگر فلمیں اگر فلاپ ہوئیں تو اس کا سایہ آپ پر ہی جائے گا۔ 1952 میں فلم 'فٹ پاتھ' نہیں چلی تو میرے پاس بھی کام آنا بند ہوگیا۔ اس بیچ ہم نے غزلوں پر کام شروع کر دیا۔ غزلوں پر کام کرنے میں کوئی پابندی نہیں ہوتی ہے کہ یہ نغمہ اعلیٰ درجے کا ہو یہ نغمہ کمتر درجے کا۔ یا اس کو ایسا کر لیجیے اس کو ویسا کر دیجیے۔ ساری بندشوں سے آزادی ملتی ہے اور پھر جو کام ہوتا ہے وہ دل کو سکون دینے والا ہوتا ہے۔ اسی سے تسکین ہوتی ہے راحت ملتی ہے، خوشی ہوتی ہے۔ میں نے non-film غزلیں کمپوز کرنی شروع کی۔ بہت دنوں سے طلعت محمود صاحب کہہ رہے تھے کہ میرے لیے کچھ غزلیں بنائیے جنھیں میں HMV میں ریکارڈ کرواؤں گا۔ تب میں نے یہی کام شروع کر دیا۔ اس وقت ریکارڈ ہوا کرتے تھے۔ جس کے ایک طرف ایک ہی نغمہ ہوتا تھا اور دوسری طرف ایک نغمہ۔ طلعت محمود کی آواز میں میں نے دو چیزیں تیار کیں۔ پہلی ایک غزل تھی 'آگئیں پھر سے بہاریں آگئیں' اور دوسری طرف ایک گیت تھا 'رو رو بیتا جیون سارا' نغمہ نگار تھے ولی صاحب کے چھوٹے بھائی خاور زماں۔ طلعت محمود صاحب کی HMV میں بڑی عزت تھی۔ ان کے ریکارڈ نے بڑی مقبولیت حاصل کی تھی۔ یہ ریکارڈ مارکیٹ میں آنے کے بعد کافی پسند کیے گئے۔ میری بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔ پھر میں نے محمد رفیع صاحب کی آواز میں غالب اور داغ کی کچھ غزلیں کمپوز کیں جن کا ذکر کر چکا ہوں۔ بیگم اختر نے خواہش ظاہر کی کہ خیام صاحب میرے لیے کچھ غزلیں کمپوز کیجیے۔ میں نے بیگم اختر کے لیے 18 غزلیں کمپوز کیں۔ جن میں کچھ یہ ہیں:

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

میر تقی میر

میرے ہم نفس مرے ہم نوا مجھے دوست بن کے دغا نہ دے
میں ہوں درد عشق سے جاں بلب، مجھے زندگی کی دعا نہ دے

شکیل بدایونی

خیام کے سدابہار نغمے

شام غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم
فلم: فٹ پاتھ، آواز: طلعت محمود، نغمہ نگار: مجروح، سردار جعفری

پھر نہ کیجیے مری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو
فلم: پھر صبح ہوگی، آواز: مکیش آشا بھونسلے، نغمہ نگار: ساحر لدھیانوی

پربتوں کے پیڑوں پر شام کا بسیرا ہے
فلم: شگون، آواز، آواز: محمد رفیع، نغمہ نگار: ساحر لدھیانوی

کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے
فلم: کبھی کبھی، آواز: مکیش ولتا، نغمہ نگار ساحر لدھیانوی

اے دل ناداں، آرزو کیا ہے
فلم: رضیہ سلطان، آواز: لتا منگیشکر، نغمہ نگار: جاں نثار اختر

بہارو میرا جیون بھی سنوارو
فلم: آخری خط، آواز: لتا منگیشکر، نغمہ نگار: کیفی اعظمی

آجا رے آجا رے او میرے دلبر آجا
دل کی پیاس بجھا جا رے
فلم: نوری، آواز: نتن مکیش ولتا منگیشکر، نغمہ نگار: جاں نثار اختر

یہ ملاقات اک بہانہ ہے
پیار کا سلسلہ پرانا ہے
فلم: خاندان، آواز: لتا منگیشکر، نغمہ نگار: نقش لائل پوری

دل چیز کیا ہے آپ مری جان لیجیے
فلم: امراؤ جان، آواز: آشا بھونسلے، نغمہ نگار: شہریار

ان آنکھوں کی مستی کے مستانے ہزاروں ہیں
فلم: امراؤ جان، آواز: آشا بھونسلے، نغمہ نگار: شہریار

کہیں کسی کو مکمل جہاں نہیں ملتا
فلم: آہستہ آہستہ، آواز: بھوپیندر، نغمہ نگار: ندا فاضلی

کہیں ایک معصوم نازک سی لڑکی
بہت خوبصورت مگر سانولی سی
فلم: شنکر حسین، آواز: محمد رفیع، نغمہ نگار: کمال امروہی

آپ یوں فاصلوں سے گذرتے رہے
فلم: شنکر حسین، آواز: لتا منگیشکر، نغمہ نگار: جاں نثار اختر

غضب کیا تیرے وعدے پہ اعتبار کیا
تمام رات قیامت کا انتظار کیا
پرائیویٹ ریکارڈ، کلام: داغ دہلوی، آواز: محمد رفیع

درد منت کش دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
پرائیویٹ ریکارڈ، کلام: غالب، آواز: محمد رفیع

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
پرائیویٹ ریکارڈ، کلام: غالب، آواز: محمد رفیع

جگجیت کور اور خیام

دور ہے منزل رستہ مشکل

وغیرہ۔ میری کمپوز کی ہوئی غیر فلمی غزلیں، نظمیں، شبد اور نعت دو ڈھائی سو کے قریب ہیں۔

ص ع گ: 'پھر صبح ہوگی' راج کپور صاحب کی فلم ہے۔ راج کپور اور مالا سنہا اس فلم کے ہیرو، ہیروئن ہیں۔ راج کپور کی فلم میں ہمیشہ شنکر جے کشن موسیقار ہوتے تھے۔ آپ کو یہ فلم کیسے ملی؟

خیام: یہ فلم عالمی شہرت یافتہ روسی ناول نگار دوستوفسکی کے ناول Crime and Punishment پر مبنی ہے۔ ایک دن ساحر صاحب کے یہاں ڈائرکٹر رمیش سہگل صاحب آئے اور کہا، 'میں راج کپور اور مالا سنہا کو لے کر Crime and Punishment بنا رہا ہوں۔ اس کے نغمے آپ تحریر کریں۔' ساحر صاحب نے کہا، 'میں نغمے تو لکھوں گا مگر موسیقی کون دے رہا ہے۔' رمیش جی نے کہا، ''راج کپور ہیں تو موسیقار شنکر جے کشن ہوں گے۔'' ساحر صاحب نے کہا، 'بالکل نہیں، اس فلم کی موسیقی وہی دے گا جس نے Crime and Punishment پڑھا ہو اور سمجھا ہو اور میرے خیال میں خیام سے زیادہ اس کو کوئی دوسرا نہیں سمجھتا ہوگا۔' اور اس طرح میں اس فلم کی موسیقی دینے لگا۔

ص ع گ: فلم کی کہانی کیا تھی؟

خیام: یہ ایک پڑھے لکھے بے روزگار انسان کی کہانی ہے۔ حالات کے ہاتھوں مجبور ہوکر اس سے ایک خون ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ پڑھا لکھا ہے۔ اس لیے قتل کرتے وقت سارے precaution استعمال کرتا ہے اور اس طرح قتل کا کوئی نشان نہیں چھوڑتا ہے۔ لیکن وہ دیکھتا ہے کہ اس قتل کے لیے بے گناہ لوگوں کو پکڑا جا رہا ہے۔ اذیتیں دی جا رہی ہیں اور آخر میں ایک بے گناہ کو پھانسی کی سزا ہو جاتی ہے۔ اس بات سے اسے کافی تکلیف ہوتی ہے۔ اس کا ضمیر بار بار اسے لعنت ملامت کرتا ہے اور آخر میں وہ جا کر اپنا جرم قبول کر لیتا ہے۔ چونکہ وہ ایک اچھا اور راہ راست پر آیا ہوا باضمیر انسان ہوتا ہے، خود سرینڈر کرتا ہے، اس لیے اس کی سزا معمولی ہوتی ہے۔

رمیش سہگل نے اس کے کلائمکس کو اتنے اچھے ڈھنگ سے فلمایا ہے جو انھیں کا خاصہ ہے۔ اس فلم کے نغمے کافی مقبول ہوئے ہندستان کے کونے کونے میں گونجے۔ ساحر صاحب کی شاعری بھی اس پایے کی تھی۔ یہ نظم دیکھیے:

ان کالی صدیوں کے سر سے جب رات کا آنچل ڈھلکے گا
جب دکھ کے بادل پگھلیں گے جب سکھ کا ساگر چھلکے گا
جب امبر جھوم کے ناچے گا جب دھرتی نغمے گائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی، وہ صبح کبھی تو آئے گی
مجبور بڑھاپا جب سونی راہوں کی دھول نہ پھانکے گا
معصوم لڑکپن جب گندی گلیوں میں بھیگ نہ مانگے گا
حق مانگنے والوں کو جب سولی نہ دکھائی جائے گی
وہ صبح کبھی تو آئے گی، وہ صبح کبھی تو آئے گی

اس نغمے کو مکیش، آشا بھوسلے اور مالا سنہا نے اپنی آواز دی تھی:

میرا خیال تھا کہ فلم محرم کے چالیس دن گزر جانے کے بعد ریلیز کی جائے کیونکہ فلم کو آخری ٹچ دیتے دیتے شب برات، عید، بقر عید سب گزر چکا اور محرم آگیا۔ میرا یہ ماننا تھا کہ محرم میں یہ فلم ریلیز کی جائے گی تو مسلم ناظرین فلم دیکھنے نہیں آئیں گے اور پروڈیوسر کا کہنا تھا محرم میں غیر مسلم ناظرین فلم دیکھیں گے اور محرم کے بعد مسلم ناظرین فلم دیکھیں گے اور اس طرح پروڈیوسر نے محرم کے مہینے میں ہی یوپی میں فلم ریلیز کر دی۔

اسی فلم کا دوسرا نغمہ تھا:

پھر نہ کیجیے میری گستاخ نگاہی کا گلہ
دیکھیے آپ نے پھر پیار سے دیکھا مجھ کو — مکیش
میں کہاں تک نہ نگاہوں کو پلٹنے دیتی
آپ کے دل نے کئی بار پکارا مجھ کو — آشا بھونسلے

اس نغمے کی ریکارڈنگ کے بعد آشا بھونسلے نے کہا، خیام صاحب آپ کی صبح ہوگئی۔

ص ع گ: شہریار صاحب کے ساتھ آپ کی ایک بہت مقبول اور سپر ہٹ فلم امراؤ جان ہے۔ فلم امراؤ جان سے متعلق کچھ یادگار باتیں بتائیں؟

خیام: 'امراؤ جان' کو ڈائیریکٹ کرنے کی ذمے داری مظفر علی کے ہاتھوں سے کمال امروہی کو جانے والی تھی۔ فلم پاکیزہ کی زبردست کامیابی کا سہرا کمال صاحب کے سر تھا۔ فلم سے متعلق لوگوں کا سوچنا تھا کہ یہ فلم کمال امروہی صاحب بناتے تو اچھا تھا لیکن میں نے کہا، مظفر علی صاحب لکھنؤ کے رہنے والے ہیں لکھنؤ کی تہذیب سے اچھی طرح واقف ہیں اس لیے مظفر علی صاحب اس فلم کے ساتھ پورا پورا انصاف کریں گے اور اس طرح فلم امراؤ جان مظفر علی صاحب نے ہی ڈایریکٹ کی۔ فلم اتنی زبردست ہٹ ہوگی اس کا اندازہ پہلے نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ فلم محرم کے چالیس دن گزر جانے کے بعد ریلیز کی جائے کیونکہ فلم کو آخری ٹچ دیتے دیتے شب برات، عید، بقر عید سب گزر چکا اور محرم آگیا۔ میرا یہ ماننا تھا کہ محرم میں یہ فلم ریلیز کی جائے گی تو مسلم ناظرین فلم دیکھنے نہیں آئیں گے اور پروڈیوسر کا کہنا تھا محرم میں غیر مسلم ناظرین فلم دیکھیں گے اور محرم کے بعد مسلم ناظرین فلم دیکھیں گے اور اس طرح پروڈیوسر نے محرم کے مہینے میں ہی یوپی میں فلم ریلیز کر دی۔ لیکن نتیجہ مایوس کن تھا کیونکہ پہلے ہفتے میں فلم نے پچاس فی صد کاروبار کیا دوسرے ہفتے میں پچیس فی صد ہو جاتا اور تیسرے میں فلم اتر جاتی۔ یوپی ٹیری ٹری کے یہ حالات دیکھ کر ڈسٹری بیوٹر شر نگار فلمس والوں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور کہا کہ فلم ہم ریلیز نہیں کریں گے۔ آپ لوگ کوئی دوسرا ڈسٹری بیوٹر ڈھونڈ لیجیے۔ اب تو معاملہ بگڑ گیا۔ پھر پروڈیوسر نے، میں نے اور ریکھا نے مل کر یہ فلم بمبئی میں خود ہی ریلیز کی اور جب بمبئی کے منروا سنیما میں فلم امراؤ جان لگی تو کامیابی کے ریکارڈ قائم کر دیے۔ چاروں طرف سے اتنی اچھی فلم بنانے کے لیے مبارک باد آنے لگی۔ ہر طرف اس فلم کا چرچا ہونے لگا اور خاص کر اس فلم کے نغمے تو اتنے زبردست ہٹ ہوئے کہ پوری دنیا نے یک زباں ہو کر کہا Classic and immortal music آج بھی جب بجتے ہیں تو لوگوں کے پاؤں رک جاتے ہیں۔ ■

Md. Sadre Alam, Mo. Pursaulia,
Via- Jaynagar, Dist- Madhubani,
Bihar

68واں جشن آزادی

ہر سال جشن آزادی منانا اور اس جشن کا نمبر شمار بڑھاتے جانا ہمارے لیے ایک قومی رسم ضرور ہے لیکن اس موقع پر پیچھے مڑ کر دیکھنا اور جو کچھ دکھائی دے اسے سامنے کے منظر سے جوڑ کر اپنا احتساب کرنا بھی اس رسم کا حصہ ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ ہماری آزادی کو 67 برس ہو چکے ہیں اور آج ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو آزادی کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ چنانچہ آج پہلی بار ایک ایسا شخص ہمارا وزیر اعظم بنا ہے جو ملک کی آزادی کے بعد پیدا ہوا ہے۔ جن لوگوں نے انگریزوں کا زمانہ دیکھا تھا ان کی تعداد فطری اور قدرتی اصولوں کے تحت تیزی سے گھٹتی جا رہی ہے۔ آج کی نسل کے لیے وہ زمانہ اب ایک تصوراتی شے بن چکا ہے۔ اس کے لیے صرف آج کا اور آنے والے کل کا زمانہ اہمیت رکھتا ہے۔ اور یہ ٹھیک بھی ہے کہ وہ ماضی کی بجائے حال اور مستقبل میں جیے۔ لیکن ماضی کو یکسر نظر انداز کر دینا بھی دانش مندی نہیں۔ دور غلامی اور تحریک آزادی سے وابستہ ہمارا ماضی ایسے کئی مرحلے زاویے اور شخصیتیں اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جن کا علم آج کے سبھی لوگوں کو شاید نہ ہو۔ لیکن ان مرحلوں زاویوں اور شخصیتوں کو ذہن میں رکھنا ہم سب کے لیے ضروری بھی ہے کیونکہ اس علم سے نہ صرف ہمارے ذہن کو روشنی ملتی ہے بلکہ حال اور مستقبل کو سمجھنے اور اس کا لائحہ عمل مرتب کرنے میں بھی یہ علم ہمارے کام آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زیر نظر کور اسٹوری میں ہم نے نہ صرف آزادی کے بعد کے برسوں کی اپنی کامیابیوں اور ناکامیوں کا، خاص طور سے سائنس اور خلائی تحقیق کے میدان میں اپنی شاندار کارکردگی کا جائزہ لیا ہے بلکہ پہلی جنگ آزادی کے گم نام مجاہدوں، انگریزی کے ہندوستان نواز شاعروں اور تحریک آزادی سے اردو زبان و ادب کی وابستگی سے متعلق مضامین بھی اس میں شامل کیے ہیں۔ امید ہے ہماری یہ کاوش آپ کو پسند آئے گی۔

ادارہ

انیس الحسن صدیقی

جدوجہد آزادی ابھی جاری ہے!

15 اگست 2014 ہمارا 68 واں یوم آزادی ہے۔ اس دن بھی ہر سال کی طرح جشنِ آزادی دھوم دھام سے منایا جائے گا۔ ہمارے رہنما ملک کے تمام لوگوں کو آزادی کی مبارکباد دیں گے۔ اُن جیالے شہیدوں کو یاد کیا جائے گا جنھوں نے برطانوی حکومت کی غلامی سے ملک کی آزادی کے لیے اپنی جان کی بازی لگادی تھی اور اُن رہنماؤں کو بھی یاد کیا جائے گا جنھوں نے آزادی حاصل کرنے کے بعد اسے بامعنی بنانے کے لیے مضبوط جمہوری طرزِ حکومت کی بنیادیں رکھنے میں ملک کی تاریخ ساز خدمت سرانجام دی تھی۔ جنھوں نے ہندوستان سے غُربت مٹانے، جہالت دور کرنے، برابری کا حق دلوانے، ایمانداری اور محنت کے بل پر سب کو روزی، روٹی، کپڑا اور مکان کے حصول کا حق دینے، ہر طرح کی سماجی برائیوں کو دور کرنے اور ہندوستان کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں کھڑا کرنے کے خواب دیکھے تھے۔ حالانکہ وقت کے گزرنے پر وہ ایماندار اور بے لوث رہنما آج ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن اُن کے کام ہمیں اُن کی یاد دلاتے ہیں۔

آج ہمیں دیکھنا ہے کہ پچھلے 67 برسوں میں کیا ہم نے اُن پیارے، ایماندار اور بے لوث رہنماؤں کے خوابوں کو پورا ہونے دیا؟ ہم نے کیا کیا؟ ہم نے کیا کھویا اور کیا پایا؟ ہندوستان سے غُربت، جہالت، سماجی بُرائیاں، بے ایمانی، کرپشن، ناانصافی اور موذی بیماریاں دور کرنے میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟ ہماری آزادی کی ناؤ کس سمت میں جارہی ہے؟ کیا ہم ان ہی برائیوں میں ابھی تک مبتلا نہیں ہیں جو راجے رجواڑوں اور شاہی حکمرانوں کے دور میں موجود تھیں؟ کیا وہی پشتینی جانشینی کا سلسلہ ابھی تک نہیں چل رہا ہے جس نے حصول آزادی تک اس ملک کو پانچ سو سے زیادہ ریاستوں میں بانٹ رکھا تھا؟ یہ اور ان جیسے اور بہت سے سوال ہیں جو اس موقع پر ہم سبھی کے ذہنوں میں اٹھتے ہیں اور جن کے جواب ہمیں بہت جلد ڈھونڈنے ہوں گے کیونکہ وقت کی رفتار اب پہلے جیسی نہیں رہی ہے اور صرف ہمارے نہیں بلکہ دنیا بھر کے حالات تبدیلیوں کی رفتار کو تیز سے تیز تر کیے جارہے ہیں۔

حالیہ عام انتخابات کے دوران چند ٹی وی چینلوں کے نامہ نگاروں نے تقریباً ہر صوبے میں سلم Slum علاقوں اور دیہات میں جاجا کر دکھایا کہ آج بھی ملک کے غریب عوام جانوروں سے بدتر حالتوں میں رہ رہے ہیں۔ آج بھی مزدور کو روزی روٹی کے لیے بُری حالتوں میں سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور بہت سے تو ایسے ہیں جنھیں پتہ ہی نہیں کہ وہ اب ایک آزاد جمہوری ہندوستان میں کام کررہے ہیں جہاں اُس کے کام کے بارے میں کُچھ قاعدے قانون بھی ہیں۔ اُس کی سیاسی سماجی سمجھداری صرف اتنی ہے کہ اسے ہر پانچ سال کے بعد ووٹ دینا ہے۔ گندی بستیوں میں رہنے والے ان غریب مزدوروں کے لیے نہ صاف ستھرے مکان ہیں، نہ اُن کی طبّی مدد کے لیے ڈسپنسری اور اسپتال ہیں اور نہ ہی اُن کے بچوں کی تعلیم کے لیے اسکول ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ حکومتیں ان کی طرف سے چشم پوشی کرتی ہیں۔ یا ان کے لیے فلاحی پروگرام نہیں بنائے جاتے۔ یہ سب ہوتا ہے۔ لیکن پورا کیا آدھا فائدہ بھی ان غریبوں تک نہیں پہنچتا۔

کچھ ایسی ہی صورت حال تعلیم کے شعبے کی ہے۔ حکومتوں کی طرف سے ملک کے ہر صوبے میں ہر ایک کے لیے بنیادی اور ثانوی تعلیم کا قانوناً مُفت انتظام ہے۔ لیکن سرکاری پرائمری اسکولوں کے حالات دیکھ لیجیے۔ عمارتیں یا تو خستہ حال ہیں۔ یا پختہ ہیں تو ان میں پینے کے پانی کا انتظام نہیں۔ ٹوائلٹ نہیں۔ اسٹاف کم ہے۔ بچوں کے لیے کلاسوں میں ڈیسک تو کیا ٹاٹ پٹی بھی نہیں۔ چھت کا پنکھا منہ چڑھا رہا ہے۔ بجلی ندارد۔ شہری اسکولوں کی حالت پھر بھی غنیمت ہے۔ لیکن ان ہی شہروں کی گندی بستیوں میں جایئے تو دیکھنے کو ملے گا کہ مزدوروں کے بچے یا تو وقت ضائع کرنے یا پھر مِڈ ڈے میل کے چکر میں آجاتے ہیں اور عام طور پر ٹیچر غائب ہی رہتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر بچے اسکولوں کی پڑھائی بیچ میں ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ان حالات میں یہ تو محسوس ہوسکتا ہے کہ ہم آزاد ہیں لیکن آزادی کا فائدہ سب تک پہنچا ہو ایسا قطعی محسوس نہیں ہوتا۔

پھر ہمارے سماجی رویّے بھی نہیں بدلے ہیں۔ جن سماجی بُرائیوں کے خلاف وطن پرست رہنماؤں نے آواز اُٹھائی تھی وہ آج بھی قانون کے نافذ ہونے کے باوجود جاری ہیں۔ مثلاً نابالغ بچوں کی شادیاں، عام شادیوں میں بھی دکھاوے کے لیے ہونے والی احمقانہ فضول خرچی، جہیز نہ ملنے پر دلہن کو ستانا یا جان سے مار دینا، بیوی کو پیروں کی جوتی سمجھنا، غیر برادری میں شادی کرنے پر لڑکے لڑکی کو علاقے سے نکالنا یا قتل کر دینا، شادی کے بعد لڑکا پیدا نہ ہونے پر لگاتار بچے پیدا کیے جانا۔ پورے ہندوستان میں صرف ایک صوبہ گجرات ایسا ہے جہاں برسوں سے شراب پر پابندی ہے ورنہ تو ہر صوبے میں شراب، تمباکو اور نشہ آور چیزوں کا کھلے عام استعمال ہورہا ہے۔

کرپشن نے تو حد کر رکھی ہے۔ سماج کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس سے بچا ہوا ہو۔ یہاں تک کہ کئی لوگ اسے سماجی زندگی کا لازمی حصہ ماننے لگے ہیں۔ شکر ہے کہ لوک پال بل کے ذریعے اس سلسلے میں کچھ پہل ہوئی ہے اور آر ٹی آئی کے ذریعے شفافیت کے ہتھیار سے کرپشن کی کچھ روک تھام بھی کہیں کہیں نظر آنے لگی ہے۔ سب سے اچھی بات یہ ہے کہ عوام میں کرپشن کے خلاف کافی بیداری آئی ہے جس میں الیکٹرانک میڈیا اور اخبارات کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن اب یہ تلخ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ عورتوں کے تحفظ کے لیے بے حد سخت قانون اور خاص عدالتیں بنائے جانے کے باوجود زنا بالجبر کے واقعات کم ہونے میں نہیں آ رہے ہیں اور بعض جگہ تو پولس بھی اس میں ملوث پائی گئی ہے۔

ان سبھی حقائق کی روشنی میں دیکھیں تو ملک کی ایک مایوس کن تصویر سامنے آتی ہے۔ اتنی مایوس کن کہ کئی قنوطیت پسند تو یہ کہتے ہوئے بھی سنے گئے ہیں کہ آزاد ہندوستان سے تو غلام ہندوستان ہی بہتر تھا۔ لیکن ظاہر ہے ایسا کہنا یا سوچنا مجموعی حقائق سے روگردانی کے مترادف ہے۔ ایسا تجزیہ صرف آدھا سچ ہوگا جو پورے جھوٹ سے کہیں زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے۔

حقیقت یہ بھی ہے کہ پچھلے 67 برسوں میں سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ہم نے اتنی زبردست ترقی کی ہے کہ آج ہم نہ صرف ایٹمی طاقت بن کر دنیا کے سب سے بڑے طاقت ور ملکوں کی صف میں کھڑے ہو گئے ہیں بلکہ اس کی بدولت زراعت، اعلیٰ تعلیم، کمپیوٹر ایجوکیشن، بھاری صنعت، الیکٹرانک انڈسٹری اور سائنسی و خلائی تحقیق کے میدانوں میں اہم ترین کامیابیوں کی وجہ سے بھی پوری دنیا ہمارا لوہا مان رہی ہے اور ہمیں مستقبل قریب کی سب سے بڑی اقتصادی طاقت کے روپ میں دیکھا جانے لگا۔

ذرا 1947 کے ہندوستان کو تصور میں لائیے۔ سوئی جیسی چیز بھی یہاں نہیں بنتی تھی۔ ہمارا کچا مال باہر کے ملکوں میں جاتا تھا اور پکا مال وہاں سے تیار ہو کر یہاں آتا تھا۔ صدیوں سے زمینداری سسٹم چلا آ رہا تھا جس کی وجہ سے کسان کو بہت زیادہ محنت کر کے بھی کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ کھیتی کے لیے آب پاشی کا انتظام نہیں تھا۔ کسان کی کھیتی صرف بارش پر منحصر تھی۔ ہیضہ، طاعون، چیچک، ملیریا، تپ دق جیسی متعدی بیماریوں کا علاج اور ان کو روکنے کا انتظام نہیں تھا۔ اسپتالوں کی کمی تھی۔ عام آدمی کو علاج تک میسر نہیں تھا۔ طبی، تکنیکی تعلیم ناپید تھی اور عام تعلیم کی بھی کمی تھی۔

زراعت:

آزادی کے فوراً بعد ہماری پارلیمنٹ کے ذریعے لینڈ ریفارم پالیسی اختیار کی گئی جس کے تحت زمینداری سسٹم ختم ہوا۔ 26 جنوری 1950 کو ہمارا جمہوری آئین نافذ ہوا۔ لینڈ سیلینگ ایکٹ یعنی زمینی حد بندی قانون کے تحت کسانوں کو زمین کے مالکانہ حقوق دیے۔ پلاننگ کمیشن قائم ہوا جس کے ذریعے باقاعدہ دریاؤں سے نہریں نکالنے کے منصوبے بنائے گئے تاکہ کھیتوں تک پانی پہنچ سکے۔ کسانوں کو جدید کھیتی کے متعلق زیادہ سے زیادہ جانکاری دی گئی۔ زراعتی یونیورسٹیاں قائم کی گئیں تاکہ ریسرچ کر کے کسانوں کو اعلیٰ قسم کے بیج اور کھاد مہیا کیے جا سکیں۔ کھیتی کے اچھے اوزار بنانے کے لیے صنعتی ادارے کھولے گئے۔ باہر کے ملکوں کو اپنے کارخانے ہندوستان میں لگانے کی دعوت دی گئی تاکہ صنعتی پیداوار بھی ہو اور لوگوں کو روزگار بھی ملے۔

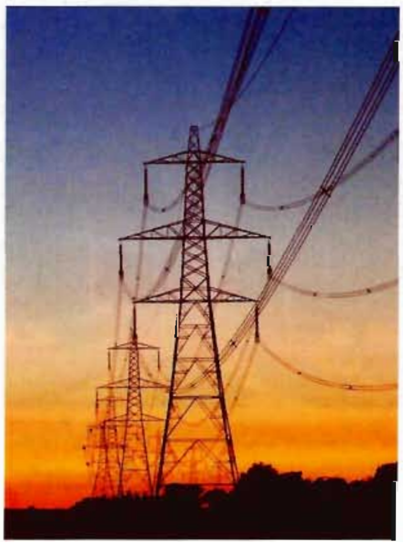

ان سبھی اقدامات اور زراعتی سائنس میں ترقی کی بدولت 1950 سے 1970 تک اتنی زرعی پیداوار بڑھی کہ جو ملک امریکہ سے پی ایل 480 کے تحت گندم کی خیرات تک لینے پر مجبور ہو گیا تھا وہ دوسرے ملکوں کو اناج بھیجنے لگا۔ اسے سبز انقلاب کا نام دیا گیا۔

اسی طرح دودھ کی قلت دور کرنے کے لیے 1970 میں نیشنل ڈیری ڈیولپمنٹ بورڈ قائم ہوا جو ملک میں سفید انقلاب لے آیا۔ آج ہم دودھ کی پیداوار میں دنیا کے سب ملکوں سے آگے نکل گئے ہیں۔ یہی نہیں اب کاجو، ناریل، چائے، ادرک، ہلدی، کالی مرچ، کافی اور مویشیوں کی پیداوار بھی ہمارے یہاں سب ملکوں سے زیادہ ہو رہی ہے۔

دنیا کا دس فی صدی پھل جس میں کیلا، آم، امرود، جامن، پپیتے، چیکو، تمباکو، سیب وغیرہ شامل ہیں ہندوستان میں پیدا ہو رہا ہے۔ ابھی ہماری زمین کا صرف 53 فی صد رقبہ ہی سینچائی کی سہولت سے فیضیاب ہوا ہے۔ اس میں اضافے کے بعد دیکھیے گا کہ ہم اور کتنی منزلیں سر کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں ہونے والی ترقی ہی ان کامیابیوں کی کنجی ثابت ہوئی ہے۔

توانائی:

بجلی کی پیداوار بڑھانے کے لیے 1950 میں پہلی جوہری توانائی بھٹی ممبئی کے علاقہ ٹرامبے میں لگائی گئی تھی۔ بعد میں اس کا نام ہمارے عظیم سائنسداں کے نام پر بھابھا جوہری ریسرچ سینٹر رکھا گیا۔ 1956 میں اپسرا اور 1960 میں سائرس جوہری بھٹیاں قائم کی گئیں۔ 1985 میں فاسٹ بریڈر ٹسٹ ری ایکٹر قائم ہوا۔ پہلا نیوکلیر پاور پلانٹ جس میں دو جوہری بھٹیاں شامل ہیں مہاراشٹر کے علاقہ تاراپور میں لگایا گیا۔ 1974 میں 220 میگاواٹ ری ایکٹر اے ای سی ایل کناڈا سے حاصل کیا گیا۔ موجودہ منصوبوں کے تحت 2016-17 تک چار اور ری ایکٹر کام کرنے لگیں گے۔ اس وقت کنڈا کولم میں دو اور ری ایکٹروں پر کام چل رہا ہے جو ایک ایک ہزار میگاواٹ بجلی پیدا کریں گے۔ عالمی سطح پر روس، امریکہ، فرانس، جاپان اور کوریا کے ذریعے 20 سے زیادہ نیوکلیر ری ایکٹروں کے لیے تعاون حاصل کیا جا رہا ہے۔ ان سبھی بجلی گھروں اور بجلی پیدا کرنے کے دوسرے منصوبوں کی بدولت آئندہ پانچ سے دس برسوں میں بجلی کی کل پیداوار اتنی ہو جائے گی کہ بجلی کی مانگ 70 تا 80 فیصد پوری ہو سکے گی اور بہت سے شہروں کو لوڈ شیڈنگ اور پاور کٹ سے نجات مل جائے گی۔

صنعت و حرفت:

صنعت کو فروغ دینے کے لیے انڈسٹریل ڈیولپمنٹ ریگولیشن ایکٹ 1951 میں نافذ کیا گیا تھا جس کے ذریعے حکومت کو اختیارات دیے گئے کہ وہ صنعت کو متعدد طریقوں سے بڑھاوا دے۔ اس سلسلے میں آگے چل کر بھی کئی اور قانون بنائے گئے اور متعدد اسکیمیں شروع کی گئیں جن کی بدولت ہماری صنعتی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔

صحت عامہ کے حل:

آزادی سے پہلے تمام ایلوپیتھک دوائیں باہر ملکوں سے بن کر آتی تھیں۔ حکومتوں نے یونانی، آیورویدک، ہومیوپیتھک دواؤں پر بھی زور دیا تاکہ صحت عامہ سے متعلق بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے اور علاج معالجے کی سہولت

عام آدمی کو بھی مل سکے۔ ایلو پیتھک اسپتال ضرور تھے لیکن صرف بنیادی علاج کے لیے۔ طاعون، ہیضہ، چیچک، ملیریا، تپ دق، اپاہج پن جیسی مہلک بیماریوں کا علاج عام لوگوں کو میسر نہیں تھا۔

1948 میں حکومت نے تمام بیماریوں کی دوائیں ملک میں بنانے پر زور دیا اور باہر کی کمپنیوں کو ہندوستان میں بنا شرط دواسازی کی دعوت دی اور 1956 میں ہم بنیادی دوائیں بنانے میں خودکفیل ہو گئے تھے۔ 1970 میں حکومت ہند نے پیٹینٹ ایکٹ میں ترمیم کی۔ آج عالمی سطح پر دوائیں بنانے میں ہمیں تیسرا بڑا ملک تسلیم کر لیا گیا ہے۔ 2020 تک دوائیں بنانے کا کاروبار 55 بلین ڈالر تک پہنچنے کی امید ہے۔ حکومت چیچک، طاعون، ہیضہ، ملیریا، تپ دق، اپاہج پن اور کینسر جیسی موذی بیماریوں کا علاج مُفت فراہم کر رہی ہے اور کینسر کو چھوڑ دیں تو یہ بیماریاں تقریباً ختم ہو گئی ہیں۔

1950 میں انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ قائم کی گئی تھی جس نے وقتاً فوقتاً اپنی سفارشات حکومت کو سونپیں اور اس کے مطابق حکومت نے فوری اقدامات کیے۔ اسپتالوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور میڈیکل ادارے ہر سال بڑھائے گئے۔ 2000 میں اسپتالوں کے بارے میں آزاد پالیسی اِختیار کی گئی تھی جس کے تحت باہر کے ملکوں سے اسپتالوں کی کمپنیوں نے ایک دم ماڈرن اسپتال کھولے۔ اب حالت یہ ہے کہ کسی بھی بیماری کے لیے باہر نہیں جانا پڑتا ہے بلکہ اب غیر ملکی لوگ ہندوستان کے اسپتالوں میں علاج معالجے کے لیے آرہے ہیں کیونکہ ہمارے یہاں اچھا اور بالکل جدید علاج کرانا انھیں کافی سستا بھی پڑتا ہے۔

تعلیم:

1947-48 میں پورے ملک میں 312 پرائمری اسکول ٹیچروں کی ٹریننگ کے ادارے تھے لیکن 1998-99 تک اِن کی تعداد 1319 تک پہنچ گئی تھی اور سیکنڈری ٹیچرز ٹریننگ اداروں کی تعداد 51 سے 818 ہو گئی تھی۔ 1973 میں نیشنل کونسل برائے ٹیچرز ایجوکیشن (این سی ٹی ای) قائم ہو گئی اور 1978 میں مختلف تعلیمی پروگراموں کے ساتھ نشو و نما پائی۔ 1993 میں پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے اس ادارے کی قانونی حیثیت کی گئی تا کہ یہ تمام تعلیمی اداروں کو چیک کر سکے۔

نومبر 1948 میں حکومت ہند نے ڈاکٹر ایس رادھا کرشنن، پروفیسر آکسفورڈ یونیورسٹی کی صدارت میں ایک کمیشن کی تقرری کی گئی تا کہ وہ یونیورسٹی ایجوکیشن کی نشو و نما اور مستقبل میں ملک کی ضرورتوں کے مطابق اس کو بڑھانے کے بارے میں مشورہ دیں۔ رادھا کرشنن کمیشن نے ہندوستان میں تکنیکی تعلیم کے میدان میں نئے طرز کے انجینئرنگ اور تکنیکی اداروں اور تکنیکی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے درمیان تال میل کی وکالت کی تھی۔

1959 میں منسٹری آف سائنٹیفک ریسرچ اور کلچرل افیئرز کے سیکریٹری پروفیسر ایم ایس ٹھکر کی صدارت میں تکنیکی تعلیم اور ووکیشنل پر ورکنگ گروپ مقرر کیا گیا تھا۔ مرکزی حکومت نے سینٹرل اپرنٹس شِپ کے مشورہ پر اپرنٹس ایکٹ آف 1961 کی منظوری دی تھی۔

1964 میں ایجوکیشن کمیشن جو کہ کوٹھاری کمیشن کے نام

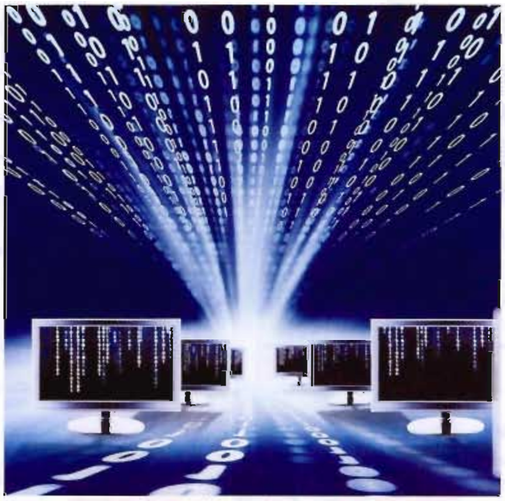

سے جانا گیا تھا پرفیسر ڈی ایس کوٹھاری کی صدارت میں مقرر کیا گیا تھا۔ اس کمیشن نے پالی ٹیکنک ادارے قائم کرنے کی سفارش اُن طلبا کے لیے کی تھی جنھوں نے اپنی سیکنڈری تعلیم مکمل کر لی ہو۔ 1967 میں حکومت ہند نے پارلیمنٹ کے ممبروں کی ایک کمیٹی تعلیم سے متعلق نیشنل پالیسی پر اپنے کمنٹ دینے کے لیے مقرر کی تھی۔ اس کمیٹی نے ایک بہت ہی پُر معنی تبصرہ کیا تھا کہ تکنیکی ماہرین کو عملی ٹریننگ دینی چاہیے اور اُن کو صنعت اور سوسائٹی میں زیادہ اچھی حیثیت دینی چاہیے۔ 1974 میں ٹیکنیکل ٹیچرز ٹریننگ اداروں کی کار گزاری کا جائزہ لینے کے لیے کیلکر کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ نتیجے کے طور پر پالی ٹیکنک کے ٹیچروں کو سروِس کے دوران ٹریننگ مہیا کرنے کے لیے بھوپال، کلکتہ، مدراس اور چنڈی گڑھ پر چار ٹی ٹی ٹی قائم کیے گئے۔ مارچ 1996 میں پورے ملک میں 375 کمیونٹی پالی ٹیکنک کام کر رہے تھے جن میں 74 عورتوں کے لیے تھے۔ 4,50,000 لوگوں نے تربیت حاصل کی جن میں سے 60 فی صدی نے ملازمت پر اپنے کام دھندے شروع کرنے کو ترجیح دی۔

خلائی سائنس:

آج ہم اکیسویں صدی میں چودہ سال آگے بڑھ چکے ہیں اور آج ہمیں بہت سی سہولتیں حاصل ہیں۔ اچھی خوراک دستیاب ہے جو باہر کے ملکوں میں بھی اچھے داموں میں بک رہی ہے۔ اچھے سے اچھا کپڑا ہے جو یہیں بن رہا ہے اور اچھے داموں میں ایکسپورٹ کیا جا رہا ہے۔ پختہ مکان بنانے کی ٹیکنالوجی ڈیولپ ہو چکی ہے جن میں ہر طرح کی سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔ 1947 میں چند ہزار ریڈیو سیٹ اور ٹیلی فون کنکشنوں سے شروعات کرنے والے ہندوستان میں آج گھر گھر رنگین ٹی وی اور بچے بچے تک موبائل فون پہنچ چکا ہے۔ جس ملک میں ایک بھی کمپیوٹر نہیں تھا وہاں کوئی سرکاری یا پرائیویٹ دفتر ایسا نہیں جہاں کچھ نہ کچھ کام کمپیوٹر سے نہ ہوتا ہو۔ شہری اور قصباتی طالب علموں کے پاس اپنا لیپ ٹاپ کمپیوٹر ہونا ایک عام بات ہے۔ بڑے شہروں میں میٹرو ریلوے کا دور شروع ہو چکا ہے۔ ہوائی جہاز کا سفر عام ہوتا جا رہا ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ ٹرینیں اور فاسٹ اسپیڈ ٹرینیں پٹری پر دوڑ رہی ہیں۔ یہ سب کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا کمال ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے ہر کام کی رفتار تیز کر دی ہے۔ اب تو جی پی ایس کا استعمال بھی شروع ہو گیا ہے۔ موسم کی پیش گوئیاں ہمارے کسانوں کے لیے فائدہ مند ثابت ہو رہی ہیں۔ ملک میں ٹیلی علاج بھی شروع ہو گیا ہے۔ بحری اور بری جہاز رانی میں مدد کے لیے سیٹیلائٹ سے سمتوں اور راستوں کی معلومات مل رہی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے ہر میدان میں ترقی اور آگے بڑھنے کی رفتار بڑھا دی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا سارا کھیل خلائی ٹیکنالوجی سے چل رہا ہے۔ وہ ملک جنھوں نے آج سے 75 سال پہلے خلائی میدان میں کام شروع کیا تھا وہ اس میدان میں آج بھی ترقی پذیر ملکوں میں گنے جاتے ہیں۔ مثلاً آسٹریلیا، جاپان، اٹلی، جرمنی وغیرہ۔ جب کہ ہندوستان اس میدان میں کافی آگے نکل گیا ہے۔ آزادی کے بعد ملک میں اسرو یعنی انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن، خلائی تحقیق اور ٹیکنالوجی کی نشو و نما اور مختلف کاموں میں اس کے اطلاق کے لیے قائم کی گئی تھی۔ 19 اپریل 1975 کو اسرو نے پہلا مصنوعی سیارچہ 'آریہ بھٹ' کے نام سے بنایا جو

سوویت یونین کی مدد سے کامیابی کے ساتھ خلا میں بھیجا گیا۔ یہ ہماری خلائی پروازوں کی شروعات تھی۔ 18 جولائی 1980 کو دوسرا 'روہنی' نامی مصنوعی سیارچہ ہندوستانی لانچ وہیکل اس ایل وی۔3 کے ذریعے کامیابی کے ساتھ خلا میں چھوڑا تھا۔ 2اپریل 1984 کو پہلے ہندوستانی خلاباز ہندوستانی فوج کے فلائنگ گروپ لیڈر راکیش شرما سویت یونین کی خلائی گاڑی سویوز ٹی ٹو کے ذریعے خلائی پرواز پر گئے۔ وہ خلا میں پہلے سے موجود سوویت خلائی اسٹیشن سیلوٹ۔7 میں سویت یونین کے خلاباز کمانڈر روائی مالیشیو اور فلائٹ انجینیئر جی اسٹریکالو کے ساتھ رہے۔ اُن کے ساتھ انھوں نے خلائی اسٹیشن میں آٹھ دن رہ کر خلائی تجربات میں گزارے تھے۔ خلا میں رہنے کے دوران انھوں نے ہندوستان کی وزیر اعظم آنجہانی محترمہ اندرا گاندھی سے بات بھی کی تھی۔ 11 اپریل 1984 کو وہ خلائی گاڑی سویوز ٹی 10 کے ذریعے زمین پر واپس آئے تھے۔ واپسی میں زمینی سطح سے 10 کلومیٹر کی اونچائی پر اُن کا پیراشوٹ کھل گیا تھا اور وہ زمین پر بحفاظت واپس آ گئے تھے۔

1990 میں پی ایس ایل وی یعنی قطبی سیارچہ لانچ وہیکل جسے سیٹلائٹ کو خلا میں چھوڑنے کے لیے بار بار استعمال کیا جا سکتا ہے خلا میں داغا گیا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا ہندوستانی تجربہ تھا۔ 1994 میں دوسرے پی ایس ایل وی کے ذریعے 'آئی آر ایس پی۔2' نامی سیٹلائٹ خلا میں کامیابی کے ساتھ چھوڑا گیا تھا۔ 1996 میں تیسرا تجربہ کیا گیا تھا۔ 2003 میں اسرو کی ان تمام خلائی کامیابی کے مدنظر حکومت نے اسرو کی تجویز مشن 'چندریان' کی تجویز رکھی جسے حکومت نے منظوری دے دی۔ اس کے تحت سیٹلائٹ 'چندریان' کو چاند کی سطح سے صرف 100 کلومیٹر نزدیک خلا میں بھیجنے کا پروگرام بنایا گیا تھا۔ 10 جنوری 2007 کو اسرو ایجنسی نے تجربہ کے طور پر بارہ دن کے لیے پی ایس ایل وی خلائی گاڑی کا کامیاب تجربہ کیا تھا۔ خلا میں اس خلائی گاڑی کے چار مختلف مصنوعی سیارچے ایک ساتھ چھوڑے گئے تھے۔ یہ خلائی گاڑی 12 دن تک خلا میں رہنے کے بعد اپنے ساتھ ایک پُرانے مصنوعی سیارچے ایس آر ای ون کو زمین پر 22 جنوری 2007 کو واپس لائی تھی۔ پی ایس ایل وی۔7 پر تقریباً 290 کروڑ روپے کا خرچہ ہوا تھا۔ اسرو کے سائنسداں اور تکنیکی ماہرین اس خلائی گاڑی کو خلا میں روانہ کرنے اور واپس لانے کے لیے سری ہری کوٹا کے اسپیس سینٹر کے لانچ پیڈ سے چھ کلومیٹر دور اس کے کنٹرول مرکز سے رات دن نگہداشت کرتے رہے تھے۔ یہ خلائی گاڑی تقریباً 44 میٹر لمبی اور 295 ٹن وزنی تھی۔ اس نے 19 منٹ کے وقفے میں چاروں سیٹلائٹس کو زمینی سطح سے

635 کلومیٹر اونچی خلا میں اپنی اپنی جگہ پہنچا دیا تھا۔

22 اکتوبر 2008 ہندوستانی خلائی تاریخ میں ایک سنہرا دن تھا۔ اس دن یعنی بدھ کی صبح 6 بج کر 20 منٹ پر ستیش دھون اسپیس سینٹر سری ہری کوٹا سے اسرو نے 44 میٹر اونچی اور 316 ٹن وزنی خلائی گاڑی پی ایس ایل وی ٹو 1380 کلو میٹرو زنی مصنوعی سیارچہ 'چندریان اول' کے ساتھ خلا میں داغی گئی۔ اس خلائی گاڑی نے مصنوعی سیارچہ 'چندریان۔ اول' کو 19 منٹ میں ہمارے کرہ ارض کے گرد خلا میں ایک ایسے بیضوی مدار میں چھوڑ دیا تھا جس کا کرہ ارض سے نزدیک ترین فاصلہ 255 کلومیٹر تھا اور بعید ترین فاصلہ 860,22 کلومیٹر تھا۔ یہاں خلائی گاڑی پی ایس ایل وی سی 2 کا کام ختم ہو گیا تھا۔ 12 نومبر 2008 کو 'چندریان۔اول' چاند کی سطح سے 100 کلومیٹر کی اونچائی پر تھا۔ جہاں چاند کی زمین سے اس کا بعید ترین فاصلہ 180 کلومیٹر تھا۔ 'چندریان اول' نے چاند کی سطح سے 100 کلومیٹر کی اونچائی پر پہنچتے ہی اپنا مون امپیکٹ آلہ Moon Impact Device چاند کی سطح پر کامیابی کے ساتھ اتار دیا جس پر ہندوستانی پرچم لگا ہوا تھا۔

5 نومبر 2013 کا دن ہندوستانی خلائی تحقیق کی تاریخ کا دوسرا سنہرا دن ثابت ہوا۔ اس دن ہندوستان کی خلائی ایجنسی اسرو نے پوری طرح ہندوستان میں بنایا گیا تقریباً 1350 کلوگرام وزنی سیارچہ 'منگل یان' سری ہری کوٹا کی قطبی سیارچہ لانچ گاڑی پی ایس ایل وی۔25 سے سیارہ مریخ کے خلائی سفر کے لیے روانہ کیا گیا۔ مریخ کی میتھین گیس کے اشارات ابھی کو جاننا اور مختلف تجربات کرنا اس سفر کا مقصد ہے۔ ہماری خلائی گاڑی نے 'منگل یان' کو کرہ ارض کے خلائی پارکینگ لاٹ میں چھوڑ دیا تھا۔ وہاں سے 'منگل یان' کا 300 دنوں کا خلائی سفر شروع ہو گیا جو آئندہ ماہ ستمبر 2014 کے آخر میں سیارہ منگل یان کے گرد مدار میں پہنچے گا۔ تب ہندوستان اپنی مہم کے ذریعے سیارہ مریخ کے بارے میں سائنسی اعداد و شمار لینا شروع کرے گا۔

حال ہی میں 30 جون 2014 کو وزیر اعظم جناب نریندر مودی نے خالص ہندوستانی خلائی گاڑی پی ایس ایل وی سی 23 کو خلا میں داغے جانے کا منظر بروز پیر صبح 9 بج کر 52 منٹ پر سری ہری کوٹا کے ستیش دھون اسپیس اسٹیشن پر خود جا کر دیکھا اور اسرو کے ڈائریکٹر کو اس کامیابی کے لیے مبارکباد دی۔ اس خلائی گاڑی نے پانچ سیٹلائٹس خلا میں بھیجے جن میں ایک فرانس کا، دو کناڈا کے اور ایک ایک جرمنی اور سنگاپور کے تھے۔ یہ سبھی کامیابی کے ساتھ خلا میں ٹھیک اپنے اپنے مقامات پر پہنچا دیے گئے۔

15 اگست 1947 سے اب تک ان 67 برسوں کے اعداد و شمار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بنیادی ڈھانچے کے لیے جو کام کیے گئے ہیں اُن کے نتیجے ہمیں اس اکیسویں صدی میں دیکھنے کو مل رہے ہیں۔ ہندوستان کی ترقی کو اور تیز کرنے کے لیے ہمیں بنیادی ڈھانچے کے جو کام باقی رہ گئے ہیں اُن کو بے لوث اور ایمانداری سے پورے کرنے ہوں گے۔ مثلاً باقی کی 47 فی صدی زرعی زمین کو سیراب کرنے کے لیے دریاؤں کو نہروں اور بند کے ذریعے ملانا ہوگا۔ دریاؤں کو گندگی سے بچانا ہوگا۔ رین ہارویسٹنگ کے ذریعے بارش کے پانی کا استعمال بڑھانا ہوگا۔ تمام سرکاری اسکولوں کو تیزی سے سُدھارنا ہوگا۔ بجلی کی پیداوار اور دوسرے کاموں میں شمسی توانائی کا استعمال بڑھانا ہوگا۔ بجلی کی تقسیم کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ شہروں کو صنعتی اور ڈیزل کے پولوشن سے بچانا ہوگا۔ قدرتی وسائل کا استعمال اور مفید استحصال تیز کرنا ہوگا۔ سائنس و تکنیکی تعلیم کے ادارے زیادہ سے زیادہ قائم کرنے ہوں گے۔ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک ہر ہندوستانی علاقے کو اچھی سڑکوں اور ریل لائنوں کے ذریعے ملانا ہوگا۔ ریلوے کے بنیادی ڈھانچے کو سُدھارنا ہوگا۔ کوشش اس بات کی کرنی ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ سامان ہندوستان میں ہی بنے اور صرف پکا مال ہی ہندوسان سے باہر جائے نہ کہ کچا مال۔ کیونکہ اب ہمیں اپنے ملک کو سماجی، معاشی اور اقتصادی آزادی کی طرف لے جانا ہے۔ تبھی ہماری آزادی کی جدو جہد مکمل ہوگی!

■

Aneesul Hasan Siddiqui (MA), Ex. Deputy Director (NDMC, New Delhi), 679, Sector 22B, Gurgaon - 122015 (Haryana)

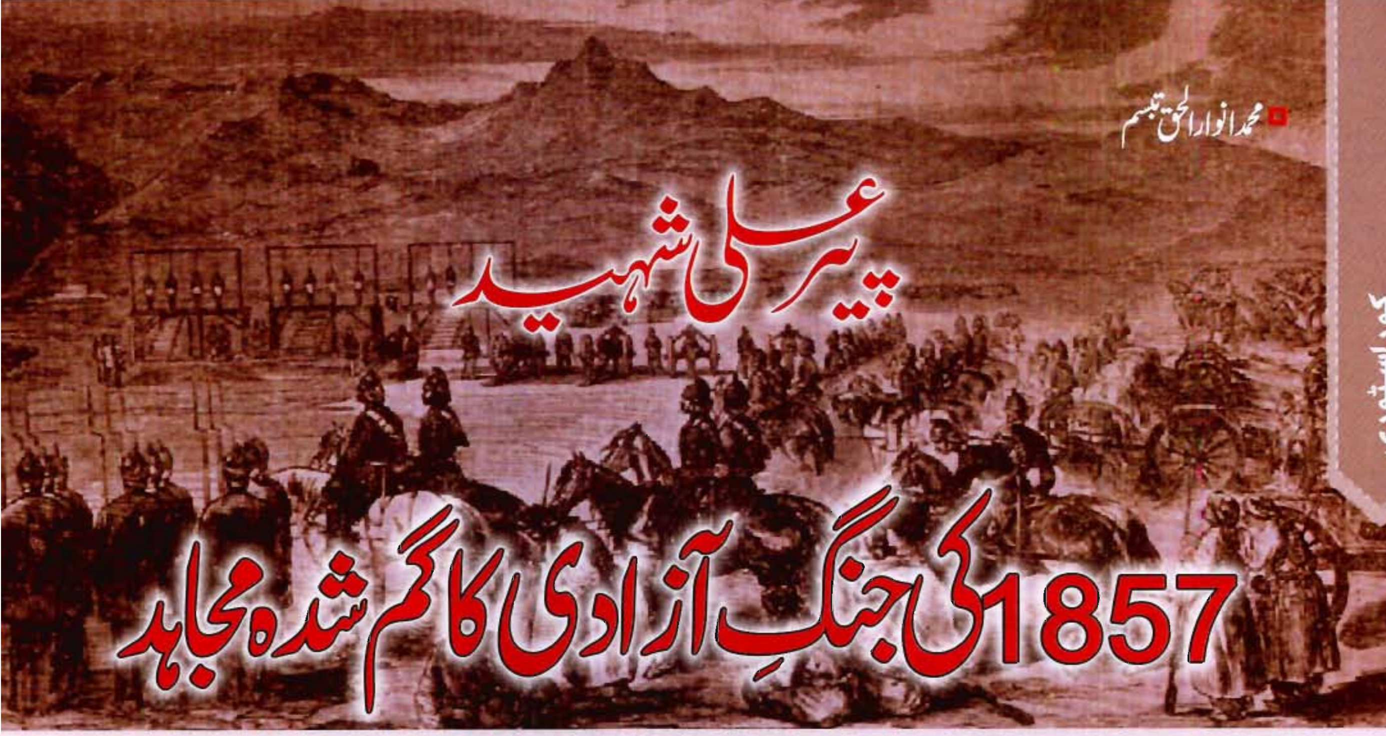

محمد انوار الحق تبسم

پیر علی شہید

1857 کی جنگِ آزادی کا گم شدہ مجاہد

انگریزوں کی ظالمانہ حکومت اور استحصال کے خلاف 1857 کی بغاوت کے دوران جن آزادی کے متوالوں نے وطن کی آزادی کے لیے سچے جذبات کے ساتھ جرأت اور جاں بازی ایثار و قربانی کی بے نظیر مثالیں پیش کیں ان میں پیر علی خان شہید کا نام سنہرے حروف میں لکھنے کے قابل ہے۔ یہ حیرت کی بات ہے کہ اپنوں نے تو اُسے فراموش کردیا لیکن دشمنوں نے اپنی نفرت انگیز تحریروں میں اسے زندہ رکھا جن میں اُس کی شجاعت اور دلیری کے ساتھ ساتھ اُن کے کردار کی عظمت کا اعتراف بھی موجود ہے۔

پیر علی کے حالات زندگی سے متعلق بہت کم معلومات دستیاب ہیں۔ پٹنہ ڈویژن کے انگریزی کمشنر ولیم ٹیلر جو صوبائی حکومت کو شہر میں حکومت کے خلاف بڑھتے ہوئے باغیانہ رجحانات کے متعلق اپنی رپورٹ سے حکومت کو مطلع کرتا رہتا تھا وہ بہار میں انگریزوں کے خلاف کام کرنے والے مختلف جتھوں کی علیحدہ علیحدہ شخصیتوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ پیر علی کی سرگرمیوں سے متعلق یہ رپورٹیں اور اُس کی کتاب Our Crisis مطبوعہ کلکتہ 1858 اہم ترین مآخذ ہیں۔ اس سانحے کے سو سال بعد 1957 میں پٹنہ میں قائم ڈرامیٹک کلب، انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن IPTA نے 1857 کے سرفروشوں کی یادگار منانے اور انھیں خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے جو اسٹیج ڈرامہ پیش کیا، ان میں پیر علی خان کی داستان پیش کر کے اُسے گمنامی سے بچالیا لیکن پیر علی خاں کی زندگی اور حالات پر بہترین کام ممتاز مؤرخ پروفیسر قیام الدین احمد کا ہے۔ انھوں نے نہایت عرق ریزی سے پیر علی کے حالات جمع کر کے ایک مقالے کی شکل میں انڈین ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن کی جلد 32 میں پیش کیا۔ یہی وقیع مقالہ پیر علی کی زندگی اور حالات کا مستند اور غیر جانبدارانہ ماخذ ہے قیام صاحب کی مشہور ترین تصنیف ہندوستان میں وہابی تحریک (انگریزی) میں بھی پیر علی کی کارگزاریوں پر ایک مختصر خاکہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ بدرالدین احمد صاحب کی تالیف حقیقت بھی کہانی بھی میں مندرجہ بالا ماخذ سے استفادہ کرتے ہوئے پیر علی کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پیر علی کی جائے پیدائش تاریخ پیدائش اور خاندانی حالات پر دبیز پردہ پڑا ہوا ہے۔ صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ وہ لکھنؤ کے باشندے تھے اور 1857 کی بغاوت سے کافی پہلے کتب فروشی کے سلسلے میں پٹنہ میں مقیم تھے۔ خواجہ کلاں تھانہ علاقے میں واقع محلہ گورہٹہ میں ان کی کتابوں کی دکان تھی اس کے علاوہ 3 جولائی 1857 کی پٹنہ میں ہوئی مختصر اور شاندار شورش لیڈر اور ہیرو تھے۔

یہ بات شروع میں ہی واضح کردینا بہتر ہوگا کہ 19ویں صدی کی چھٹی دہائی میں سارے ہندوستان میں انگریزوں کی ظالمانہ اور آمرانہ پالیسیوں اور ہندوستانیوں کے استحصال کے خلاف نہایت خاموشی سے باغیانہ سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں اور عوام الناس میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ بہار بھی اس سے الگ نہیں تھا۔ صوبے کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے پٹنہ آزادی کی جدوجہد کا خفیہ مرکز بنا ہوا تھا۔ جسے ٹیلر غداری کا 'گندہ حوض' کہتا ہے۔ یہاں جو مختلف گروہ انگریزی حکومت کے خلاف کام کررہے تھے ان میں ایک اودھ کی آزادی کے ان متوالوں کی تھی جو اودھ کی حکومت کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے اس کے قائد مسیح الزماں تھے۔ پٹنہ میں اس جماعت کی قیادت پیر علی کے سپرد تھی جس کا براہِ راست مسیح الزماں سے رابطہ تھا۔ پٹنہ کے کورٹ گشت کا داروغہ مہدی علی خاں، پیر علی کا معاون اور مشیر کار تھا۔ دوسری جماعت مجاہدین صادق پور کی تھی جن کی تحریک اس سے پہلے اور بعد میں بھی چلتی رہی۔ تیسری جماعت کا تعلق براہِ راست تخت دہلی سے تھا جس کے نام پر ہندوستان کے ہر خطے سے ہندو اور مسلمان آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے اکٹھے ہورہے تھے۔ ڈومری ضلع پٹنہ کے ایک دولت مند زمیندار مولوی علی کریم اس جماعت کا قائد تھا اور ضلع مظفر پور کے جمعدار وارث علی کے ساتھ مل کر کام کررہا تھا۔ پیر علی کا اصل مقصد اپنے ساتھی اور قائد مسیح الزماں کی ہدایت کے مطابق اِن علیحدہ علیحدہ جتھوں کی کارروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور انھیں حکومت کے خلاف ایک زبردست قوت میں منتقل کردینا تھا۔ شورش دبنے کے بعد مسیح الزماں کے کافی خطوط جو پیر علی کے نام سے تھے پکڑے گئے۔ پیر علی کے نام ایک خط میں وہ اسے ہدایت کرتا ہے کہ علی کریم سے رابطہ قائم کرے جس کا تعاون بہت قیمتی اور ضروری ہے۔ اس لیے مزید لکھا ہے کہ وہابیوں کے سردار ولایت علی یا مقصود علی کے خاندان میں سے کسی ایسے فرد سے تمھارے دوستانہ تعلقات ہوں جو تم ہمارے کام کے لائق سمجھتے ہو مطلع کرو۔ میرا خیال ہے کہ ہمیں کسی ذات یا نسل سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے۔ ہندوؤں سے بھی نہیں کیونکہ ہمیں محنت سے اپنا کام انجام دینا ہے۔ پیر علی کے وہابیوں کے سردار فرحت حسین سے مجوزہ شورش میں شرکت کے متعلق گفتگو کا ذکر مولانا عبدالرحیم نے تذکرۂ صادقہ میں کیا ہے جو ایک بیش قیمت شہادت ہے۔

بہر حال پیر علی خاں نے پٹنہ میں تینوں جماعتوں سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور متحدہ محاذ بنانے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ خفیہ طور پر سارے انتظامات مکمل ہوچکے تھے اور عام

شورش کا ایک دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن چند غداران قوم نے اس اسکیم کی خبر پٹنہ کے کمشنر ولیم ٹیلر کو پہنچادی۔ اس خبر کے ملنے پر ولیم ٹیلر نے جو کیا اسے وہ اپنے ان خطوط میں حکومت کو وقتاً فوقتاً لکھتا گیا جو سرکاری کاغذات کے دفتر میں محفوظ ہے۔ ان خطوط کے اقتباسات انڈین ہسٹوریکل ریکارڈس کمیشن کی جلد 32 سے ماخوذ ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''...مہدی علی خاں جو شہر پٹنہ کے کورٹ گشت کا داروغہ ہے اس کے یہاں مختلف اوقات میں رات کے وقت جلسے ہوا کرتے تھے جن میں چند وہابی بھی شریک رہا کرتے تھے اس کے علاوہ گمنام خطوط بھی میرے پاس آئے ہیں جن میں خوفناک سازشوں کی اطلاعات تھیں اور تین شہادتیں بھی تھیں۔ مجھے اس بات کا یقین پہلے سے بھی تھا کہ نصرانیوں کے خلاف جو محاذ پہلے سے بن رہا ہے اس میں ہر فرقے کے لوگ اپنے اپنے اختلافات دور کر کے شریک ہوجائیں گے۔ مجھے دو گروہوں سے زیادہ خطرہ تھا پہلا گروہ جو حکومت اودھ کے خاتمہ کے بعد اس کو دوبارہ قائم کرنے سے پیدا ہو گیا تھا دوسرا گروہ وہابیوں کا تھا۔ ان دونوں کے علاوہ ایک بڑا خطرہ یہ بھی تھا کہ پٹنہ میں اگر تھوڑی سی شورش بھی ہوئی تو عوام بھی اس میں کود پڑیں گے۔ مہدی علی شہر پٹنہ کے گشتی داروغہ کی شخصیت ایسے وقت میں بہت اہم اور خطرناک تھی وہ بڑا قابل اور بڑے اختیارات کا آدمی تھا۔ پہلے دربارِ اودھ میں اس کی رسائی بھی ہو چکی تھی۔ اس لیے میں نے اسے معطل کر کے کل اختیارات بھی اس سے لے لیے اور فوری طور پر کڑی نگرانی کے ساتھ اس کو حراست میں ڈال دیا۔ دوسرا گروہ وہابیوں کا تھا جن کا آپس میں اتحاد ان کی ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری اور اپنے قائدین کے ساتھ ان کی والہانہ عقیدت مشہور ہے۔ ان کی چند سرکردہ شخصیتوں کو گرفتار کرنے سے میرا یہ مقصد تھا کہ ان کو آسان قید میں ہوشیاری کے ساتھ اس لیے رکھا جائے کہ اگر ضرورت پڑے تو اپنے عقیدت مندوں کے رویے کے لیے وہ ضمانت کا کام کرسکیں۔ میں نے تیسرا کام یہ کیا کہ جہاں تک ممکن ہوسکا شہر کے لوگوں سے ہتھیار رکھوا لیے جس کے لیے میں نے اعلان کرادیا تھا کہ اہل شہر حکومت کے پاس اپنے ہتھیار جمع کریں اس طرح خود بخود لوگوں نے پانچ سو ہتھیار تھانوں میں جمع کردیے۔ اس کے علاوہ رات میں 9 بجے کے بعد لوگوں کو گھروں سے نکلنے کی ممانعت کردی۔''

مگر ان جبری کارروائیوں کا الٹا اثر یہ ہوا کہ بجائے دہشت زدہ ہونے کے لوگوں کے دلوں میں انگریزوں سے نفرت کا جذبہ اور بڑھ گیا۔ ولیم ٹیلر کے مطابق اس لیے صرف جبری احتیاطی کارروائیوں پر اکتفا کیا تھا لیکن اس زمانے میں ہنگامہ کے قبل پٹنہ کا یہ حال تھا کہ انگریزی سپاہیوں کے ڈر سے لوگوں کو گھر سے نکلنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی مسجدوں اور مندروں میں لوگوں نے جمع ہونا بند کردیا تھا۔ اشنان گھاٹ خالی پڑے تھے۔ دو ایک آدمی ایک ساتھ کہیں گھر سے باہر نکلے تو پولس کی لاٹھی کھائی یا پوچھ گچھ کے لیے تھانے لائے گئے۔ دوکانیں بند پڑی تھیں اور سڑکوں پر ویرانی چھائی رہتی تھی۔ حکومت کی ان کارروائیوں سے عوام کے دل سلگ رہے تھے اور لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔ بالآخر 3 جولائی 1857 کو پٹنہ کے لوگ جوش میں بھرے ہوئے قبل از وقت ہی گھروں سے نکل پڑے یہ پہلے ہی نہتے کردیے گئے تھے

آگے بڑھے تو انگریز سپاہیوں کی گولیاں ان کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ پھر ان نہتے عوام کے جوش کا یہ عالم تھا کہ گولیاں کھا کر بھی ان کے قدم آگے بڑھنے سے نہیں رک سکتے۔ جو زخم کھا کر یا مر کر گرا تو دوسرا اس کی جگہ لینے کو آگے بڑھ گیا۔ عوام کے قتل اور غارت گری کا یہ ہنگامہ جاری رہا۔ سیکڑوں شہید ہوگئے ہزاروں لٹ گئے لیکن ان کا ذکر ٹیلر کے خطوط میں کہیں نہیں ملتا صرف چند لوگوں کا تذکرہ اس کی رپورٹ میں ملتا ہے جو اس نے اس واقعہ کے متعلق حکومت بنگال کو 11 جولائی 1857 کو بھیجی جس طرح اصل واقعات پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے وہ اقتباس سے پتہ چلتا ہے:

''...یوں معلوم ہوتا ہے کہ 3 جولائی 1857 کی شام میں اندازے کے مطابق 200 آدمی پیر علی کتب فروش کے گھر پر جمع ہوئے اور طے شدہ پروگرام کے مطابق جو غالباً ایک دن پہلے تیار ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے جھنڈوں کے ساتھ دھوم مچاتے ہوئے اور یا علی یا علی کا نعرہ لگاتے ہوئے سڑکوں پر نکل پڑے اور اس ارادہ سے سیدھے رومن کیتھولک چرچ کا رخ کیا کہ وہاں کے پادری کو مار ڈالیں گے۔ پادری تو بھاگ نکلا مگر یہ لوگ وہاں سے نکل کر دوسروں کو اپنی مدد کے لیے پکارنے لگے۔ پٹنہ میں افیون کوٹھی کے ایجنٹ ڈاکٹر لیال کو جب یہ خبر بھیجی گئی تو وہ فوراً 50 آدمیوں کا دستہ ایک صوبہ دار اور 50 سکھوں کو لے کر پہنچ گیا۔ اس وقت انقلابی چرچ سے نکل کر چوک تک آگے آگئے تھے یہاں انقلابیوں نے اپنا جھنڈا نصب کر رکھا تھا اور مذہبی نعرے لگا رہے تھے۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر لیال انقلابیوں کو سمجھانے کے لیے آگے بڑھا اور امن قائم کرنے کے لیے ان کی خوشامدیں کرنے لگا مگر یہ انقلابی اس پر ٹوٹ پڑے اور اس کو گولی کا نشانہ بنادیا۔ ان میں سے چند دیوانوں نے ڈاکٹر لیال کا سر کاٹ لیا۔ یہ دیکھ کر دستے نے انقلابیوں پر گولیاں چلادی انقلابیوں میں سے متعدد مارے گئے اور گواہوں کے مطابق چند زخمی بھی ہوئے مگر ابھی تک ایک کے سوا دوسرا زخمی مل نہیں سکا ہے۔ اس کے بعد یہ ہجوم منتشر ہوگیا مگر ڈاکٹر لیال کے مرنے کے قبل نئے کورٹ گشت داروغہ سے ان انقلابیوں کی مڈبھیڑ ہو چکی تھی۔ جن میں اگرچہ کورٹ گشت کے داروغہ کو بہت ہی کاری زخم آئے تھے مگر وہ پورے طور پر اچھا ہو رہا تھا...''

ظاہر ہے کہ ٹیلر کا یہ بیان حقائق سے کوسوں دور ہے اور اپنی ظالمانہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش بھی اس قتل عام کے بعد پٹنہ کے باغیوں پر مقدمہ چلائے جانے کے بعد ان کو جو سزائیں دی گئیں اس کی رپورٹ بھی ٹیلر نے حکومت بنگال کو اسی طرح ارسال کی۔ ''14 اشخاص کو سزائے موت دی گئی جن میں 12 آدمی مقدمہ کے فیصلہ کے تین گھنٹوں کے اندر پھانسی کے تختے پر لٹکادیے گئے۔ اس کے بعد پھر 6 آدمیوں کو لمبی سزائے قید دی گئی جس میں دو آدمیوں کو تاحیات عبور دریائے شور کی سزا ہے باقی ایک آدمی کو 14 سال کی سزائے قید دی گئی ہے۔''

اس رپورٹ میں بھی ٹیلر نے سیکڑوں آدمیوں کی پھانسی کی سزاؤں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آج بھی پٹنہ کے چھجو باغ کی سرزمین ان شہیدوں کی داستان بیان کرنے کے لیے اپنی طرف متوجہ کر رہی ہیں۔ یہیں وطن کی محبت کے جرم میں سیکڑوں محبان وطن نے پھانسی پائی۔ پٹنہ میں امن وامان قائم ہونے کے بعد بھی ٹیلر کا ظلم وستم کم نہ ہوا اس کی ضد میں

امیر و غریب سبھی آئے غریبوں کی پیروی کرنے والا تو کوئی نہیں تھا لیکن ان کے بچاؤ کا بھی ایک موقع نکل ہی آیا۔ ایک بڑے آدمی کی شکایت پر ولیم ٹیلر نے پٹنے کے ایک معزز شخص نواب لطف علی خاں کو گرفتار کرلیا اور ان کو سزائے موت تجویز ہونے ہی والی تھی کہ ان کے بھائی خواہ ٹیلر کی شکایت لے کر کلکتہ دوڑ پڑے اور اس کے مظالم کی داستان حکومت کے اعلیٰ افسران کے سامنے بیان کی۔ افسران اعلیٰ کو ٹیلر کے مظالم کی داستان پہلے بھی معلوم ہو چکی تھی۔ چنانچہ خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ ٹیلر کو فوری طور پر معطل کیا گیا اور باڑھ کے رہنے والے نواب امیر علی خاں اس کی جگہ پر عارضی طور پر کمشنر کی حیثیت سے بحال کردیے گئے۔ چنانچہ نواب امیر علی خاں پٹنہ والوں کے لیے رحمت الٰہی ثابت ہوئے اور نواب لطف علی خاں کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے بے گناہوں کو بھی عین وقت پر پھانسی کے پھندے سے بچالیا گیا۔ ولیم ٹیلر کی رپورٹوں میں اب تک پیر علی کا نام سازش کے سرغنہ کی حیثیت سے نہیں آیا تھا لیکن 1857 کے ہنگامے کے کچھ دنوں بعد اپنی کتاب Our Crisis میں وہ لکھتا ہے:

”پیر علی خاں کے لوگوں کو مہینوں باقاعدہ تنخواہیں دینا بہت سے داروغے مقرر کرنا اور بڑی بڑی رقمیں تقسیم کرنا صرف سڑکوں پر ہنگامے مچانے کی نسبت سے نہیں تھا جو واقعات ہنگامے کے دوران ظاہر ہوئے اور خود سازش کرنے والوں کا اقرار، گواہوں کی اجمالی شہادتیں ان سے پورے طور پر یہ بات کھل گئی کہ یہ سازش جو ناکام ہوئی وہ ملک کی ہمہ گیر آتش فشاں بڑی سازش کا ایک حصہ تھا۔ اگر بروقت اس کو روکنے کی تجاویز اور اقدامات نہ کیے جاتے تو اس کے نتائج بڑے تباہ کن ہوتے۔“

ٹیلر کے اس بیان سے پیر علی کی اہمیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ 3 جولائی 1857 کو پٹنہ میں ہنگامہ شروع ہوا اور 2 دنوں کے بعد وہ 5 جولائی کو گرفتار کرلیے گئے۔ ان دنوں ٹیلر کی غارت گری اور قتل عام نے شہر میں قیامت برپا کر رکھی تھی۔ سیکڑوں قتل ہو چکے تھے ہزاروں اپنے گھروں میں پناہ لے کر مصیبت میں پڑے کراہ رہے تھے۔ بڑی بے دردی کے ساتھ لوگ گرفتار کیے جارہے تھے۔ گھروں کے دروازے بند تھے۔ سڑکیں ویران اور سنسان تھیں، پیر علی خود بھی زخموں سے چور تھے۔ لیکن احساس ذمے داری اور فرض شناسی کا یہ حال تھا کہ ہر جگہ اپنے ساتھیوں کی خبر گیری میں مصروف تھے۔ وہ ہر جگہ تنہا چھپتے چھپاتے جاتے لوگوں کو تشفی دیتے اور ان کی ہر ممکن مدد کرتے۔ اب آزادی کے ہنگامے کا سارا بوجھ اکیلے انھیں کے سر پر آگیا تھا۔ انھیں حالات میں یہ گھوم پھر کر حالات کا جائزہ لے رہے تھے کہ ان کی مشتبہ حالت دیکھ کر پولس نے گرفتار کرلیا۔ لڑے، بھڑے بغیر گرفتار ہونا پیر علی کو پسند نہ تھا چنانچہ وہ لڑے اور خوب لڑے اور جب مجبور ہو گئے۔ تو پولس کی جماعت نے انھیں گرفتار کرلیا۔ گرفتاری کے بعد بھی پیر علی نے اپنا وقار قائم رکھا یہ جانتے ہوئے کہ اس وقت انگریزوں کو ان کی بڑی تلاش ہے اور ہر جگہ سپاہی ان کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور پولس والوں کے رویے سے یہ معلوم ہوا کہ گرفتار کرنے والا ان کو بالکل نہیں پہچانتا پھر بھی جب پیر علی سے ان کا نام پوچھا گیا تو سچے بہادر کی طرح انھوں نے اپنا صحیح نام بتایا۔ وہ 5 جولائی کو گرفتار ہوئے اور صرف دو دن بعد 7 جولائی 1857 کو پٹنہ کے کمشنر ولیم ٹیلر اور یہاں کے مجسٹریٹ نے مل کر ان کے لیے پھانسی کا فیصلہ کردیا اور وہ بھی اس طرح کہ اس فیصلے کے تین گھنٹے کے اندر ان کو پھانسی دے دی جائے یہ سبھی واقعات آج بھی سرکاری کاغذات میں گواہوں کے بیان کے ساتھ محفوظ ہیں۔

پیر علی خاں بے خوف اور مستقل مزاج مذہبی دیوانوں کا ایک نمونہ تھا۔ صورت میں مکروہ جس میں درندگی اور ترش روئی ٹپکتی تھی مگر ساتھ ہی مطمئن اور خوددار اور گفتگو اور کردار میں صاحب عظمت و وقار نظر آتا تھا۔ جب انتہائی سزا کا حکم اس کے خلاف صادر کیا جاچکا تو میں نے اس سے چند سوالات کی غرض سے جس سے سازش کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل ہوسکے۔

پیر علی کے کردار کی عظمت اس بات میں پوشیدہ ہے کہ انھوں نے جھوٹ بول کر چھوٹ جانے کا بہانہ نہیں ڈھونڈا تھا۔ لیکن اس سے بڑھ کر مندرجہ ذیل واقعات میں وہ اپنے کردار کی انتہائی اونچائی پر نظر آتے ہیں۔

”گہرے زخموں کے ساتھ بغیر کسی علاج و معالجے کے دو دنوں تک انگریزوں کے قید کی سختیاں جھیلنے کے بعد اس حالت میں کہ ان کے کپڑے بدن پر چیتھڑے ہو رہے ہیں اور یہ چیتھڑے انھیں کے خون میں سارے کے سارے بھیگے ہوئے ہیں۔ زخموں سے خون اور پیپ جاری ہے۔ آنکھیں دھنسی ہوئی ہیں۔ ہمہ وقت پولس کی مار پیٹ اور مسلسل فاقوں سے چہرہ سُتا ہوا ہے۔ داڑھی اور سر کے بالوں میں گرد بھری ہوئی ہے۔ پاؤں میں بیڑیاں دنیا والوں سے دور صرف ہاتھ ہتھکڑیاں ان کے ہاتھ تھامے ہوئے ہیں اور کان یہ آخری فیصلہ بھی سن چکے ہیں کہ 3 گھنٹے کے بعد اُسے پھانسی دے دی جائے گی۔ پھر بھی جب پیر علی خاں کو آخری بار انگریزوں کے سامنے پوچھ گچھ کے لیے لایا جاتا ہے۔ اس کا حال ان کا بدترین دشمن ولیم ٹیلر اپنی کتاب Our Crisis میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ:

”پیر علی خاں بے خوف اور مستقل مزاج مذہبی دیوانوں کا ایک نمونہ تھا۔ صورت میں مکروہ جس میں درندگی اور ترش روئی ٹپکتی تھی مگر ساتھ ہی مطمئن اور خوددار اور گفتگو اور کردار میں صاحب عظمت و وقار نظر آتا تھا۔ جب انتہائی سزا کا حکم اس کے خلاف صادر کیا جاچکا تو میں نے اس سے چند سوالات کی غرض سے جس سے سازش کے متعلق کچھ اور معلومات حاصل ہوسکے، اس کو اپنے خاص کمرے میں بلا بھیجا زنجیروں سے خوب جکڑا ہوا یہ میلے اور گندے کپڑوں میں ملبوس جن پر ہر جگہ اس کے پہلو کے زخموں کے خون کے گہرے دھبے تھے وہ میرے اور دوسرے انگریز ساتھیوں کے سامنے لایا گیا۔ اگرچہ اس کو معلوم تھا کہ اس کی زندگی کی آخری امید بھی ختم ہو چکی ہے مگر اس کے چہرے سے ذرا بھی اضطراب، مایوسی اور خوف ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ اس سوال پر کہ کیا وہ اب کوئی ایسا کام کرنے کو تیار ہے جس سے اس کی جان بچ جائے۔ اس نے بڑے ہی استقلال اور نفرت کے لہجے میں اس کا جواب یوں دیا: کہ چند مواقع ایسے بھی انسان کی زندگی میں آتے ہیں جہاں جہان کی پرواہ نہ کرنا ہی شرافت و دیانت داری ہے۔ اس کے بعد اس نے میری سخت گیری پر طنز کرتے ہوئے اپنی تقریر یوں ختم کی ”تم مجھ کو اور میرے ایسے لوگوں کو روزانہ پھانسی دیتے رہو مگر یاد رکھو کہ میری جگہ پر ہزاروں پیدا ہوتے رہیں گے اور تمھارا ظالمانہ مقصد کبھی حاصل نہ ہوگا۔“

اس کے بعد حق و انصاف اور وطن کی آزادی کے لیے لڑنے والے اس عظیم محب وطن کو پھانسی دے دی گئی مگر اس شہادت سے قوم کو ایک نئی زندگی ملی:

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

حکومت بہار نے پیر علی کی یاد میں عوام کے پرزور مطالبے پر کچھ دنوں پہلے گاندھی میدان کے پچھم اتر کونے پر شہید پیر علی خاں پارک کی بنیاد رکھی ہے جس میں صبح و شام نوجوانوں اور بچوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے لیکن افسوس ہے کہ ان کی زندگی اور کارناموں کے متعلق ایک بھی لفظ کہیں دیکھنے اور سننے کو نہیں ملتا۔ ■

Mohd Anwarul Haque, Head Dept of History, Oriental College, Patna City, Patna - 800008 (Bihar)

عبداللہ خالد

جنگ آزادی کی فراموش کردہ شخصیت

مجاہدِ آزادی نجو خاں

جدو جہدِ آزادیِ ہند کو عموماً 1857 سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اسی حوالے سے تحقیق وتحریر کا سلسلہ بھی دراز رہا ہے لیکن بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ اہالیانِ ہند کے دلوں میں جذبۂ حریت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کار پردازوں سے عداوت کا آغاز 1857 سے بھی تقریباً سو سال قبل ہو چکا تھا۔ البتہ اس جذبۂ حریت اور نفرت کا عملی اظہار ایسی منظم شکل میں کبھی نہ ہو سکا تھا جیسا کہ 1857 کے انقلاب میں ظاہر ہوا۔ مختلف والیانِ ریاست، راجا اور خود مختار نوابین اور کسی حد تک مرکزی حکومت کے اربابِ حل وعقد فرواً فرواً زور آزمائی کر کے مغربی تخریب کاریوں سے شکست کھا چکے تھے اور اسی شکست نے اہلِ ہند کے دلوں میں عداوت کا وہ بیج بو دیا تھا جس نے ایک عرصے بعد تناور درخت کی شکل اختیار کر لی۔

ہندوستانی تاریخ کے صفحات پر امن وآشتی، مہمان نوازی اور وسیع القلبی کے اسباق زمانہ بہ زمانہ تحریر ہوئے اور ان کی تابنا کی ہر دور میں مسلم رہی۔ ترک وتاجیک، ازبک، اہلِ ایران، منگول، تاتاری، عرب اور افغان سبھی اقوام اور گروہوں نے اس سرزمین کو تختۂ مشق بنایا لیکن یہ معجزہ بھی تاریخ میں انفرادی حیثیت رکھتا ہے کہ حملہ آوروں کی حیثیت سے آنے والے قلیل عرصے میں اسی زمین کا حصہ بن گئے اور جن پر فتح حاصل کی تھی ان کی تہذیبی اقدار اور محبتوں سے مغلوب ہو کر اس طرح اس خاک کا پیوند ہوئے کہ ان کی اصلی شناخت برائے نام ہی رہ گئی۔ اس حیرت انگیز اشتراک کا باعث باہمی تہذیبوں کا تبالہ اور میل جول ہوا جو اہلِ مشرق کا خاصہ تھا۔ اہالیانِ ہند نے بھی یہی عمل اختیار کیا کہ انھوں نے ابتدا میں تو مختلف اقوام کی قومی ووطنی شناخت کا احساس کیا لیکن بعد میں ان کو اپنے ہی محبت آمیز رنگ میں رنگ لیا اور بحیثیت مجموعی انھیں ہندوستانی سمجھنے لگے۔

تمام بیرونی گروہ اور اقوام میں اہلِ یوروپ بالخصوص انگلستان کے باشندگان ہی ایسے تھے جنھوں نے اہلِ ہند کے جذباتِ محبت کو صدقِ دل سے قبول نہ کیا' نہ ہندوستانیوں کو اپنا ہم رتبہ سمجھا اور نہ ان کی ہمہ رنگ تہذیبی اقدار کو قابلِ اعتنا سمجھا' غالباً اہلِ مغرب میں تہذیبی اقدار کی پاسداری' اور واقعی انسانیت پرستی صدیوں قبل ختم ہو چکی تھی اور اسی المیے نے انھیں خود غرض وخود پسند بنا دیا تھا' ایسا خود پسند کہ اپنے سوا تمام اقوام انھیں حقیر نظر آتی تھیں' رشتوں کی معنویت' اپنائیت' ہمدردی اور شرافت جو انسانی ذات کا خاصہ ہیں اہلِ مغرب کے دلوں سے کبھی کے ناپید ہو چکے تھے اور احساسِ برتری نما احساسِ کمتری تھا کہ انھیں دیگر ممالک واقوام کے تہذیبی وثقافتی ورثے سے ایک طرح کی چڑھ تھی جو آج بھی ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر نما غاصب اپنی فطرت کے مطابق ہندوستانیوں کو حقیر سمجھتے تھے بایں ہمہ اہلِ ہند نے انھیں ایک عرصے تک گوارا کر لیا لیکن جب اپنی حد سے آگے بڑھ کر انگریزوں نے ہندوستانیوں کی قومی شناخت اور مذہبی عقائد کے ساتھ چھیڑ خانی کا عمل شروع کیا تو ان کے خلاف عام نفرت نے فروغ پایا۔

یہ واضح حقیقت ہمارے سامنے مستند ماخذات کی شکل میں موجود ہے کہ 1760 کے آس پاس بلکہ اس سے کہیں پہلے انگریزوں کے لیے تنفر آمیز جذبات فروغ پانے لگے تھے۔ لاتعداد ہندوستانی راجاؤں' نوابین اور والیانِ ریاست مختلف محاذوں پر ان سے رزم آرائی کے تجربات حاصل کر کے ان کی اصلیت اور تفرقہ پردازی کے اصولوں کو پہچان چکے تھے۔

والیِ بنگال نواب سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان جیسی دو بڑی طاقتیں انگریزوں سے نبرد آزما تھیں' مرکز کی مغلیہ حکومت بھی انگریزوں کے روز افزوں اقتدار اور تخریب کاری سے فکر مند تھی' والیِ اودھ نواب شجاع الدولہ بکسر کے میدان میں ان کے مقابلے شکست کا سامنا کر چکے تھے اور روہیل کھنڈ میں افغانستان کے علاقہ روہ سے آئے ہوئے روہیلہ افغانان بھی میران پور کٹرہ شاہجہانپور کے میدان میں اپنا اثاثہ ان کے ہاتھوں گنوا چکے تھے۔ مذکورہ طاقتوں میں شجاع الدولہ نے ابتدائی شکست کے بعد ہی انگریزوں سے سمجھوتہ کر کے ان کے زیر اثر رہنا پسند کر لیا تھا' اور کسی قدر مجموعی حیثیت سے روبہ زوال سلطنت مغلیہ نے بھی لیکن سراج الدولہ' ٹیپو سلطان اور حافظ رحمت خاں نے مغلوں کے برعکس شہیدانِ حریت کے مراتب حاصل کیے۔

روہیلے بہادر' جرأت مند اور غیرت آشنا تھے' انھوں نے شمالی ہندوستان کے علاقے کٹھیر میں کسی طفیلی کی حیثیت سے

نہیں بلکہ اپنے زورِ بازو سے فتح مندی حاصل کر کے مختلف علاقے اپنے زیر اثر کر لیے تھے، ان کا دائرہ کار شمالی ہند کے وسیع ترین علاقے تک ہی محدود نہ تھا بلکہ دہلی اور پنجاب تک ان کی فتوحات اور محاذ آرائیوں کی شہرت تھی اور تقریباً ہندوستان کی ہر طاقت ان کی محاذ آرائی کے ہنر سے کسی نہ کسی قدر واقف تھی۔ روہیلوں کے مکمل اقتدار کے بعد کٹھیر کو روہیلوں کے نام پر روہیل کھنڈ کی شناخت حاصل ہوئی۔ انگریزوں پر بھی اس جماعت کا رعب طاری تھا اور یہ رعب اس صورت میں زیادہ قوی ہو گیا تھا کہ والیِ اودھ اور سلطنت مغلیہ کی طرح روہیلے انگریزوں کے زیر اثر نہیں آسکے تھے، ان کی خود مختاری مسلم تھی، اسی خود مختاری کو اپنی طاقت کا جزوِ لاینفک سمجھنے والے روہیلے ہمہ وقت جان کی بازی لگانے کو تیار رہتے تھے۔

چونکہ انگریزوں کا بنیادی مقصد سلطنت مغلیہ کے وقار کو پامال کر کے مرکزی حکومت پر قابض ہونا تھا، اس راستے میں سب سے بڑی دشواری کی صورت میں روہیلے حائل تھے اس لیے ان کی طاقت ختم کرنے اور انھیں منتشر کر دینے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین مسلسل کوشاں تھے۔ ان کوششوں کا عملی اظہار اولین طور پر اس طرح ہوا کہ والیِ اودھ شجاع الدولہ کو روہیل کھنڈ کے والی نواب حافظ رحمت کے خلاف بھڑکا کر اور فوجی مدد کا وعدہ کر کے دو اہم مقاصد پورے کر لیے گئے۔ پہلا مقصد روہیلہ طاقت پر ضرب کاری لگانا اور دوسرا شجاع الدولہ سے بے پناہ دولت کے حصول کے ساتھ اودھ کے معاملات میں دخل اندازی کا آغاز۔

1774 میں میران پور کٹرہ شاہجہانپور میں نواب حافظ رحمت خاں انگریزوں کے خلاف مردانہ وار لڑتے ہوئے شہید ہوئے تو روہیلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات مزید قوی ہو گئے۔ انگریزوں نے روہیلوں کے وسیع علاقے چھین کر انھیں رامپور جیسی چھوٹی ریاست تک محدود کر دیا۔ فیض اللہ خاں بانی ریاست رامپور نے اس ویران علاقے کو بھی اپنے حسنِ انتظام اور ہنرمندی سے قلیل عرصے میں گہوارۂ امن وامان اور معمورۂ علوم وفنون بنا دیا۔

1774 کی جنگ کے بعد صلح کے وقت نواب فیض اللہ خاں نے اپنی آبائی جاگیر رامپور کی بازیافت کی، اس لیے اس جاگیر کے بجا طور پر مالک بھی وہی تھے لیکن نظام سلطنت دو حصوں میں تقسیم تھا، ایک روہیلوں کا قبائلی نظام اور دوسرا والیِ ریاست کے انتظامی امور۔

دو حصوں میں تقسیم کا یہ عمل بانی روہیل کھنڈ نواب علی محمد خاں (متوفی: 1749) کے زمانے سے چلا آتا تھا۔ انھوں نے روہ سے آنے والے روہیلوں سے مساویانہ سلوک کی بنیاد پر انھیں بحیثیت ملازم نہیں بلکہ شرکائے حکومت کے طور پر قبول کیا تھا۔

قیام ریاست رامپور کے بعد بھی یہی دو نظام چلتے رہے یعنی روہیلوں کا نظام جرگہ (قبائلی نظام) اور عام انتظامی امور۔ نواب فیض اللہ خاں نے پچیس سال تک نہایت ذہانت وذکاوت نیز عزووقار کے ساتھ حکومت کی اور کبھی مذکورہ نظام ہائے سلطنت میں ٹکراؤ کی صورت پیدا نہ ہونے دی۔ 1794 میں فیض اللہ خاں کے انتقال کے بعد ان کے فرزند اکبر محمد علی

تاریخ میں اس جنگ کو 'جنگِ دوجوڑا' اور 'جنگِ نجو خانی' کے نام سے شہرت حاصل ہے جنگِ نجو خانی کے نام سے شہرت کی وجہ رامپور فوج کے سپہ سالار اور قبائلی نظامِ حکومت میں مرکزی حیثیت رکھنے والے اکوزئی افغان قبیلہ کے معزز سردار غلام مصطفیٰ خاں عرف نجو خاں کا حریت پسندانہ کردار ہے۔

خاں والیِ ریاست ہوئے۔ محمد علی خاں ذی ہمت تھے، ذہین تھے اور صاحبِ علم بھی لیکن اپنے والد اور دادا کی طرح انتظامی امور کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔ مکمل خود مختاری کے خواہش مند تھے اور مشترکہ نظام حکومت میں نہ تو روہیلے ہی مکمل خود مختاری کے دعوے دار ہو سکتے تھے اور نہ ہی محمد علی خاں اس کے اہل قرار پا سکتے تھے، نتیجہ اختلافات وتنازعات کی شکل میں رونما ہوا جن کا انجام نواب محمد علی خاں کے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاریخی ماخذ اس حقیقت پر صدا بند ہیں کہ روہیلوں کی مخالفت کے علاوہ نواب کے برادر اصغر غلام محمد خاں حکمرانی کے خواہش مند تھے اور واقعہ قتل نواب محمد علی خاں کی انجام دہی میں بہر حال روہیلوں کے شریک کار رہے۔ اس عصر کے اہم وقائع نویس مرزا (مفتی) عبدالقادر کا بیان ہے:

"غلام محمد خاں کہ برادر عینی او بود واز عہدِ پدر ہوائے ریاست در سرداشت بدل اندیشہ دگر کرد اگرچہ مسند نشین چار برادر اول را بہ ہر یکے دو صد اشرفی برسم خلعت داد وغلام محمد خان را کہ میان آناں کم سال بود علاوہ ازاں بہ مصاحبت ومختاری فوج امتیاز بخشید لیکن حوصلہ اش برآں قناعت نکرد شوریدہ سران فوج را مانند خاندان محمد عمر خان ومصطفیٰ خان زبان زد بہ نجو خان باخود یکے ساخت وگفت کہ در ریاست ایں کس امتیاز اولیٰ وادنیٰ نخواہد ماند۔" [1]

مقتول نواب محمد علی خاں کو والیِ اودھ کے توسط سے کسی قدر انگریزی حمایت بھی حاصل تھی۔ انگریز روہیلوں کو دوہرے نظام حکومت کے بکھیڑوں سے دوچار دیکھ کر مطمئن تھے۔ روہیلوں کے ذریعے نواب محمد علی خاں کے قتل اور غلام محمد خاں کی مسند نشینی نے انھیں پھر چونکا دیا اور اس حادثے کے پس منظر میں انھیں روہیلوں کی مکمل خود مختاری کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا ہوا نظر آیا۔ والیِ اودھ کو پھر حامی بنا کر روہیلوں پر حملہ کرنے کی تیاری کی گئی اور حمایت کے پس پردہ اودھ کے معاملات میں زیادہ گہرائی تک دسترس حاصل کرنے نیز فوجی اخراجات کا بار والیِ اودھ کے کاندھوں پر رکھنے کی سوچی سمجھی پالیسی کارفرما تھی۔

تاریخ میں اس جنگ کو 'جنگِ دوجوڑا' اور 'جنگِ نجو خانی' کے نام سے شہرت حاصل ہے، جنگِ نجو خانی کے نام سے شہرت کی وجہ رامپور فوج کے سپہ سالار اور قبائلی نظامِ حکومت میں مرکزی حیثیت رکھنے والے اکوزئی افغان قبیلہ کے معزز سردار غلام مصطفیٰ خاں عرف نجو خاں کا حریت پسندانہ کردار ہے۔

24 اکتوبر 1794 کو شہر بریلی کے نزدیک دوجوڑا کے میدان میں انگریزی سپاہ اور روہیلوں کے درمیان معرکۂ کارزار چھڑ گیا۔ والیِ اودھ نواب آصف الدولہ معروف بہ نواب وزیر نامعلوم وجوہات کے سبب جنگ کے میدان میں اپنی فوج کے ہمراہ معینہ وقت تک نہ پہنچ سکے اور شاہجہان پور میں خیمہ زن رہے۔ مقابلہ براہِ راست انگریزوں اور روہیلوں کے درمیان ہوا۔ روہیلوں نے اپنی مشہورِ زمانہ جرأت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انگریزی سپاہ کی توپوں اور جدید بندوقوں کے مقابل محض نیزوں اور تلواروں سے ایسی شجاعت دکھائی کہ چند لمحوں میں انگریزی فوج کو درہم برہم کر دیا۔ انگریزی فوج کے چونتیس اہم اور آزمودہ کار افسرانِ فوج، ڈھائی سو عام انگریز سپاہی اور سترہ سو ہندوستانی سپاہیوں کو ہلاک کر کے روہیلے مزید کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے تھے کہ روہیلوں کی سپاہ میں پہلے سے موجود انگریزوں کے خیرخواہان اور انگریزوں سے مختلف مقاصد کی تکمیل کے خواہش مند افراد نے فتح کے نقارے بجوا دیے جن کے پس پردہ انگریزوں کو

نئے حملہ کی صف بندی کے لیے آگاہ کرنا نیز روہیلوں کو جنگ سے یکسر غافل کر دینا تھا۔ روہیلہ فوج کے بڑے افسران ہنوز محتاط رہے لیکن عام فوجی مالِ غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے اسی موقع کا فائدہ اُٹھا کر بعجلت تمام انگریزی سپاہ نے نہتے سپاہیوں میں ہیجان پھیلانے کے لیے ان پر توپ کے گولوں کی بارش شروع کر دی۔ صف بندی کا نظام پہلے ہی درہم برہم ہو چکا تھا اس لیے جنگ نے جز وقتی سنبھالا بھی لیا لیکن اسی اثنا میں سپہ سالار فوج نجو خاں توپ کا گولہ لگنے سے شہید ہو گئے [2] اور روہیلے باوجود جرأت مندی کے میدانِ جنگ سے واپسی پر مجبور ہوئے۔

جنگِ نجو خانی المعروف جنگِ دوجوڑا اپنی کچھ خصوصیات کے سبب تاریخ میں انفرادی حیثیت کی حامل ہے، روہیلوں کی غیر معمولی شجاعت اور جذبۂ حریت پسندی، میدانِ جنگ میں عظیم الشان بارودی ذخائر کے مقابلے تلواروں اور نیزوں سے انگریزی سپاہ کا قتل عام اور باوجود شکست روہیلہ فوج کے کشتگان کی تعداد انگریزوں کے مقابلے نصف سے بھی کم ہونا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کارپرداز اہلِ قلم اپنے کشتگان وخستگان کی تعداد کم بتانے پر مصر ہیں لیکن اس کے برخلاف انگریزوں کے حامی مصنّفین جن میں سے اکثر اس جنگ کے چشم دید گواہ ہیں اور روہیلوں کی غیر معمولی شجاعت کا اعتراف بھی کرتے ہیں نیز انگریزی فوج کے نقصان کو روہیلوں کے مقابلے دوگنا بتاتے ہیں۔ اس سلسلے میں اودھ کے مورخین سید غلام علی خاں مؤلف عماد السعادت اور مرزا ابو طالب اصفہانی مؤلف وقائع زمان نواب آصف الدولہ معروف بہ تاریخ آصفی کے اسما خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

جنگِ نجو خانی کے مرکزی کردار اور رامپور فوج کے سپہ سالار غلام مصطفیٰ خاں معروف بہ نجو خان اکوزئی آخون خیل اپنے وقت کے اہم سردارِ قوم اور حریت پسند شخص تھے۔ نجو خان کے والد محمد مستقیم خاں اور دادا کا نام محمد کبیر خاں المعروف شیخ کبیر تھا، ہر دو اصحاب اپنے وقت کے اہم سردار تھے۔ نجو خان کے علاوہ ان کے دو حقیقی چچا محمد عبدالحکیم خان اور محمد مقیم خان بھی رسالدار اور کثیر فوج رکھتے تھے۔ نجو خان کو نواب فیض اللہ خاں کے زمانہ حکومت میں اپنے برادرِ اکبر محمد مستجاب خاں عرف مستو خاں کے بعد فوج کی سرداری حاصل ہوئی۔

نجو خان انتہائی علم دوست اور ادب پرور شخص تھے، ان کے پاس علما وفضلا، ادبا وشعرا، اطبا اور اہلِ علم حضرات کی کثیر جماعت تھی جن میں اکثر وظیفہ یاب تھے۔ روہیل کھنڈ کے بزرگ ونامور شاعر مولوی قدرت اللہ شوق، غلام ہمدانی مصحفی اور دیگر ہم عصر تذکرہ نگاروں نے نجو خان کی علم دوستی اور قدردانی کا اعتراف کیا ہے۔ غلام ہمدانی مصحفی نے صغیر علی انصاری مروت سنبھلی کے ذکر میں لکھا ہے:

"صغیر علی انصاری مروت تخلص کہ بہ پسر مصری شہرت دارد ولد کبیر علی عرف حکیم کبیر سنبھلی شیخ انصاری کہ ذکرش گزشت جوانِ قابل ودانا است۔ تحصیل کتب وغیرہ والدِ خود در رامپور کردہ۔ بمقتضائے موزونیٔ طبع چوں شوق شعر دامن دلش رابسوئے خود کشید، اُورا بہ صحبت نجو خان پسر مستقیم خان کہ جوانِ شاعر دوست گزشتہ۔۔۔" [3]

نجو خاں کا اہم ترین کارنامہ رامپور میں مشاعروں اور ادبی نشستوں کے فروغ میں حصے داری بھی ہے اور ان سب سے بڑھ کر یادگار کارنامہ یہ ہے کہ ان کے حکم پر حکیم میر ضیاء الدین عبرت نے ملک محمد جائسی کی پدماوت کو اردو نظم کے قالب میں ڈھالنا شروع کیا تھا، 1780 میں عبرت کے انتقال کے سبب یہ کام ادھورا رہ گیا اور 1796 میں غلام علی عشرت نے اس کو پایہ تکمیل کو پہنچایا۔ از روئے تحقیق اس ترجمہ سے قبل اردو میں پدماوت کا کوئی منظوم ترجمہ دریافت نہیں ہو سکا ہے اس لیے اس کو پدماوت کا اولین اردو ترجمہ کہنا بے جا نہ ہوگا، البتہ فارسی زبان میں محمد عاقل خاں رازی وغیرہ کے کچھ تراجم پہلے سے موجود تھے اور خود عبرت نے بھی محمد عاقل خاں رازی کے ترجمے کو پیشِ نظر رکھنے کا اعتراف کیا ہے:

نجو خان کے والد محمد مستقیم خاں اور دادا کا نام محمد کبیر خاں المعروف شیخ کبیرتھا، ہر دو اصحاب اپنے وقت کے اہم سردار تھے۔ نجوخان کے علاوہ ان کے دو حقیقی چچا محمد عبدالحکیم خان اور محمد مقیم خان بھی رسالدار اور کثیر فوج رکھتے تھے۔ نجو خان کو نواب فیض اللہ خاں کے زمانہ حکومت میں اپنے برادرِ اکبر محمد مستجاب خاں عرف مستوخاں کے بعد فوج کی سرداری حاصل ہوئی۔

رقم جو ہے یہ مضموں شعلہ بنیاد
مری روشن طبیعت کا ہے ایجاد
نہ سرقہ ہے نہ کوئی مبتذل ہے
توارد لیکن اس کا محتمل ہے
مگر مضمونِ عاقل خان رازی
کہ اس نے داستاں یہ فارسی کی
تیمن کے طریق اس میں ہے داخل
کہ میں اس کے مقولے کا ہوں ناقل
نہیں ہے گا یہ غیرت کا تقاضا
کہ مضموں لا کے باندھوں میں پرایا
میں غیروں کو ادب کرتا ہوں ارشاد
میں اپنے عصر کا ہوں آپ استاد [4]

میر ضیاء الدین عبرت کے علاوہ روہیل کھنڈ کے دیگر نامور شعرا مثلاً غلام جیلانی رفعت، عنبر شاہ خاں عنبر، محمد کبیر خاں تسلیم، شجاعت علی نسیم، ہمت خاں ہمت وغیرہ بھی نجو خان کے حلقے سے وابستہ تھے۔ مذکورہ اصحاب نے بھی نجو خان کے حکم پر کئی دیگر تالیفی وتصنیفی کارناموں کو انجام دیا ہے۔

دوجوڑا کے میدان میں لاتعداد انگریز سپاہیوں، افسران فوج اور کرنل جارج برنگٹن جیسے آزمودہ کار افسر کو ہلاک کرنے والے نامور مجاہد آزادی غلام مصطفیٰ خان عرف نجو خان کا مقبرہ آج بھی رامپور بریلی شاہراہ پر فتح گنج غربی (نزدیک بریلی اتر پردیش) میں موجود ہے۔

حواشی:

(1) روزنامچہ (وقائع عبدالقادر خانی) از مفتی عبدالقادر رامپوری مخطوطۂ فارسی مخزونہ رامپور رضا لائبریری، نمبر موجودات 4630،ص 5

(2) عنبر شاہ خاں مصاحب وملازم وپروردۂ نجو خان نے 'رستم روزِ نبردم' سے نجو خان کی شہادت کا سنہ ہجری میں مادۂ تاریخی برآمد کیا ہے۔ (تشریق الخیال دیوان فارسی عنبر مخطوطہ فارسی مخزونہ رامپور رضا لائبریری، رامپور نمبر موجودات: 3804)۔ راقم الحروف نے 'سپہ سالارِ روہیلہ مجاہد غازی حق' سے مادۂ تاریخ شہادت برآمد کیا ہے، رامپور کے صاحب لہجہ شاعر منظر واحدی نے ذیل کی تاریخ شہادت کہی ہے:

ساتھیوں کو بھی تیرے دادِ فخر ہے ان پہ زندہ باد
فوجِ روہیلہ کے امام تونے وطن پہ دی ہے جان
آج بھی لوگ باشعور کہتے ہیں اہلِ رامپور
"قوم کا تجھ کو ہے سلام بھائی شہید نجو خان"
(1974)

(3) پدماوت منظوم اردو از عبرت وعشرت، ص 10، سنہ طباعت 1288 ہجری، مطبع خاص محلہ (گلشن اودھ) سعادت گنج لکھنؤ

(4) تذکرۂ ہندی از غلام ہمدانی مصحفی، ص 253 مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ مطبوعہ 1985

■

Abdullah Khalid, Gher Katey Baaz Khan, Rampur - 244901 (UP)

ظفر سعیدی

دو مشہور انگریز شاعر اور ہندوستان کی آزادی

18ویں اور 19ویں صدی کے دوران دنیا کے مختلف ممالک کے عوام اپنے اپنے طریقے سے انقلابی جدوجہد میں مصروف تھے، 1775 میں امریکہ کی تحریک آزادی برطانوی نیابت کا بندھن توڑ چکی تھی، 1789 میں فرانس میں انقلابی تحریک کا آغاز ہو چکا تھا، ہندوستان میں پہلی مسلح تحریک سے برطانوی حکومت کی چولیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں، اور عالمی سطح پر اس تحریک کے اثرات کے سبب اس کا رعب ودبدبہ تقریباً ختم ہو چکا تھا، اسی زمانے میں وہاں کے دو مشہور شاعروں نے اپنی پرمغز شاعری کے ذریعے تحریک آزادی کی آبیاری اور ہندوستانی عوام کے غم وغصے کی بھرپور ترجمانی کی، اسی سبب یہ کہنا درست ہے کہ 1857 کی ہماری مسلح انقلابی تحریک ہمارے ملک تک محدود نہ تھی، کیونکہ انگریزوں کی استعماری پالیسی کے خلاف خود ان کے ملک (برطانیہ) میں مخالفت ہورہی تھی، برطانیہ کے دانشوروں کا ایک طبقہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی جابرانہ پالیسی کا شدید مخالف تھا، وہاں کے دو شاعروں نے 1857 سے قبل ہندوستانیوں کے غم وغصے اور ناراضگی کو شعری اسلوب میں بیان کیے اور اپنی ناعاقبت اندیش حکومت کو مستقبل میں شکست سے دوچار ہونے کے خطرے سے آگاہ کیا۔

برطانوی شاعر لارڈ بائرن (Lord Byron) نے سوا سو سال پیشتر (The Curse of Minerva) نام سے ایک مرثیہ لکھا، جس میں برطانوی استعماریت کے خاتمہ کی پیش گوئی کی، اسی طرح ایک دیگر برطانوی شاعر ارنیسٹ جونس (Ernest Jones) نے 1848 میں 'نیوورلڈ' (The New World) نامی کتاب میں ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے ایک نظم لکھی، جس میں اس نے یہ پیش گوئی کی کہ ہندوستانی عوام بہت جلد ہی انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کردیں گے۔ جونس نے یہ بات ہندوستان میں انقلابی تحریک کا قریب سے مشاہدہ کرنے کے بعد لکھی، ان کی یہ نظم 'پوئٹیک جسٹس' (شاعرانہ یا قدرتی انصاف) نام سے لکھی تھی، اس نے جدوجہد آزادی کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "میں دیکھ رہا ہوں کہ ہماری فوج پسپا ہورہی ہے، ہندوستان میں آزادی کے نغمے گائے جارہے ہیں، ہمارا جنرل کفِ افسوس مل رہا ہے، ہمارے ملک میں ہر طرف ماتم کا ماحول ہے، ہر طرف سے یہ آواز سنائی دے رہی ہے کہ ہائے ہمارے ہاتھ سے ہندوستان نکل گیا۔"

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دی نیوز ورلڈ ہندوستان کی مسلح بغاوت کے سوسال کے بعد 1957 میں کیل کٹا ایسٹرن ٹریڈنگ کے ذریعے شائع ہوئی، لارڈ بائرن انیسویں صدی کے ایک رومانی شاعر تھے، وہ ظلم وجبر اور استحصال کے سخت مخالف تھے، لارڈ بائرن دنیا کے پہلے ایسے شاعر تھے جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کی 1821 میں پیش گوئی کی تھی، بائرن کے اندازِ فکر کو بخوبی سمجھنے کے لیے اس وقت کے برطانیہ عظمیٰ میں جاری ردعمل کو سمجھنا ہوگا، یہ ردعمل ان انگریز عہدیداروں کے خلاف تھا جو کہ ہندوستان میں سخت مزاحمت کے بعد برطانیہ واپس آچکے تھے۔

ارنسٹ جونز (Ernest Charles Jones) نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ انگریزی راج میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ وہاں کبھی خون خشک نہیں ہوتا۔

بائرن کی ملاقات، ڈاکٹر ہیملٹن کی چوتھی نسل کے نوجوان اسٹور آرٹ ہیملٹن سے ہوئی تھی، اس سے ملاقات کے موقعے پر وہ بے حد حیران تھا کیونکہ اس کے دادا کے حوالے سے اس کے علم میں یہ بات بھی تھی کہ اس نے 1725 میں دہلی کے مغل بادشاہ فرخ سیر کا علاج کیا تھا جس کے عوض بادشاہ نے اسے صرف 300 روپے سالانہ ٹیکس کی ادائیگی کی شرط پر حیدرآباد، گجرات اور بنگال میں آزادانہ تجارت کی اجازت دی تھی اور اس کے نتیجے میں ہیملٹن خاندان نے فریب اور کوڑے کے زور پر اتنا پیسہ کمایا کہ وہ لندن میں دولت مندوں کی طرح عیش وعشرت کی زندگی گزارنے لگا۔

ہندوستان میں پلاسی اور بکسر کی جنگوں میں انگریزوں کو فتح حاصل ہوئی تھی، اس حوالے سے بائرن نے اس زمانے کے گورنر لارڈ کلائیو کی خیانت اور جعل سازی کے قصے سنائے تھے نیز اس نے کلائیو کے خلاف دائر مقدمے کی ساری دستاویز پڑھی تھی اور کلائیو کی خودکشی کے بارے میں کئی ایک قصے سنے تھے، بائرن کو یہ سن کر حیرانی ہوئی تھی کہ جو انگریز قوم

اپنے حسنِ کردار پر نازاں ہے اسی کے ایک فرد کلائیو نے ہندوستان کے ساہوکار، امی چند کو فریب دینے کے لیے ایک انگریز افسر لوشنگٹن کے ذریعے دوسرے افسر واٹسن کے جعلی دستخط بنوائے۔ چونکہ لارڈ ہیسٹنگس بائرن کا ہمعصر تھا اور اس کے سبب اس وقت کے انگریز سماج میں جو بدنامی ہو رہی تھی اس کی وجہ سے بھی وہ حیران و پریشان تھا۔

ہندوستان میں انگریزوں کے مظالم سے لارڈ بائرن اتنا رنجیدہ تھا کہ اس نے 1821 میں کرس آف منروا جیسی قابل تعریف نظم لکھی جس کے چار مصرعوں میں اس نے برطانوی سامراجیت کے خاتمے کی پیش گوئی کی تھی، وہ چار مصرعے یہ ہیں:

"Look to the East, where Ganges, swarthy race 'Shall shake your usurption to its base;

ترجمہ: مشرق کی طرف دیکھو، جہاں گنگا کا سیاہ بہاؤ تمھاری غاصب حکومت کی بنیاد کو ہلا دے گا۔

برنارڈ رسیل رقم طراز ہیں کہ 'بائرن' نے کبھی دریائے گنگا کا مشاہدہ نہیں کیا تاہم چونکہ برطانیہ کے لوگ ہندوستانیوں کو 'کالا آدمی' کہتے ہیں، اس لیے انھوں نے Ganges, Swarthy,race (گنگا کا سیاہ بہاؤ) لکھا، رسیل نے اپنی کتاب، ہسٹری آف دی ویسٹرن فلاسفی' میں بائرن کی نظم کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے ہندوستان کے تعلق سے یہ نظم انگریزوں کی ظالمانہ ذہنیت کے تئیں لکھی ہے، لارڈ بائرن برطانیہ میں آزادیٔ ہند کے سب سے بڑے حمایتی تھے اور وہ اپنی مذکورہ نظم کو نظمِ سیاست (Poetry of Politics) تصور کرتے تھے، ان کا نظریہ تھا کہ جمہوریت کے بغیر سیاست بے معنی چیز ہے، اسی نظریہ کے تئیں وہ ہندوستان میں انگریزی استعماریت کے سخت نکتہ چیں تھے، انھوں نے کہا تھا کہ ہمارے برادرانِ وطن نے بنگال کے بافندوں (بنکروں) کو اسی طرح بھوکے مرنے کو چھوڑ دیا ہے جس طرح مادرِ وطن میں نارتی گھم کے بافندوں کو۔

اپنی تخلیقات میں اعلیٰ خیالات کا اظہار کرنے والے شعرا کے برعکس لارڈ بائرن خالص سیاسی نظریات کے حامل شاعر تھے، اس بات کے ثبوت کے لیے ان کا ایک تمثیلی خاکہ ہے جس میں انھوں نے 'پیسو ریزسٹینس' Passive Resistence لفظ کا استعمال کیا ہے۔

ہندوستانیوں کے جمہوری جذبات و احساسات کی شعری پیرائے میں ترجمانی کرنے والے ایک دوسرے انگریز شاعر ارنیسٹ جونس تھے۔ جونس نے 1848 میں پیش گوئی کی تھی کہ ہندوستان میں انگریز حکومت کے خلاف ایک شدید مزاحمت کا آغاز ہوگا جس میں انگریزوں کی شکست ہوگی، ان کی نظم 'دی نیو ورلڈ' کے چند مصرعے درج ذیل ہیں جس میں اس نے اپنے اُن ہم وطن لوگوں پر اشاراتی انداز میں تنقید کی ہے جنھوں نے ہندوستان پر تسلط حاصل کیا:

وِکٹورِیَس ڈِلیوز فرام
اے ہنڈریڈ ہائیٹس
زولس ڈَفیِرس ٹُو رَینٹ آف
پیپلز رائیٹس
اینڈ سپاہے سولزرُس، وِیکننگ
بینڈ بابے بینڈ
آیٹ لاسٹ ری ممبَر دے ہیوامے
فادر لینڈ
دَین فلائز دھکسٹر نگ
جج، دے پینڈ رنگ پیرز

ترجمہ: آسمانی رفعت کی طرح فتح یاب، لہراتی موجوں جیسے عوامی اختیارات کی بازیابی کے لیے خطرناک سیلاب اور صف

برطانوی مورخ اور سیاست کار برنارڈ رسل نے لکھا ہے کہ لارڈ بائرن برطانیہ میں آزادیٔ ہند کے سب سے بڑے حمایتی اور ہندوستان میں انگریزی استعماریت کے سخت نکتہ چیں تھے۔

آرا بیدار فوجوں کی جمعیت، یاد کر رہی ہے، کہ ہمارا بھی کوئی وطنِ عزیز ہے، فریبی جج، بدعنوان افسران سے جب اس کا جواب طلب کیا گیا تو وہ فرار ہو گئے، یہاں بھیک مانگنے والے انگریز بھی کیسے نواب بن گئے۔

انگریز شاعر ارنیسٹ جونز نے 1857 میں رونما ہونے والی انقلابی تحریک کے آٹھ سال پیشتر ہی پیش گوئی کر دی تھی جو کہ ہندوستان کی پہلی مسلح تحریک تھی، جونز نے ایک نظم 1851 میں جیل میں لکھی، جس کا عنوان تھا ہندوستان یا نئی دنیا کی بغاوت، ان کو چارٹسٹ تحریک میں شمولیت کے سبب گرفتار کیا گیا تھا، ان کو جب 1857 کی مسلح انقلابی تحریک کا علم ہوا تو انھوں نے اس حوالے سے ایک مستقل کتاب لکھی جس کے دیباچے میں انھوں نے لکھا تھا کہ "یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ 17 کروڑ عوام اب بغاوت پر کمربستہ ہے بلکہ تعجب یہ ہے کہ اس نے اپنے ملک پر غیرملکی افراد کی بالادستی کو کس طرح تسلیم کیا، یہ لوگ قطعی اسے تسلیم نہ کرتے اگر ان ہی کے راجے، مہاراجے اور نوابوں نے ان کے ساتھ دغابازی نہ کی ہوتی، ان لوگوں نے اپنے اپنے ماتحت علاقے انگریزوں کے ہاتھوں گروی رکھ دیے تاکہ انگریزوں کے نام نہاد تعاون کے ذریعے آپس میں وہ ایک دوسرے کا گلا کاٹ سکیں۔

اسی کتاب میں دوسری جگہ (ص 53-52 پر) ارنیسٹ جونز مزید لکھتے ہیں کہ "تسلیم کیجیے کہ خارجی لوگ تمھارے یہاں ایک کارخانہ نصب کرنے کی اجازت طلب کریں اور اس کے لیے اجازت مل جائے، اس کے بعد وہ آپ کو آپس میں لڑائیں اور اس کے ذریعے وہ لوگ رفتہ رفتہ آپ کے ملک کے ہر علاقے کو فتح کر لیں۔ اور پھر آپ کے ملک میں آپ کو ہی غلام بنا دیں تو آپ کو کیسا لگے گا؟ تمھاری پیداوار کے وسائل غصب کر لیں اور تم سے ٹیکس بھی وصول کریں۔ تمھیں سر نیچے اور پاؤں اوپر کر کے لٹکا دیں تو کیا کریں گے؟ کیا ایسی صورت حال میں آپ اپنے حقوق کے لیے بغاوت پر کمربستہ نہ ہوں گے اور خود سے، دنیا سے، جنت سے، اور زمین سے چیختے ہوئے یہ نہ کہیں گے کہ تم سب اس عدل و انصاف پر مبنی بغاوت کے شاہد رہو؟ میرے ہم وطنو! تقریباً ایسا ہی سلوک برطانیہ نے ہندوستانیوں کے ساتھ کیا ہے اور یہ موجودہ بغاوت اسی ظالمانہ سلوک کا نتیجہ ہے۔

ارنسٹ جونز (Ernest Charles Jones) نے یہ بھی تحریر کیا تھا کہ عموماً کہا جاتا ہے کہ انگریزی راج میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا اور اس کے ساتھ میں یہ کہتا ہوں کہ وہاں کبھی خون خشک نہیں ہوتا۔ ہندوستان کی 1857 کی جدوجہد آزادی کے ضمن میں ایک دیگر انگریز افسر رچرڈ کانگریو نے 'انڈیا' نظم سے ایک اقتباس شائع کر کے ہندوستان میں انگریزوں کے خوں ریز مظالم کو طشت ازبام کیا تھا، یہ باتیں مذکورہ کتابوں کے علاوہ ریبیلینس 1857۔ اے سمپوزیم (ایڈیٹر پی سی جوشی) میں درج ہیں، نیز اس حوالے سے ایک تفصیل حسب ذیل کتابوں میں بھی درج ہے۔

- انقلاب 1857: ڈاکٹر ولاس شرما
- 1857 کی تحریک جدوجہد آزادی کا ہندوستانی ادب پر اثر: ڈاکٹر بھگوان داس ماہور
- فرسٹ انڈین وار آف انڈی پنڈنس، مارکس اینڈ اینگلیس (ماسکو)

■

Zafar Sayeedi, 102, Ashoka Plaza, First Floor, Masab Tank, Hyderabad - 500004 (AP)

محمد تنویر خان قادری

مولانا فیض احمد بدایونی
دورِ غلامی کے محبِّ وطن عالم دین

مولانا فیض احمد بدایونی کا تعلق بدایوں کے مشہور عثمانی خاندان سے تھا۔ اس نامور خاندان کے بزرگ سلطان شمس الدین التمش کے دور میں قطر (عرب) سے ہندوستان آئے۔

بزرگ دانیال قطری لاہور، دیوبند ہوتے ہوئے بدایوں آئے۔ سلطان التمش نے انھیں بدایوں کا قاضی مقرر کیا۔ خانوادۂ عثمانی میں ہر زمانے میں عالم و فاضل پیدا ہوئے جو زیادہ تر قاضی و مفتی کے عہدے پر فائز رہے۔ اس خاندان کے ایک بزرگ مفتی درویش بدایونی (مفتی بریلی) نے روہیل کھنڈ میں انگریزوں سے 1816 میں جہاد کیا۔ مفتی محمد عوض کی کمانڈ میں قریب پانچ ہزار مجاہدین پرانا شہر بریلی، نزد درگاہ شاہدانہ ولی میں انگریزوں سے لڑے۔

مولانا حکیم غلام احمد مولانا فیض احمد کے والد تھے جنھوں نے بدایوں میں تعلیم حاصل کی۔ آپ بڑے تیر انداز بھی تھے۔ نواب ڈھاکہ کے یہاں مرشد آباد میں ملازم تھے اور وہیں 5 ذی الحجہ 1226ھ میں انتقال فرمایا۔

مولانا فیض احمد کے نانا عبدالمجید (علیہ الرحمہ) اپنے وقت کے بہت بڑے عالم تھے۔ آپ نے بحر العلوم مولانا محمد علی و مفتی عبدالغنی سے تعلیم حاصل کی اور پھر ملک العلما مولانا نظام الدین سہالوی کے شاگرد مولانا ذوالفقار علی (ساکن دیوہ شریف) سے منقول و معقول کا علم حاصل کیا اور اچھے میاں مارہروی (رحمۃ اللہ علیہ) سے خلافت کی سند حاصل کی۔ عبدالمجید کا وصال 1846 میں ہوا۔ مولانا فیض احمد کے ماموں مولانا فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ بھی بڑے عالم و فاضل تھے۔ مولانا نورالحق فرنگی محلی، حکیم ببر علی خاں موہانی، شیخ عبداللہ مکی، شیخ عابد مدنی وغیرہ سے علم حاصل کیا۔ کچھ دن بدایوں کی عدالت میں رہے پھر بنارس کے قاضی بنے۔ آپ نے ردِ وہابیت پر کئی کتابیں لکھیں جن میں 'سیف الجبار'، 'بوارق محمدیہ' خاص ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں مولوی خرم علی بلہوری، مولوی عنایت رسول چریا کوٹی، مولوی سخاوت علی جونپوری، مولوی عبدالفتح گلشن آبادی اور مولانا فیض احمد بدایونی خاص شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کا وصال 1289ھ/ 1872 میں ہوا۔

پیدائش: مولانا فیض احمد بدایونی 1223ھ/ 1808 میں محلہ مولوی، بدایوں (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام مولوی حکیم غلام احمد تھا۔ خدا کی قدرت کہ ابھی فیض احمد تین سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ آپ کی والدہ نے آپ کی والد کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ خوب اچھی طرح سے آپ کے تعلیم و تربیت فرمائی۔

تعلیم و تربیت: مولانا فیض احمد بدایونی بچپن سے ہی بہت ذہین اور ہوشیار تھے۔ آپ جو چیز ایک بار پڑھ لیتے اسے یاد کرلیا کرتے۔ آپ کے گھر والے آپ کی عقل مندی کو دیکھ کر کہا کرتے کہ یہ بچہ بڑا ہوکر خوب نام روشن کرے گا۔

مولانا فیض احمد کی والدہ نے اپنے اس ہونہار بچے کو اپنے بھائی مولانا فضل رسول کے سپرد کر دیا۔ انھوں نے بچے کی خوب اچھی طرح سے پرورش کی۔ مولانا فیض احمد نے تمام علوم وفنون اپنے ماموں فضل رسول بدایونی سے چودہ سال کی عمر میں حاصل کیے۔ آپ جب پندرہ سال کے ہوئے تو مدرسے میں پڑھانے لگے۔ آپ ایک اچھے شاعر اور خطاط بھی تھے۔ تخلص رسوا تھا۔ مقبولیت جلد عام ہو گئی۔ دور دور سے طالب علم آپ کے پاس علم حاصل کرنے کی غرض سے آنے لگے۔ کتاب 'تذکرہ علمائے ہند' میں مولوی عبدالرحمن لکھتے ہیں کہ ''مولوی

فیض احمد بدایونی بن حافظ غلام احمد بن مولوی شمس الدین بن مولانا احمد علی کی ولادت بہ سعادت 1123ھ میں ہوئی۔ تمام علوم عقلیہ ونقلیہ اپنے ماموں مولوی شاہ فضل رسول بدایونی (علیہ الرحمہ) سے مکمل تحقیق کے ساتھ حاصل کیے۔"

بیعت: جب مولانا نے ظاہری علم سے فراغت حاصل کرلی تو علم باطنی کا خیال آیا اور اپنے نانا عبدالمجید سے بیعت ہوکر حلقۂ قادری میں داخل ہوگئے۔

ملازمت: تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے مدرسہ عالیہ قادریہ بدایوں میں پڑھانا شروع کردیا۔ محمد ایوب قادری لکھتے ہیں کہ "بدایوں کے ایک رئیس چودھری تفضّل حسین فاروقی بن محمد عظیم زمیندار چودھری سرائے بدایوں کے ایک خاندانی فیصلے کے کاغذات میری (محمد ایوب قادری) نظر سے گزرے اُس پر دوسرے پنچایتی لوگوں کے ساتھ مولانا فیض احمد کی بھی مہر لگی ہوئی تھی۔ یہ فیصلہ 1836 کا ہے۔ اِس سے یہ خیال گزرتا ہے کہ اس وقت آپ بدایوں میں ہی رہتے تھے۔ یہ صحیح ہے کہ آپ شہر کے لوگوں کے بہت سے معاملات بڑے اچھے طریقے سے نپٹاتے تھے۔ آپ کی مہر میں 'فیض احمد' لکھا ہوا تھا۔"

آگرہ میں قیام: مولانا فیض احمد بدایونی نیک دل انسان تھے۔ بدایوں والوں سے بہت محبت تھی۔ جب بھی کوئی بدایوں کا شخص آتا اُس کی خوب خاطر داری کرتے اور اس کی ہر صورت مدد کرتے۔ کتاب اکمل التاریخ میں ہے کہ "آپ ایک بڑے عہدے پر تھے مگر آپ کا مزاج فقیرانہ تھا۔ آپ کو غربا، فقیروں، طالب علموں اور علم سے بہت محبت تھی۔ آپ اپنے شاگردوں کی وقتاً فوقتاً مدد بھی فرماتے تھے۔ آپ آگرہ میں وقت ملنے پر پڑھاتے بھی تھے۔ ولیم میور نے جو آگرہ میں مجسٹریٹ علاقہ فوج تھا اور بعد کو لیفٹیننٹ گورنر یوپی (1868-1872) ہوا۔ اُس نے آپ سے عربی پڑھی۔ اس انگریز نے کتاب 'لائف آف محمد' لکھی۔ یہ اندرونی طور پر اسلام کا دشمن تھا جس نے محسنِ انسانیت حضورؐ کی ذات مبارک پر انگشت نمائی کی، جس کا جواب سرسید احمد خاں نے لکھ کر اس وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا۔" (مجاہدین آزادی مولانا فیض احمد بدایونی، محمد ایوب قادری) آگرہ اُس وقت عالموں اور فاضلوں کا شہر تھا۔ مفتی انعام اللہ خاں (وکیل سرکار)، مولوی کریم اللہ خاں (صدرالدور)، مولانا قاسم دانا پوری، مولانا غلام امام شہید، مولوی امام (وکیل صدر)، مولوی حافظ ریاض الدین مفتی شہر، شیخ محمد شفیع اللہ الہ آبادی، مولوی منصب علی وکیل، مولوی عظیم الدین، مولوی محمد باسط علی، مولوی محمد معین الدین، مولوی شیخ اعتقاد علی (وکیل)، سید باقر علی (ناظم محکمہ دیوانی)، مفتی عبدالوہاب گوپاموی، مولوی نورالحسن، سید رحمت علی، مولوی طفیل احمد خیرآبادی، مولوی فیض احمد بدایونی اور مولوی ڈاکٹر وزیر محمد خاں جیسے حضرات موجود تھے۔ ان حضرات کی بیٹھک اکثر مفتی انعام اللہ خاں کے یہاں ہوتی تھی۔ مفتی صاحب کا مکان اہلِ علم کا مرکز ہوتا تھا مگر مولانا فیض احمد اور ڈاکٹر وزیر خاں میں بہت گہری دوستی تھی۔ دونوں حضرات بڑے فاضل اور بہادر تھے۔ ہر کام میں ایک دوسرے کی مدد کو تیار رہتے تھے اور یہ دوستی آخر دم تک رہی۔ دونوں حضرات ساتھ ساتھ انگریزی فوج سے لڑے اور نہ جانے کہاں شہید ہوگئے؟

پادری سے مناظرہ: ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد عیسائیوں کی جڑیں بہت مضبوط ہوگئیں اور نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے اپنے مذہب کی خوب زور شور سے تبلیغ کرنا شروع کردی۔ بہت سے ہندوستانی ان کے مذہب میں داخل ہوگئے۔ عیسائیوں نے جگہ جگہ مشن سوسائٹی قائم کی، چرچ، مشن کالج، مشن اسپتال بنوائے اور مشن فنڈ اکٹھا کرکے بانٹنا شروع کیا۔

1854 میں پادری فنڈر (C C P Fonder) یوروپ سے ہندوستان آیا۔ یہاں اُس نے اور اس کی جماعت نے اپنی مذہبی اور اسلام مخالف تقریریں شروع کی اور اس کی کتاب 'میزان الحق' نے خوف وحراس پیدا کردیا تھا۔ پادری فنڈر نے آگرہ کو مناظروں کا گڑھ ٹھہرایا کیونکہ آگرہ اُس وقت علما کا مرکز تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مجھے یہاں فتح حاصل ہوگئی تو عیسائی مذہب کی تبلیغ میں بڑی مدد لے گی۔ اُس نے مسلم عالموں کو چیلنج دیا کہ وہ اس سے مناظرہ کریں۔ اس کے چیلنج کے بعد علما میں مشورہ ہوا۔ مولانا فیض احمد کے دوست ڈاکٹر وزیر خاں نے چیلنج قبول کرلیا اور عیسائی مذہب کے رد کرنے والوں میں مشہور و ماہر مناظر مولانا رحمت اللہ کیرانوی جو عرصے سے پادری سے خط و کتابت کررہے تھے، بلائے گئے۔

10 اپریل 1854 بروز پیر مقام کٹرا عبدالمسیح آگرہ میں مناظرے کا پہلا جلسہ ہوا۔ اہل اسلام کی طرف سے مناظرِ اول مولوی رحمت اللہ عثمانی کیرانوی اور مناظرِ دوم ڈاکٹر وزیر خاں تھے، جن کے مددگار مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ مناظرے میں مسٹر اسمتھ حاکم صدر دیوانی، مسٹر کرسچین سکنڈ، صوبہ بورڈ مسٹر ولیم میور مجسٹریٹ علاقہ فوج، مسٹر لیڈل ترجمان حکومت پادری، ولیم گلبن وغیرہ مفتی ریاض الدین، مولوی حضور احمد سہسوانی، مولوی امیر اللہ مختار، راجہ بنارس، مولوی قمرالاسلام (امام جامع مسجد آگرہ)، مفتی خادم علی (مہتمم مطلع الاخبار)، مفتی سراج الحق، مولوی کریم اللہ خاں، پنڈت جگل کشور، راجہ بلوان سنگھ (بنارس)، قاضی حکیم فرخند علی گوپاموی، مولوی سراج الاسلام کے علاوہ بہت سے علما و روسا شہر موجود تھے۔ مناظرے کی شرط یہ تھی کہ ہارنے والے کو جیتنے والے کا مذہب اختیار کرنا ہوگا۔ دو روز تک مناظرہ ہوا، پادری فنڈر کو انجیل (بائبل) کی تحریف کا اقرار کرنا پڑا۔ اُس نے ہار کا منہ دیکھا اور آگرہ سے فرار ہوکر سیدھا یوروپ پہنچا۔ اس مناظرے کی پوری روداد 'البحث الشریف فی اصحابۃ تنسیخ والتحریف' کے نام سے ڈاکٹر وزیر خاں نے مرتب کی اور حافظ عبداللہ کے اہتمام سے 1270ھ ہی میں فخر المطابع شاہجہاں آباد میں ولی احمد مرزا فرخ کے خرچ سے چھپ کر ہندوستان میں تقسیم کی گئی۔ اسی مناظرے کو چھوٹی تقطیع پر حصہ اوّل 'مباحثہ مذہبی' اور دوسرا حصہ 'مراسلات مذہبی' کے نام سے سید عبداللہ اکبرآبادی نے منشی محمد امیر کے اہتمام سے مطبع منعمیہ اکبرآباد میں 1270ھ میں چھپوایا۔ پہلا حصہ فارسی میں تقریری مناظرے کی روداد ہے اور دوسرے حصے میں ڈاکٹر وزیر خاں اور پادری فنڈر کا تحریری مناظرہ اردو میں ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ مولوی رحمت اللہ کی کتاب 'اظہار الحق' کے حاشیے پر ہے جو قاہرہ سے 1371ھ میں چھپا۔ اس تاریخی مناظرے میں مولانا فیض احمد بدایونی نے ڈاکٹر وزیر خاں کی مدد کی اور ان کی کامیابی میں ان کے ساتھ رہے۔

دھلی کے واقعات: دہلی میں بہادر شاہ ظفر نے خودمختاری کا اعلان کردیا۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اور دوسرے

علما دہلی میں موجود تھے۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج کے ساتھ دہلی پہنچ چکا تھا۔ دہلی کے لوگ دو طرف بٹے ہوئے تھے ایک بہادر شاہ ظفر کی طرف تو دوسرے انگریزوں کی طرف۔ آزادی کے مجاہدین کے ساتھ روہیلوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہو چکی تھی جو جنرل بخت خاں کے ساتھ آئے تھے۔

مولانا فضل حق خیر آبادی نے جمعہ کی نماز کے بعد جامع مسجد دہلی میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوئ دیا۔ مفتی صدرالدین صدر الصدور دہلی، مولوی عبدالقادر دہلوی، قاضی فیض اللہ دہلوی، مولانا فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خاں اکبر آبادی، سید مبارک شاہ رامپوری، مولوی محمد سعید وغیرہ نے فتوے پر اپنے دستخط کیے وفتوے کو کئی کاپیوں میں لکھ کر تقسیم کا۔ اس فتوے کی نقل ہو کر پورے بھارت میں تقسیم ہونے لگی اور پھر چاروں طرف انگریزوں کے خلاف نعرے بلند ہو گئے۔

دہلی میں جنرل بخت خاں کی فوج کی حالت سب سے اچھی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کو جنرل بخت خاں پر بہت بھروسہ تھا۔ جنرل بخت خاں جب چاہتا بنا روک ٹوک بادشاہ سے مل سکتا تھا۔ جنرل بخت خاں نے ڈاکٹر وزیر خاں کو اپنے ساتھ رکھا۔ مولانا فیض احمد بدایونی، مرزا مغل (بہادر شاہ ظفر کا بیٹا) کے پیش کار مقرر ہوئے۔ مفتی انتظام اللہ شہابی نے 'ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما' میں لکھا ہے کہ ''مولوی فیض احمد بدایونی دہلی میں مجسٹریٹ بھی بنائے گئے لیکن اس کی تصدیق نہ ہو سکی۔''

جنگ کا آغاز: دہلی میں جنرل بخت خاں نے انگریزوں پر زبردست حملے کیے اور کئی جگہ ان کے چھکے چھڑا دیے۔ جنرل بخت خاں کی فوج بڑی ہوشیاری سے لڑ رہی تھی۔

ولیم فورس لکھتا ہے ''گھیرابندی کے زمانے میں باغیوں نے بڑے زبردست حملے کیے اور یہ باغیوں کی ہوشیاری کا اچھا ثبوت تھا اور اس سے ثابت ہوتا تھا کہ ہم کسی معمولی دشمن سے نہیں لڑ رہے تھے۔ ان حملوں کی تعداد 36 تھی۔ اس کے علاوہ بے شمار حملے چوکیوں پر ہوئے۔ یہ ہمارے آدمیوں کے قریب بہت کم آتے تھے۔ اچانک حملے کرتے تھے، ان کی لگاتار ہمت اور بہادری سے کوئی چیز بازی نہیں لے جا سکتی تھی۔'' (حوالہ غدر عظیم کا تذکرہ، بحوالہ 1875 کے ہیرو، سیدہ انیس فاطمہ بریلوی)

مرزا مغل ولد بہادر شاہ ظفر کا دل صاف تھا اور وہ غداروں کے کہنے سے جنرل بخت خاں سے بدظن ہو کر انگریزوں کی طرف جھکنے لگا۔ کشمیری گیٹ کا مورچہ مرزا مغل کے سپرد تھا، جس میں فوج کے ایک حصے کی کمان ڈاکٹر وزیر خاں اور دوسرے حصے کی مولانا فیض احمد بدایونی سنبھالے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں کی فوج نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا مگر

ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایونی اور فیروز شاہ بدایوں پہنچ چکے تھے۔ مجاہدین میں جوش پیدا کرنے کے لیے مولانا فیض احمد بدایونی نے فتوئے جہاد کو لکھ کر بٹوایا جس کا نتیجہ بہتر نکلا۔ تین سو تازہ دم سپاہی بریلی سے آگئے۔ حکیم سعد اللہ اور ان کے کچھ ساتھی آنولہ سے آکر شریک ہوئے تھے۔ انگریزی فوج سے سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدین کے مورچے ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایونی اور شہزادہ فیروز شاہ سنبھالے ہوئے تھے۔

کشمیری گیٹ پر مرزا مغل نے شکست کھائی۔ جنرل بخت خاں کے کہنے پر ڈاکٹر وزیر خاں اپنی فوج کو لے کر الگ ہو گئے ورنہ گرفتاری کا اندیشہ تھا۔ جنرل بخت خاں ہمایوں کے مقبرے پر پہنچ کر بہادر شاہ ظفر سے ملا اور ساری صورتِ حال بتائی۔ بادشاہ سے مقبرے سے نکلنے کو کہا مگر زینت محل (زوجہ بہادر شاہ ظفر) نے منع کر دیا۔

19 ستمبر 1857 کو شہر دہلی پر انگریز جنرل ہڈسن کی کمان میں انگریزی فوج نے پوری طرح قبضہ کر لیا۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد نے موقع کی نزاکت کو دیکھ کر دہلی چھوڑ دی۔

مولوی عبدالشاہد خاں شیروانی لکھتے ہیں ''بادشاہ جو اِس درمیان قلعہ سے نکل کر ہمایوں کے مقبرے میں پناہ لے چکے تھے۔ اپنے متعلقین کے ساتھ گرفتار کر لیے گئے۔ تین شہزادوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا اور ان کے سروں کو ایک طشتری میں رکھ کر بطور تحفہ بادشاہ کو پیش کیا گیا۔ جنرل بخت خاں اپنی فوج اور توپ خانے کو نکال کر لے گیا۔ بہادر شاہ ظفر سے کہا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں مگر وہ زینت محل اور الٰہی بخش کے کہنے سے وہاں سے نہ نکلے۔ جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ (باغی ہندوستان 1857)

معرکۂ لکھنؤ: جب فیض آباد میں مولوی سکندر شاہ اور ان کی جماعت کو ہار کا منہ دیکھنا پڑا تو مولوی سید احمد اللہ شاہ لکھنؤ روانہ ہوئے اور مولوی احمد سبط، مولوی غلام علی کی جماعت کی بڑی ہمت افزائی کی۔ جولائی 1857 میں مرزا برجیس قدر (فرزند نواب واجد علی شاہ) کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ممو خاں (ناصر الدولہ امیر علی محمد خاں) تمام حکومتی کاموں کا ذمے دار ہوا۔ حضرت محل (زوجہ نواب واجد علی شاہ) والیہ مقرر ہوئیں کیونکہ اُس وقت ان کے بیٹے برجیس قدر کی عمر دس سال کی تھی۔ رعایا مولوی امیر علی کے واقعہ ہنومان گڑھی سے بدظن تھی۔ اس پر ممو خاں کے ظلم بہت بڑھ چکے تھے۔ مولوی احمد شاہ اہالیانِ اودھ کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

دلی، آگرہ، کانپور میں انگریزوں نے قبضہ جما کر لکھنؤ کا رخ کیا۔ تمام سردار جنرل بخت خاں، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی فیض احمد بدایونی، مولوی عظیم اللہ کانپوری، نواب تفضل حسین فرخ آبادی، نانا راؤ، شہزادہ فیروز شاہ، مولوی لیاقت علی الہ آبادی، قاضی سرفراز علی شاہجہانپوری وغیرہ الگ الگ مقامات سے آکر شاہ احمد اللہ صاحب سے ملے۔ پہلا معرکہ نواب گنج میں ہوا۔ مجاہدین کامیاب ہوئے اور رسد کی کوٹھی پر قبضہ کر لیا گیا۔

معرکۂ ککرالہ: بدایوں میں نواب خان بہادر خاں کی طرف سے 17 جون 1857 کو عبدالرحمن خاں ناظم اور نیاز محمد خاں کو فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا۔ ان کی ٹکڑی نے میدانِ کارزار میں اپنے خوب جوہر دکھائے۔

ہرلال سنگھ ساکن بکسینہ ایک ٹکڑی لے کر شہر بدایوں پر چڑھ آیا۔ سرحد پر لڑائی ہوئی آخر شکست کھا کر بھاگ گیا۔ نومبر 1857 تک تمام ضلع بدایوں پر نواب خان بہادر خان کا قبضہ ہو گیا۔ ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایونی اور فیروز شاہ بدایوں پہنچ چکے تھے۔ مجاہدین میں جوش پیدا کرنے کے لیے مولانا فیض احمد بدایونی نے فتوئے جہاد کو لکھ کر بٹوایا جس کا نتیجہ بہتر نکلا۔ تین سو تازہ دم سپاہی بریلی سے آگئے۔ حکیم سعد اللہ اور ان کے کچھ ساتھی آنولہ سے آکر شریک ہوئے تھے۔ انگریزی فوج سے سخت مقابلہ ہوا۔ مجاہدین کے مورچے ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایونی اور شہزادہ فیروز شاہ سنبھالے ہوئے تھے۔

ککرالہ کے معرکہ کے بعد شہزادہ فیروز شاہ، مولانا فیض احمد بدایونی اور ڈاکٹر وزیر خاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ بریلی پہنچے۔ شہزادہ فیروز شاہ، نواب خان بہادر خان کے پاس رہ گیا اور مولانا فیض احمد بدایونی و ڈاکٹر وزیر خاں شاہ احمد اللہ کے پاس شاہجہاں پور چلے گئے۔

واقعات شاہجہانپور: شاہجہانپور میں نواب خان بہادر خان کی طرف سے نواب غلام قادر خاں ناظم مقرر ہوئے تھے، ایک سال انتظام کیا، مراد آباد و بدایوں سے انگریز کامیاب ہو کر شاہ جہاں پور پہنچے۔ ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا فیض احمد بدایونی، جنرل بخت خاں اور ان کے علاوہ دوسرے سردار پھر شاہ احمد اللہ کے پاس پہنچ چکے تھے۔ 28 اپریل 1858 کو بچپوریاں کے مقام پر انگریزی فوج سے مقابلہ ہوا۔ کمانڈر فوج نواب نظام علی خاں ساکن شہباز نگر تھے۔

قصبہ محمدی میں قیام حکومت: قصبہ محمدی

پر شاہ احمد اللہ نے قبضہ کرلیا۔ چاروں طرف ان کی حکومت ہوگئی۔ وزیر دفاع جنرل بخت خاں، قاضی سرفراز علی اور نانا راؤ پیشوا دیوان مقرر ہوئے اور اراکینِ کونسل میں مولوی لیاقت علی الہ آبادی، ڈاکٹر وزیر خاں اور مولانا فیض احمد بدایونی تھے۔ شہزادہ فیروز شاہ نے پہلے مخالفت کی پھر وہ بھی شامل ہوگئے۔ وہاں شاہ صاحب کا خطبہ وسکہ جاری ہوا۔

مولانا کی روپوشی: احمد اللہ صاحب کی شہادت کے بعد مجاہدین منتشر ہوگئے۔ کانپور، فرخ آباد، مراد آباد، بدایوں، بریلی، شاہ جہانپور وغیرہ پر مکمل طور سے انگریزوں کا قبضہ ہوگیا۔ جنرل بخت خاں، شہزادہ فیروز شاہ، شاہ احمد اللہ کی وفات کے بعد سندیلہ پہنچا۔ کئی جگہ انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔ آخر میں چار سو سوار رجیمنٹ 12 مع ظریف خاں رسالدار اور ڈاکٹر وزیر خاں کے ساتھ باڑی روانہ ہوئے، پھر باڑی سے واپس ہوکر بلہور گھاٹ (کانپور) پر دریائے گنگا کو پار کیا۔ شہزادہ نے ملاحوں کو دوسو روپے انعام میں دیے۔ پھر مکن پور حضرت بدیع الزماں کے مزار پر پہنچے اور وہاں سے اٹاوہ ہوکر شیر پور کے گھاٹ پر جمنا کو پار کیا۔ وہاں سے لڑتے لڑتے جے پور، بیکانیر ہوتے ہوئے پہاڑوں میں داخل ہوئے اور پھر وہاں سے ایران پہنچے اور ایران سے عرب پہنچ گئے۔

شہزادہ فیروز شاہ اور ڈاکٹر وزیر خاں عرب پہنچے مگر مولانا فیض احمد بدایونی کا پتہ نہیں چلا کہ راستے میں ہی ہمیشہ کے لیے ساتھیوں سے بچھڑ گئے یا پھر کہیں اور کا راستہ اختیار کیا۔ آپ کے ماموں مولانا فضل رسول بدایونی نے آپ کو بہت تلاش کیا اور اس سلسلے میں کئی مسلم ممالک تشریف لے گئے۔ قسطنطنیہ (ترکی) تک پہنچے مگر آپ کا کہیں سراغ نہ ملا۔

مولانا کی تصنیف: مولانا فیض احمد بدایونی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ جہاں وہ ایک بڑے عالم، شاعر، صوفی، مجاہد تھے وہیں قلم کے بھی شہسوار تھے۔ آپ نے کئی کتابیں عربی میں لکھیں جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

(1) حاشیہ سُدرہ (2) تعلیقات علی فصوص الفارابی (3) تعلیم الجاہل (4) ہدیۂ قادریہ

اولاد: مولانا فیض احمد بدایونی کی شادی ان کے ماموں فضل رسول قادری (علیہ الرحمہ) کے چچا مولانا محمد شفیع عثمانی کی بیٹی سے ہوئی تھی، جن سے صرف ایک صاحبزادہ مولانا حکیم سراج الحق تھے جو 20 رمضان 1246 کو پیدا ہوئے۔ مولانا حکیم سراج الحق کی شادی فضل رسول بدایونی علیہ الرحمہ کی صاحبزادی سے ہوئی۔ حکیم سراج الحق کا انتقال 76 برس کی عمر میں 28 ذیقعدہ 1323ھ کو دانا پور میں ہوا۔

آپ صاحب تصنیف تھے اور آپ کی لکھی ہوئی کتاب 'شرح رسائل مامیاتِ بہاء الدین عالمی' شائع ہوئی۔

مولانا فیض احمد بدایونی کی شاعری:

آپ کو شعر وادب سے بہت دلچسپی تھی۔ خود شعر کہتے تھے اور تخلص رسوا تھا۔ اردو کے علاوہ عربی، فارسی میں بھی شاعری کی۔ یہاں نمونہ کے طور پر ان کا اردو کلام پیش ہے:

نہ طوطی شکرستاں ہوں میں نہ بلبلِ زار
نہ شمعِ بزم ہوں میں اور نہ مرغ آتش خوار
ہوں بال بال پریشان وبال جان ہے زیست
نہیں ہوں میں کسی کافر کا طرۂ طرار
کیا بتوں کے تلون نے جی پہ عرصہ تنگ
ثبات بات کو ان کے نہ میرے جی کو قرار
غلط ہے گر کوئی مریخ کو کہے جلاد
کہ میرے حق میں تو زہرہ بھی ہوگئی خونخوار
ہوں غم نصیب یہاں تک کہ اب کے سال ہوا
ہلال عید میرے حق میں مغربی تلوار
جو بھاگوں میں جگر خستہ تو کدھر بھاگوں
کہ سنگِ حادثہ کی ہر طرف سے ہے بوچھار
امیدِ بہتری اب تک خیال باطل ہے
کہ سب کا اِس فلک بے مدار پر ہے مدار
ہزار معنی باریک دل میں رکھتا ہوں
ہزار نالۂ موزوں کا لب پہ ہے مضمار
مگر میں کیا کروں دم مارنے کا حکم نہیں
کیا ہے ضبط غمِ عشق نے مجھے لاچار
یہ چرخ فتنہ دکھاتا ہے سبز باغ مجھے
جو بہرِ زخم ہو درکار مرہم زنگار
بہت ہیں اور بھی دنیامیں عاشقی پیشہ
مجھ ہی سے برسرگیں ہے یہ چرخ ناہنجار
ہجومِ رنج والم سے یہ حال ہے دل کا
کہ جیسے قبرِ منافق کی ہو تیرہ و تار
دکھاؤں یاروں کو دل میں جو شورشیں ہیں بھری
مگر جہاں میں نہیں جائے یک تپیدن دار
غلط ہے سنگ دلوں سے اُمید دلِ گرمی
اگرچہ سنگ سے دیکھے گئے نکلتے شرار

☆

سو آج دستِ فلک سے ہوں اس قدر بے چین
کہ ایک پاؤں پہ پھرتا ہو صورتِ پرکار
وہ کون ہے کہ جگہ میری اُس کے دل میں ہے
وہ کون شخص ہے جس کو نہیں ہے مجھ سے عار
حرم سے مجھ کو مسلمان منع کرتے ہیں
تو دیر جانے نہیں دیتے ہیں کفار
زمین پاؤں کے نیچے سے نکل جاتی ہے
نہیں ہے میری دعا کو بھی آسمان پر بار

(مولانا فیض احمد فیض۔ از ایوب قادری، 1857 اور بدایوں۔از ڈاکٹر شاداب ذکی بدایونی)

مرزا مغل ولد بہادر شاہ ظفر کا دل صاف تھا اور وہ غداروں کے کہنے سے جنرل بخت خاں سے بدظن ہوکر انگریزوں کی طرف جھکنے لگا۔ کشمیری گیٹ کا مورچہ مرزا مغل کے سپرد تھا، جس میں فوج کے ایک حصے کی کمان ڈاکٹر وزیر خاں اور دوسرے حصے کی مولانا فیض احمد بدایونی سنبھالے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر وزیر خاں کی فوج نے بڑی بہادری کا ثبوت دیا مگر کشمیری گیٹ پر مرزا مغل نے شکست کھائی۔

Mohd Tanveer Khan Qadri
Mohalla Nai Sarai, Nai Basti, Near Mazar Punj Peer Badayun (UP)

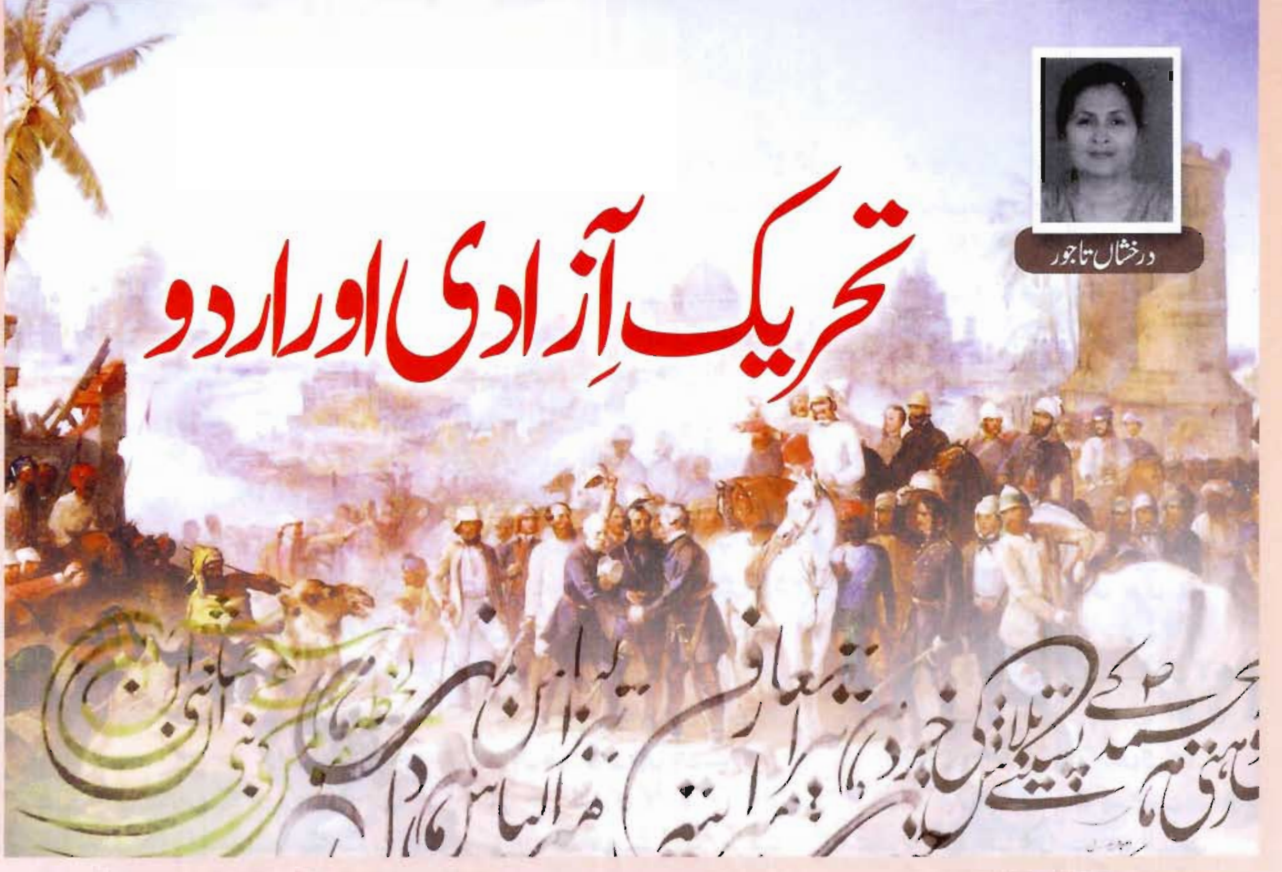

تحریکِ آزادی اور اردو

درخشاں تاجور

اردو زبان وادب کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور کا یہ بیان حیاتِ جاوداں کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

''اردو ادب کا لہلہاتا ہوا باغ تنہا ایک باغبان کی محنت کا ثمرہ نہیں۔ اس کی آبیاری مختلف جماعتوں، مذاہب اور ممالک نے مل کر کی ہے اس کی تعمیر میں بہتوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا ہے۔ فقیروں اور درویشوں نے اس پر برکت کا ہاتھ رکھا ہے۔ بادشاہوں نے اسے منھ لگایا ہے۔ سپاہیوں نے زبانِ تیغ اور تیغِ زبان دونوں کے جوہر دکھائے ہیں پھر بھی یہ جمہور کی زبان اور جمہور کا ادب ہے۔''[1]

ان کا یہ مقولہ جس وقت میں نے پڑھا تھا وہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اس وقت نہ تو مجھے جمہوریت کا مطلب معلوم تھا اور نہ ہی میں اردو زبان وادب کی تاریخ سے پوری طرح واقف تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جیسے جیسے اس زبان سے میری رغبت بڑھی مجھے پروفیسر آل احمد سرور کے اس بیان کی معنویت کا احساس بھی ہوا اور اردو زبان کی اہمیت اور قدر و قیمت بھی معلوم ہوئی۔

یہ وہ زبان ہے جو ہمیں تہذیب یافتہ بناتی ہے اور شائستگی کا ہنر بھی سکھاتی ہے۔ فراق گورکھپوری جو اس زبان کے عاشقوں میں تھے اکثر اپنے طلبا سے کہا کرتے تھے کہ ''اردو اس لیے بھی پڑھو کہ افسر بننے کے بعد افسر دکھائی دو۔''[2] اردو کا اپنا ایک شاندار ماضی بھی ہے۔ یہی وہ زبان ہے جس نے جنگ آزادی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ تحریک آزادی کے ساتھ اردو قدم سے قدم ملا کر چلی ہے۔ آزادی کے متوالوں کو 'انقلاب زندہ باد' کا ولولہ انگیز نعرہ اسی زبان نے دیا تھا۔ اس کے شاعروں نے ملک کے سیاسی افق پر ابھرنے والی ہر تحریک کی موافقت میں نظمیں کہہ کر اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اپنا تعاون دیا ہے:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے[3]

بسمل عظیم آبادی

یا

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے[4]

محمد علی جوہر

جیسے اشعار سے سرفروشان وطن کے حوصلوں کو توانائی اسی زبان نے بخشی ہے۔ عباس بیگ عباس بریلوی اسی زبان کے شاعر تھے جن کے شعر:

اختر جھپک گئے ترے خالوں کے سامنے
گوروں کے پاؤں اٹھ گئے کالوں کے سامنے

کو انگریزوں نے بغاوت پر محمول کیا تھا اور انھیں پھانسی دے دی تھی۔[5]

بدرالاسلام بدایونی مشہور بھی اسی زبان کے شاعر تھے جنھیں ایک نظم کہنے پر سزائے موت دی گئی جس کا ایک مصرعہ تھا:

سر کمپنی کا کٹ کے بکا پاؤ آنے میں

مشہور کو انگریزوں نے گولی مار کر شہید کیا تھا۔[6] اسی زبان کے صحافی مولوی محمد باقر بھی تھے جنھیں 1857 کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف خبریں شائع کرنے کے جرم میں جامِ شہادت نوش کرنا پڑا تھا اور اپنی ساری جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑا تھا۔[7] بہادری پریس قائم کرنے والے سید قطب شاہ بریلوی بھی اسی زبان کے صحافی تھے جن کے پریس سے ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کو فروغ دینے کے لیے بڑی تعداد میں لٹریچر شائع ہوا تھا۔ انگریزوں نے ان کی بھی ساری جائیداد ضبط کر لی تھی اور انھیں بعبور دریائے شور (کالے پانی) کی سزا دے دی تھی۔[8] یہ تو فقط چند ادبا و شعرا تھے جنھوں نے ہندوستانیوں کے ذہن و دل میں انگریزوں کے خلاف نفرت و عداوت کی چنگاریاں بھڑکا کر انھیں غیر ملکی غاصبوں کے خلاف سینہ سپر کرنے میں نہ صرف اپنا تعاون دیا بلکہ اپنا تن من دھن سب کچھ اس ملک پر خندہ پیشانی سے نچھاور کر دیا۔ انگریز اردو کے ان قلم کاروں سے جو ملک میں ان کے خلاف بے اطمینانی کے جذبات بھڑکا رہے تھے، حد درجہ خائف تھے اور سراسیمگی کی حالت میں انھوں نے اس زبان کا بہت سا شعری و ادبی سرمایہ ضبط بھی کیا جن میں سے کچھ تو شائع ہوا لیکن آج بھی بہت سا مواد نیشنل اور اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ ہے اور جو ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو کے شاندار اور مثالی کردار کی گواہی دے رہا ہے۔

اگر ہم یہ کہیں تو غلط نہ ہوگا کہ ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنے میں اس ملک کی دیگر زبانوں کے مقابلے میں اردو نے زیادہ بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ یہ زبان ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی امین بھی ہے۔ سیکولرزم اس زبان کے خمیر میں

فراق گورکھپوری جو اس زبان کے عاشقوں میں تھے اکثر اپنے طلبا سے کہا کرتے تھے کہ"اردو اس لیے بھی پڑھو کہ افسر بننے کے بعد افسر دکھائی دو۔"

ہے۔ یہ زبان صوفیوں اور درویشوں کی گود میں کھیلی ہے خانقاہوں میں اس نے پرورش پائی ہے لہٰذا مذہبی رواداری اس کی روح میں اتری ہوئی ہے۔ اردو کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ بیان ایک ایسی سچائی ہے جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا کہ:

"اردو ہندوستان کے تہذیبی کڑھاؤ میں تاریخ کی آنچ میں پکے ہوئے لاتعداد عناصر سے تیار کیمیا ہے جسے ہم چاہیں بھی تو نظر انداز نہیں کرسکتے۔ تلسی کی رام چرت مانس ہو یا سکھ مذہب کا گروگرنتھ صاحب یا شاہ عبدالقادر کا قرآن حکیم کا ترجمہ۔ ان میں زبان کا جو خمیر اٹھ رہا ہے اس سے اردو بڑھی اور پنپی ہے۔"9

اس زبان نے ہر دور میں ہندوستانیوں کے دلوں میں محبت کے دیپ اور اتحاد و یکجہتی کی قندیلیں جلانے کا مقدس فریضہ بھی بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ غلام ہندوستان رہا ہو یا آزاد ہندوستان اس زبان نے ہمیشہ اقبال کے لفظوں میں اہلِ وطن کو یہی پیغام دیا ہے کہ:

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زبان
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے 10

اس کے شعرا و ادبا نے تو جوش کے لفظوں میں بارگاہِ خداوندی میں یہی دعا مانگی ہے کہ:

دل ملتے ہیں جس سے معبود وہ مے ٹپکا
پیمانۂ ہندو میں مینائے مسلماں میں 11

نہیں پالا پڑا قاتل تجھے ہم سخت جانوں سے
ذرا ہم بھی تو دیکھیں تیری جلادی کہاں تک ہے
محمد علی جوہر

ہندو مسلم اتحاد و یگانگت کے جذبات کو توانائی بخشنے کے لیے اردو میں دیے گئے سر سید احمد خاں کے اس بیان کا کیا کوئی مول ہے جس میں انھوں نے اہلِ وطن کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا:

"اے میرے دوستوں میں نے بارہا کہا ہے اور پھر کہتا ہوں کہ ہندوستان ایک دولہن کی مانند ہے جس کی خوبصورت اور رسیلی دو آنکھیں ہندو مسلمان ہیں اگر وہ دونوں آپس میں نفاق رکھیں گے تو وہ پیاری دولہن بھینگی ہوجاوے گی اور ایک دوسرے کو برباد کردیں گے تو وہ کانڑی بن جاوے گی... اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اس دلہن کو بھینگا بناؤ یا کانڑا۔"12

لیکن افسوس کا مقام ہے کہ ہماری مشترکہ تہذیب کی علامت اس زبان کو کبھی ملک کو توڑنے والی زبان کہہ کر اس کی تضحیک کی جاتی ہے تو کبھی اسے صرف مسلمانوں سے جوڑ کر اس کی توہین کی جاتی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے مختلف مذاہب کے ماننے والوں نے اسے اپنا کر اسے سیکولر سانچے میں ڈھالنے میں معاونت کی ہے۔ فراخ حوصلگی اس زبان کی پہچان ہے تو دوسرے مذاہب کے عقائد کا احترام اس کا سرمایہ افتخار۔ مذہبی رواداری کی جو مثالیں اس زبان نے پیش کی ہیں اس کی نظیر شاید ہی دنیا کی کوئی دوسری زبان پیش کرسکے۔ اس کے ہندو شعرا نے اگر عید، محرم، پیغمبران اسلام اور شہیدان کربلا پر عقیدت مندانہ نظمیں کہی ہیں تو اس کے مسلم شعرا نے ہولی، دیوالی، مذہبی کتابوں اور دیوی دیوتاؤں پر نظمیں کہہ کر اپنی وسیع المشربی کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس کے گیسوئے سخن کو سنوارنے میں جتنا حصہ مسلمانوں نے لیا ہے اس کے کہیں زیادہ حصہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے لیا ہے۔ رام نرائن موزوں، دیا شنکر نسیم، رتن ناتھ سرشار، درگا سہائے سرور جہان آبادی، برج نرائن چکبست، تلوک چند محروم، پنڈت دتاتریہ کیفی، بالمکند عرش ملسیانی، لبھو رام جوش ملسیانی، آنند نرائن ملا، فراق گورکھپوری، منشی پریم چند، فکر تونسوی، جگن ناتھ آزاد، نریش کمار شاد، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، رام لال، بلونت سنگھ، مالک رام، مہیندر سنگھ بیدی سحر، پروفیسر گوپی چند نارنگ جیسی قدر آور شخصیات نے اردو زبان و ادب کے لیے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ اس زبان کی تاریخ کا روشن باب ہے جسے اردو زبان کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

یہ اس زبان کی خوش نصیبی ہے کہ اسے صرف ایک طبقے سے جوڑنے کی سازش کے خلاف غیر مسلم ادبا و شعرا نے زبردست احتجاج کیا۔ آنند نرائن ملا نے اپنے کرب کو اپنے ایک شعر میں ان الفاظ میں ڈھالا:

لب مادر نے ملا لوریاں جس میں سنائی تھیں
وہ دن آیا ہے اب اس کو بھی غیروں کی زبان سمجھو 13

پروفیسر کنھیا لال کپور نے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان کہنے والوں کی مذمت کچھ اس انداز میں کی:

"...ایک وہ زمانہ تھا کہ اردو کو سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا۔ پھر نہ جانے کس کی نظر کھا گئی کہ اس سے دامن بچا کر نکل جانے میں ہی خیریت سمجھی جانے لگی۔ ان دنوں اربابِ وطن اس سے یوں بدکتے ہیں جیسے یہ کوئی خطرناک چیز ہو۔ ہندوستان میں اردو کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ اردو کے دشمنوں اور نادان دوستوں نے اسے مسلمانوں کی زبان بنا دیا۔ یہ خوبصورت زبان ہندوستانی اور اسلامی تہذیب کے امتزاج سے وجود میں آئی۔ یہ مشترکہ تہذیب کی نشانی تھی اس کی سرپرستی ہر مذہب کے لوگوں نے کی۔ مگر آزادی کے بعد یہ فرقہ پرستی کی بھینٹ چڑھ گئی۔"14

ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی یہ تسلیم کیا کہ عظیم سرمایے کی حامل یہ زبان سازشوں کا شکار ہوئی جس وجہ سے اسے زبردست نقصان پہنچا۔ اس کی تلافی کی جانی چاہیے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

"میں یہ بات واضح طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ ہندی کے پر جوش حامیوں کی ان کوششوں سے مجھے گہرا دکھ ہے کہ وہ اردو کو نکال کر باہر کرنا چاہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے پاس عظیم سرمایہ ہے جس کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی ضروری ہے لہٰذا اس زبان کی پرورش کرنی چاہیے۔"15

مخالفتوں کا سامنا کرنے کے باوجود 1950 میں آئین ساز اسمبلی میں اردو ملک کی دوسری، علاقائی زبانوں کے ساتھ

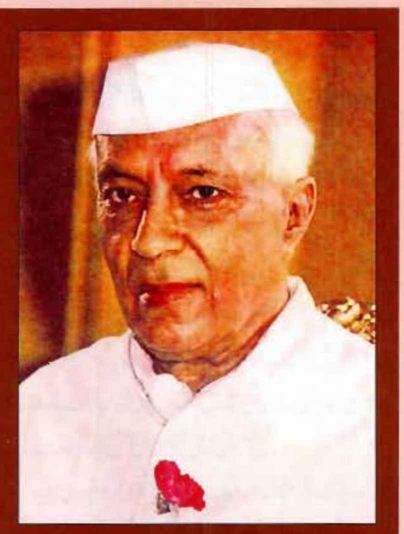

''میرا خیال ہے کہ اردو کے پاس عظیم سرمایہ ہے جس کی حوصلہ افزائی اور ہمت افزائی ضروری ہے لہٰذا اس زبان کی پرورش کرنی چاہیے۔''
جواہر لال نہرو

آٹھویں شیڈول میں شامل کرلی گئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جس وقت آٹھویں شیڈول میں شامل زبان کی فہرست آئین ساز اسمبلی میں پیش کی تو ہندی کے کٹر حامی سیٹھ گووند داس کے اس سوال پر کہ ''بھلا اردو کسی کی مادری زبان ہوسکتی ہے'' انھوں نے یہ کرارا جواب دیا کہ یہ میری مادری زبان ہے یہ میری ماں اور دادی کی زبان ہے اور اسے میں بچپن سے بولتا آرہا ہوں۔[16]

گلوبلائزیشن کے دور میں جب زبانیں مٹ رہی ہیں کم ازکم اردو کے مٹنے کے آثار نہیں ہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہونے والی اس زبان کا پودا جسے ہندوستانیوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر ایک تناور درخت بنایا ہے اس کی جڑیں ہندوستان کے طول وعرض سے نکل کر پوری دنیا میں پھیل چکی ہیں۔ اس کے چاہنے والے سرحدوں کو بھول کر اس کی آبیاری کررہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نامساعد حالات کا سامنا کرنے کے باوجود یہ زبان آج بھی زندہ ہے۔ ہندوستان میں بھی صورتِ حال قدرے بہتر ہوئی ہے۔ یہ زبان ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے اس کے بارے میں غلط فہمیوں کے بادل بڑی حد تک چھٹ چکے ہیں۔ 14 فروری 2004 کو قومی اردو کونسل کے سنگ بنیاد کی تقریب میں مرلی منوہر جوشی کے اس بیان کی پذیرائی اردو داں حلقے میں خوب ہوئی جس میں انھوں نے کہا تھا کہ:

''اردو مسلمانوں کی نہیں ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو زبان تمام مذاہب کے ماننے والوں اور سبھی فرقوں کی زبان ہے۔ کوئی بھی زبان کسی خاص مذہبی فرقے کی نہیں ہوسکتی۔ اردو زبان ہندوستانی تہذیب اور اس کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔''[17]

ان کا یہ بیان اردو کے خوش آئند مستقبل کی طرف ایک اشارہ تھا اور یقینا قومی اردو کونسل نے اردو کے فروغ کے لیے مثبت اقدامات کیے ہیں۔ اردو کو کمپیوٹر سے جوڑ کر ملک کے مختلف علاقوں میں کمپیوٹر سنٹر کا قیام اور اردو سکھانے کے لیے کونسل نے جو کوششیں کی ہیں وہ قابلِ ستائش ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی انجمنیں، ادارے اور تنظیمیں ہیں جو اردو زبان کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ مختلف ریاستوں کی اردو اکادمیوں میں بھی اردو کے فروغ کا کام ہورہا ہے۔ ادبا اور شعرا کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے۔ سیمینار اور مشاعروں کا انعقاد کرکے لوگوں کو اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کا احساس کرایا جارہا ہے لیکن اردو کا جو سب سے ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے جس پر توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ ابتدائی درجات میں اس زبان کی تعلیم کا نظم نہ ہونے کی وجہ سے ایک پوری نسل اردو رسم الخط کی شناخت سے محروم ہوچکی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سلسلے میں بھی کارگر اقدامات کیے جائیں کیونکہ یہ زبان بقائے باہم کے اصول پر مبنی دیرپا امن کی بنیاد پر استوار ہندوستانی معاشرے کے قیام میں بڑا ہی اہم رول ادا کرسکتی ہے۔ یہ زبان ہندوستان میں مقبول ہے۔ وہ لوگ جو اس کے رسم الخط سے ناآشنا ہیں وہ بھی اس زبان کی شیرینی اور حلاوت سے متاثر ہیں۔ آج مجروح سلطان پوری، گلزار اور جاوید اختر کے سروں پر نغموں کے شہنشاہ ہونے کا تاج صرف اسی وجہ سے سجا ہے کہ انھوں نے اردو الفاظ کے سحر سے لوگوں کو مسحور کیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا میں بھی یہ زبان چھائی ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور فلموں میں اس زبان کے الفاظ کا استعمال اس کی مقبولیت کی گواہ ہے لہٰذا اس امر پر بھی اردو داں طبقے کو غور کرنا ہوگا اور کوئی ایسا راستہ نکالنا ہوگا جس سے اس زبان کے رسم الخط سے بھی زیادہ سے زیادہ لوگ آشنا ہوسکیں تاکہ اس کا رشتہ جمہور سے جڑ سکے اور زبان کو اپنے مولد و مسکن ہندوستان میں اس کا جائزہ حق مل سکے اور صحیح معنوں میں زبان جمہور کی زبان کہلانے کی حقدار بن سکے۔

حواشی

(1) بحوالہ 'اردو زبان وقواعد' (حصہ دوم): شفیع احمد صدیقی، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، 2008، ص 1
(2) بحوالہ ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، اگست 2004، ص 5
(3) بحوالہ سہ ماہی 'روشن' بدایوں جلد 9، شمارہ 2-1، 1986، ص 7
(4) بحوالہ ماہنامہ 'نیا دور' لکھنؤ، 'محمد علی جوہر نمبر' فروری تا اپریل 2005، ص 101

''اردو مسلمانوں کی نہیں ہندوستان کی زبان ہے۔ اردو زبان تمام مذاہب کے ماننے والوں اور سبھی فرقوں کی زبان ہے۔ کوئی بھی زبان کسی خاص مذہبی فرقے کی نہیں ہوسکتی۔ اردو زبان ہندوستانی تہذیب اور اس کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔''
مرلی منوہر جوشی

(5) '1857 کے مجاہد شعرا': مولانا امداد صابری، مکتبہ شاہراہ دہلی، اکتوبر 1959، ص 304
(6) '1857 کے مجاہد شعرا': مولانا امداد صابری، ص 337
(7) 'تحریک آزادی میں اردو کا حصہ': ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمن ترقی اردو، کراچی، 1976، ص 280
(8) 'جنگ آزادی 1857 (واقعات وشخصیات)': ایوب قادری، پاک اکادمی کراچی، 1976، ص 81-580
(9) بحوالہ ماہنامہ 'کتاب نما' نئی دہلی، اگست 2008، ص 43
(10) 'بانگِ درا': علامہ اقبال، حمیدیہ کتب خانہ، دہلی جولائی 1972، ص 52
(11) 'شعلہ وشبنم': جوش ملیح آبادی، ہمالیہ بک ہاؤس، ص 72
(12) 'مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچیز' مرتبہ: مولانا محمد امام الدین گجراتی، مطبوعہ مصطفائی پریس لاہور، 1900، ص 175
(13) 'اردو شاعری کے نیم وا دریچے': وارث کرمانی، رام پور رضا لائبریری، رام پور، 2005، ص 11
(14) بحوالہ ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، اگست 2004، ص 16
(15) بحوالہ سہ ماہی 'فکر و تحقیق' نئی دہلی، اپریل تا جون، 2000، ص 151
(16) بحوالہ ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، اگست 2004، ص 17-16
(17) بحوالہ ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی، اپریل 2004، ص 7

■

Darakhshan Tajwar, C/o, Imteyaz Ahmad Abbasi, Kaainaat B-34, Tewari Pur Awas, Vikas Colony, Gorakhpur - 273001 (UP)

ابراراحمد اجراوی

اردو زبان کے فروغ میں ریشمی رومال تحریک کا کردار

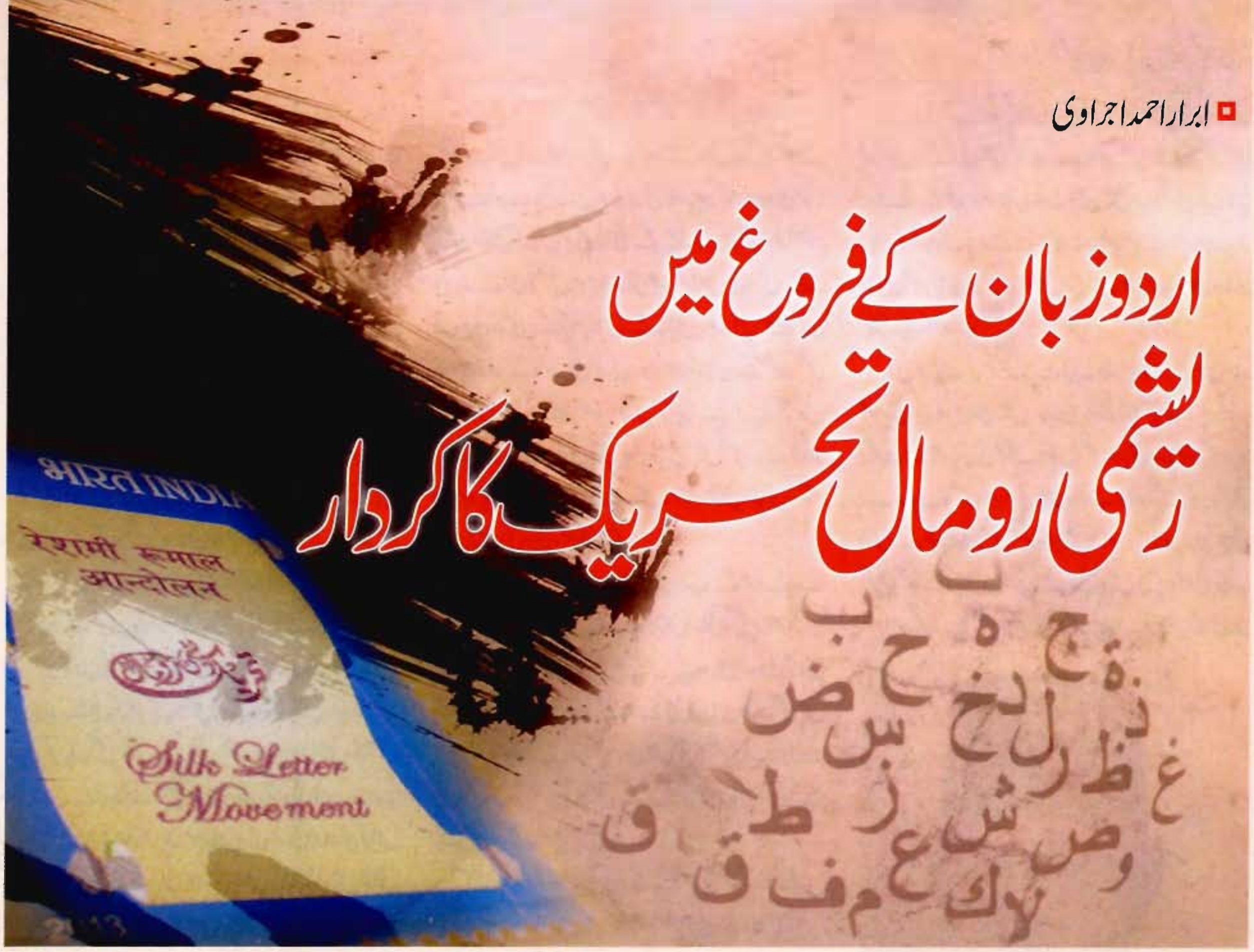

تحریک ریشمی رومال بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عالمی منظرنامے پر ابھرنے والی ایسی منظم سیاسی تحریک تھی جس نے اگر کامیابی کا جامہ زیب تن کرلیا ہوتا تو ہندستان کو برطانوی سامراج کے چنگل سے آزادی حاصل کرنے میں 15 اگست 1947 تک کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ افسوس کہ یہ تحریک مواصلت، ذرائع کار اور ارتباط باہمی کے فقدان کے سبب منزل مقصود تک رسائی سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔ غیر منقسم ہندستان سمیت دوسرے اسلامی اور عربی خطے کی آزادی کا خواب بہ جلد شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ اس عظیم تحریک کے خاکہ ساز اور روح رواں دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز سپوت اور عظیم مجاہد آزادی شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی (1851-1920) تھے۔ انھوں نے اپنے جاں نثار کے ساتھ انگریز مخالف گروپ ترکی اور جرمنی کی مدد سے انگریزوں کے خلاف عالمی پیمانے پر متحدہ یلغار اور دوطرفہ حملے کی جو عظیم منصوبہ بندی کی تھی، اس کے اثرات سیاست و سماج کے ساتھ دوسرے انسانی شعبوں پر بھی مرتب ہوئے۔ یہ تحریک صرف ایک سیاسی تحریک نہ تھی، بلکہ اس کی تہوں میں سماج وسیاست کے ساتھ، تاریخ وثقافت کے مفید پہلو بھی محوری حیثیت رکھتے تھے۔ اس تحریک کا نہ دائرہ کار محدود تھا اور نہ ہی اس کے بنیادی اغراض ومقاصد 'لکیر کے فقیر' کا مصداق تھے۔ اگر یہ تحریک صرف ایک محدود وقت، معمولی فوائد اور متعین خطے کے لیے تشکیل دی گئی ہوتی، تو اس کے کارکنوں کو افغانستان، چین، فرانس، امریکہ، جاپان اور ترکی وحجاز روانہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ نہ ہی اس میں بلاتفریق مذہب وملت ہند وبیرون ہند کی دوسری انسانی اکائیوں کو دعوت شمولیت دینے اور انھیں اپنا ہم خیال بنانے کی ضرورت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تحریک سیاسی بھی تھی اور سماجی بھی، اس کی رگوں میں تہذیب وثقافت کے تحفظ وبقا کا خون بھی گردش کررہا تھا اور تاریخ وجغرافیہ اور دوسرے علوم وفنون کی وسیع تر ترقی کا فارمولا بھی اس کے پیش نظر تھا۔ اس تحریک نے جہاں معلوم ذرائع کے مطابق انگریزوں کے لیے ہندستان اور ایشیا وافریقہ کے دوسرے خطوں میں تادیر جمے رہنے کی پالیسیوں پر کاری ضرب لگائی تھی، وہیں اس نے اردو زبان کو بھی ایشیا اور برصغیر سے باہر قدم جمانے اور پھلنے پھولنے کا وسیع موقع فراہم کیا تھا۔ ایشیا اور ہندستان سے باہر اردو زبان کے فروغ میں اس تحریک کے کارہائے نمایاں سے انکار کرنا تاریخ کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔

اس تحریک نے جہاں معلوم ذرائع کے مطابق انگریزوں کے لیے ہندستان اور ایشیا و افریقہ کے دوسرے خطوں میں تادیر جمے رہنے کی پالیسیوں پر کاری ضرب لگائی تھی، وہیں اس نے اردو زبان کو بھی ایشیا اور بر صغیر سے باہر قدم جمانے اور پھلنے پھولنے کا وسیع موقع فراہم کیا تھا۔

اگر یہ کہا جائے کہ تحریک ریشمی رومال نے ہی اس نومولود اردو زبان کو پہلی بار ہندستان سے باہر کی وسیع اور خوش گوار فضاؤں میں سیر کرانے کی تدبیر کی تھی تو بہت سے اردو ادب کے اجارہ دار اور سکہ بند نظریاتی گروہ سے وابستہ افراد اس پر چیں بہ جبیں ہوں گے، نہ صرف مجھ پر لعنت اور تبرا بھیجیں گے، بلکہ میری مولویانہ شناخت کی آڑ میں میرے سر پر مدارس پرستی اور علما پروری کے الزام کا ٹھیکرا پھوڑنے میں بھی دریغ سے کام نہیں لیں گے۔ آج اردو امریکہ، یورپ، افریقہ، چین جاپان اور دوسرے ممالک میں تیزی سے ادبی منظرنامے پر اپنی شناخت قائم کررہی ہے اور اپنی فطری چاشنی، قوت انجذاب، بقائے باہم کی خو اور اشتراک واتحاد کی روایت کے سبب صحراؤں میں بھی پھل پھول رہی ہے تو اس کا سہرا بھی تحریک ریشمی رومال اور اس سے وابستہ افراد کے سر باندھا جانا چاہیے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جب کہ اردو

ہندستان میں لنگوا فرنکا کی حیثیت سے دربار اور شاہی محلات سے لے کر چوک اور چوپال تک عوامی رابطہ کی زبان کے منصب پر فائز تھی اور ہر خاص و عام کی پسندیدہ اور اظہار خیال کی چیدہ زبان تھی، کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ رہی ہوگی کہ اردو اتنی جلدی سے اپنے قدم ایشیا اور برصغیر سے باہر پھیلانا شروع کردے گی۔ لیکن تحریک ریشمی رومال کے ممبران نے اردو کے متوالوں کے اس خواب کو بھی شرمندہ تعبیر کر دکھایا۔ اس تحریک کے روح رواں شیخ الہند مولانا محمود حسن نے اپنی دوررس نظروں سے یہ بھانپ لیا تھا کہ ایشیا سے باہر اجنبی خطے میں بھی اگر کوئی زبان عوام کو ایک ڈور میں باندھ سکتی ہے اور انگریزوں کے خلاف ایک متحدہ اور مستحکم پلیٹ فارم تشکیل دے سکتی ہے تو وہ صرف اردو زبان ہے۔

جن لوگوں کی تاریخ آزادی ہند پر نظر ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ تحریک ریشمی رومال مقامی نہیں، ایک عالمی سیاسی تحریک تھی جس کے پیش نظر پوری دنیا میں قابض انگریزوں کے جبر و تسلط کو چیلنج کرنا ہی نہیں تھا، بلکہ ان سے دو بہ دو ہاتھ کر کے ایشیا اور افریقہ سمیت پوری انسانی برادری کو اس کے جبر و استحصال سے رہائی دلانا بھی اس کے منشور میں شامل تھا، چناں چہ اس تحریک کے منصوبہ سازوں نے سیاسی سمجھ بوجھ رکھنے والے اس وقت کے نمایاں افراد کو اس تحریک کے پرچم تلے اکٹھا کیا، کئی وفود ترتیب دیے گئے اور انھیں مختلف ممالک میں بھیجا گیا تاکہ وہ وہاں کے عوامی طبقے کے ساتھ وہاں کے حکمراں طبقے کو بھی اس تحریک کے وسیع تر اہداف و اغراض سے روشناس کرا کر انھیں انگریزوں کے خلاف اپنا ہم نوا بنا سکیں، چوں کہ ابتدائی دنوں میں اس تحریک سے وابستہ اکثر افراد کا تعلق ہندستان اور برصغیر سے تھا اس لیے اردو کہنا چاہیے کہ ان کی مادری زبان کے درجے میں تھی۔ اس لیے اس تحریک سے وابستہ جو شخص بھی دوسرے ملکوں میں گیا، اس نے اردو زبان کو ہی اظہار خیال کے لیے منتخب کیا اور اسی میں وہاں کے عوام و خواص کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کی۔

پڑوسی ملک افغانستان روانہ ہونے والے وفد کے رکن رکین مولانا عبید اللہ سندھی تھے، انھوں نے اپنے گھر کے زیورات بیچ کر افغانستان کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے اس عالمی تحریک کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے افغانستان کے قبائلی پٹھانوں کے ساتھ مل کر کام کیا اور اس تحریک کے دائرہ کار کو وسعت دی۔ انھوں نے افغانی قبائل کے مشترکہ تعاون سے 1915 میں نہ صرف ایک عبوری حکومت تشکیل دی، جس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ اور وزیر اعظم مولانا برکت اللہ بھوپالی کو منتخب کیا گیا، بلکہ افغانی حکومت کے زیر انتظام ایک اردو یونی ورسٹی کی داغ بیل بھی ڈالی، جو اردو کی جائے پیدائش سے دور اس کے فروغ و ترقی کے لیے ایک اہم پناہ گاہ ٹھہری۔ اس اردو یونی ورسٹی نے بعد میں کابل یونی ورسٹی کے نام سے شہرت پائی۔ اس یونی ورسٹی کا ذریعہ تعلیم اردو ہی تھا۔ حسن اتفاق کہ اس یونی ورسٹی کے پہلے سربراہ بھی دارالعلوم دیوبند کے ہی فاضل مولانا حاجی عبدالرزاق پشاوری تھے۔ اس یونی ورسٹی کے قیام، اس کے بانیان، اور اس سلسلے میں جدوجہد کرنے والوں کی پوری روداد افغانستان کے مشہور محقق اور دانش ور پروفیسر عبد الخالق رشید نے اپنے مضمون ''افغانستان میں اردو کی پہلی یونی ورسٹی'' میں لکھی ہے۔ (دار العلوم دیوبند، ادبی شناخت نامہ، ص: 49، حقانی القاسمی، تنظیم علمائے حق، نئی دہلی، 2006)

افغانستان آج بھی اردو زبان و ادب کے حوالے سے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتا ہے جہاں لسانی سطح پر ہندستان کی طرح کوئی تعصب اور تفریق نہیں ہے، وہاں اردو کی ترویج و ترقی کے تمام دروازے کھلے ہوئے ہیں اور اس وقت بھی اس سلسلے میں فضلائے دار العلوم ہی اس مہم کا علم تھامے ہوئے ہیں۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے پروفیسر سعود عالم قاسمی اپنے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

''افغانستان کو طالبان کی وجہ سے مغربی ممالک نے بدنام کیا اور طالبان کا رشتہ دار العلوم دیوبند سے جوڑا جاتا ہے، یہ کلی طور پر درست نہیں۔ البتہ افغانستان میں دار العلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ موجود ہیں اور وہاں دینی تعلیم کے علاوہ اردو زبان کی اشاعت کر رہے ہیں۔'' (اردو کے فروغ میں مدارس کا کردار، ص:40، عبدالمعید قاسمی (مرتب) فلاح المسلمین فتح پور، یوپی، 2013)

اردو کو غیر ملکی سرحدوں کے اندر جن جاں نثاروں نے پھیلانے کا کام کیا ہے، اس حوالے سے تحریک ریشمی رومال کے دو اہم رکن مولانا مقبول الرحمن سرحدی اور مولانا شوکت علی بنگالی، گریجویٹ کا نام سر فہرست رکھا جا سکتا ہے۔ تحریک ریشمی رومال سے منسلک یہ دونوں نیاز کیش 1905 اور 1908 میں دو الگ الگ وفود کے ساتھ چین اور برما روانہ کیے گئے تھے، ان دونوں نے تحریک کے اغراض و مقاصد کو بہ جلد بروئے کار لانے کے لیے مذہبی خطوط پر محنت کرنے کے ساتھ صحافت جیسے معروف زمانہ کئی محاذ پر بھی کام کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے 1905 میں شنگھائی کی سیرت کمیٹی کے زیر اثر اپنی سرگرمیوں کا باضابطہ آغاز کیا اور وہاں سے انھوں نے چینی زبان کے ساتھ اردو میں بھی ایک ماہنامہ 'العین' جاری کیا۔ یہ رسالہ بلا انقطاع 1909 تک پابندی کے ساتھ منظر عام پر آتا رہا۔ لیکن چند ایسی وجوہ پیش آئیں کہ انھیں اس تحریک کے سرخیل اور ان کے استاد حضرت شیخ الہند کی ایما پر رسالہ بند کر کے برما کے لیے رخت سفر باندھنا پڑا۔ اس رسالے کی عمر گرچہ انتہائی مختصر تھی، لیکن اردو کے عالمی تاریخ نویسوں کے لیے اس بات سے انکار ممکن نہ ہوگا کہ اس رسالے نے غیر اردو داں ملک چین میں اردو جیسی بے مایہ زبان کو متعارف کرانے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔ (صحافت پابند سلاسل، ضمیر نیازی، (مترجم) اجمل کمال، ص: 338، پاکستان اسٹڈی سینٹر کراچی، 2004)

اس تحریک کی طرف سے ایک وفد پروفیسر برکت اللہ بھوپالی کی سربراہی میں جاپان روانہ کیا گیا تھا۔ پروفیسر برکت اللہ بھوپالی کی مختلف النوع علمی اور فنی صلاحیتوں سے جب جاپان کا علمی اور ادبی طبقہ واقف ہوا تو انھیں ٹوکیو یونی ورسٹی کے شعبۂ اورینٹل لنگویجز میں بطور پروفیسر اردو بحال کر لیا گیا۔ بھوپالی صاحب کے لیے وہاں کی پروفیسری کا یہ سنہرا موقع، اپنے مشن کی توسیع کے لیے سونے پر سہاگا ثابت

پروفیسر برکت اللہ بھوپالی

ہوا، انھوں نے اس نعمت غیر مترقبہ کا فائدہ اٹھایا اور اپنے عظیم تر مشن کی تکمیل و تنفیذ میں ہمہ تن منہمک ہو گئے۔ سب سے پہلے انھوں نے وہاں اپنے ہم خیال افراد کے ساتھ مل کر The Islamic Fraternity (اسلامی اخوت) کے نام سے ایک تنظیم بنائی اور پھر اسی نام سے ایک سہ لسانی اخبار بھی جاری کیا، یہ اخبار عالمی رابطے کی زبان انگریزی اور مقامی زبان جاپانی کے ساتھ اردو میں بھی پابندی سے شائع ہوتا تھا۔ اس اخبار میں انگریزوں کے جبر و تسلط اور ان کی سازشوں کے خلاف انقلاب آفریں تحریریں لکھی گئیں، یہ اخبار عوامی سطح پر اتنا مؤثر اور مقبول تھا کہ اس کی شہرت بہت جلد جاپان سے نکل کر برما، سنگاپور، سری لنکا اور مشرق بعید تک پہنچ گئی۔ برطانیہ مخالف تحریر لکھنے کی پاداش میں مولانا بھوپالی کو ٹوکیو یونی ورسٹی کی ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا، تاہم یہ اخبار 1911 تک پابندی سے شائع ہوتا رہا۔ اس اخبار نے جاپان اور اس

کے پڑوسی ممالک میں اردو کی ترویج وتوسیع میں تاریخی رول ادا کیا۔ آج جاپان اردو کا ایک بڑا مرکز مانا جاتا ہے جہاں سے اردو کے کئی ماہانہ رسائل اور روزنامے شائع ہوتے ہیں۔ وہاں اردو کے صحافیوں اور قلم کاروں کو اعزازات و انعامات سے بھی سرفراز کیا جاتا ہے۔ ابھی حال ہی میں جے این یو کے شعبہ اردو کے استاد اور قومی کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین کو ان کی اردو صحافتی خدمات کے اعتراف میں انعام سے سرفراز کیا گیا۔ جب بھی جاپان میں اردو کی ترقی کے حوالے سے بات ہوگی، تحریک ریشمی رومال کے زیر نگرانی نکلنے والے اس اہم اردو اخبار کا نام ضرور لیا جانا چاہیے۔

تیسرا مشن چودھری رحمت علی پنجابی کی سربراہی میں فرانس بھیجا گیا تھا۔ انھوں نے بھی اپنی سرگرمیوں کی توسیع اور اپنے پروگرام کی تشہیر کے لیے ذرائع ابلاغ کا ہی سہارا لیا اور 'الانقلاب' نام کا اخبار نکالا۔ اس اخبار اور تحریکی مشن کی معاونت کے لیے پروفیسر برکت اللہ بھوپالی بھی ٹوکیو کی ملازمت سے برطرفی کے بعد فرانس وارد ہوئے۔ اس اخبار کی مدت بھی مختصر رہی، مگر اس نے ایشیا اور ہندستان سے دور اردو کی پود لگانے اور اس کے رقبے کی توسیع میں بڑا اہم رول ادا کیا۔

ہر دیال سنگھ کی قیادت میں ایک وفد امریکہ بھی بھیجا گیا تھا۔ اس وفد کو مزید مضبوطی اور استحکام عطا کرنے کے لیے کمک کے طور پر پروفیسر برکت اللہ بھوپالی اور چودھری رحمت علی کو بھی اپنی جگہ سے امریکہ جانے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ان لوگوں نے اپنی سرگرمیوں کے آغاز کے لیے پہلے غدر پارٹی تشکیل دی اور پروفیسر بھوپالی نے اسی نام سے ایک روزنامہ اخبار بھی نکالا۔ متھرا سنگھ اور ڈاکٹر خوشی محمد (مرزا محمد علی) کی قیادت میں زار روس کو اپنا ہم خیال بنانے کے لیے ایک وفد روس بھی روانہ کیا گیا تھا۔
(تحریک ریشمی رومال، مولانا عبدالرحمن، دہلی، 1970)

آج امریکہ میں اردو کا مستقبل انتہائی روشن بتایا جاتا ہے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں میں مختلف موضوعات پر اردو میں ریسرچ ہورہی ہے۔ واشنگٹن، نارتھ کیرولائنا، برٹش کولمبیا، بارکلے، مشی گن جیسی امریکہ کی تمام یونیورسٹیوں میں اردو زبان کی تعلیم دی جارہی ہے۔ امریکہ میں اردو کے اس قدر فروغ کے پیچھے یقینا اس تحریک کے کارکنان کا اہم رول رہا ہوگا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اردو امریکہ کے لیے ایک اجنبی زبان تھی، نہ عوامی سطح پر اس کا کوئی اثر تھا اور نہ حکومت اس سلسلے میں کوئی دل چسپی لے رہی تھی۔ امریکی حکومت تو 1960 کے بعد اردو پر توجہ دے رہی ہے جیسا کہ امریکہ میں اردو کی تدریس سے وابستہ پروفیسر جان کالڈویل نے امریکہ میں اردو کی تعلیم کے آغاز سے متعلق جان کاری دیتے ہوئے

چودھری رحمت علی پنجابی

کہا ہے کہ: "امریکہ میں اردو تعلیم کی شروعات 1960 کے قریب ہوئی تھی۔" (اردو دنیا، ستمبر، 2012) لیکن آج سے سو سال پہلے ہی تحریک ریشمی رومال کے وابستگان نے امریکہ میں اردو کے بیج کی کاشت کردی تھی۔

اس تحریک کے اغراض و مقاصد اور اس کے خفیہ منصوبوں کی ترسیل کے لیے جو خطوط لکھے جاتے تھے، وہ بھی اردو زبان میں ہی ہوتے تھے۔ یہ تحریک جس کے وابستگان کی اکثریت علما اور فضلا پر مشتمل تھی، اگر چاہتے تو

تحریک ریشمی رومال کے سارے کارکنان باستثنائے چند کا تعلق ایشیا کی عظیم اسلامی درس گاہ دار العلوم دیوبند سے ہی تھا۔ فارغین دیوبند نے خطابت و صحافت کی لائن سے ہمیشہ اردو زبان و ادب کے فروغ میں نمایاں کوشش کی ہے۔ دار العلوم نے اپنی گود میں پرورش پانے والے ایشیا، افریقہ اور عرب ممالک کے طلبہ کو بھی اردو میڈیم کے ذریعے ہی تعلیم دے کر اردو زبان کی توسیع و تفریح میں تاریخی رول ادا کیا ہے۔

اپنی پلاننگ کو خفیہ رکھنے کے لیے عربی فارسی اور کسی دوسری مقامی زبان کا سہارا بھی لے سکتے تھے، خود حضرت شیخ الہند کو عربی اور فارسی پر عبور حاصل تھا، جس کا ثبوت ان کی وہ تحریریں اور کتابیں ہیں جو فصیح عربی زبان میں مدرسی حلقوں میں ہر خاص وعام میں متعارف ومشہور ہیں، لیکن انھوں نے ایک ملک سے دوسرے ملک اپنے پیغام کی تشہیر کے لیے اردو زبان کا ہی سہارا لیا۔ اس قسم کے خطوط کی ایک بڑی تعداد آج بھی مل جاتی ہے اور وہ برٹش لائبریری آف انڈیا اور محمودیہ لائبریری، نئی دہلی سمیت ہندستان کی مختلف لائبریریوں کی زینت ہیں۔ مولانا عبیداللہ سندھی نے افغانستان سے مشن اور تحریک کے تعلق سے جو تین ریشمی خطوط دستی طور پر ہندستان روانہ کیے تھے وہ بھی اردو زبان میں تھے۔ ضرورت ہے کہ ریشمی رومال تحریک کے ارکان کے درمیان مراسلت و مکالمت پر مبنی ان خطوط کی دوبارہ، جدید عصری تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتابی شکل میں اشاعت ہو، تاکہ ہندستان اور اس سے باہر اردو کے فروغ میں تحریک ریشمی رومال کے وابستگان اور مدارس کے کردار کی تفہیم میں مدد مل سکے۔

تحریک ریشمی رومال کے سارے کارکنان باستثنائے چند کا تعلق ایشیا کی عظیم اسلامی درس گاہ دارالعلوم دیوبند سے ہی تھا۔ فارغین دیوبند نے خطابت وصحافت کی لائن سے ہمیشہ اردو زبان وادب کے فروغ میں نمایاں کوشش کی ہے۔ دارالعلوم نے اپنی گود میں پرورش پانے والے ایشیا، افریقہ اور عرب ممالک کے طلبہ کو بھی اردو میڈیم کے ذریعے ہی تعلیم دے کر اردو زبان کی توسیع وتفریح میں تاریخی رول ادا کیا ہے۔ بیرون ممالک سے آنے والے طلبہ کو وقتی طور پر اس نا آشنا میڈیم سے دقت ضرور ہوتی تھی، مگر وہ اساتذہ کی لگن اور اپنی جدوجہد کے سہارے بہت جلد اس میڈیم سے مانوس ہوجاتے تھے اور اس میں اظہار خیال کے ساتھ مضمون نگاری اور مقالہ نویسی پر بھی قادر ہوجاتے تھے۔ بیرونی ممالک کے غیر اردو داں طلبہ جب دارالعلوم سے سند فراغت لے کر نکلتے تو وہ نہ صرف اپنے وقت کے اردو کے بہترین مقرر وخطیب بنے، بلکہ ان میں سے کتنے ادیب وشاعر اور انشا پرداز بن کر بھی تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوگئے۔ دارالعلوم دیوبند نے ایشیا سے باہر عرب وعجم کے دوسرے ممالک کی سرحدوں میں اردو کو مقبول بنانے میں کتنا اہم رول ادا کیا ہے، اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر اور اردو کے ناقد عبدالصمد صارم نے آج سے تقریباً بیس سال قبل ماہنامہ ترجمان دارالعلوم میں شائع اپنے ایک مضمون میں یہ لکھا تھا:

"سب سے بڑی خدمت جو دارالعلوم دیوبند نے اردو ادب کی کی ہے اور جو بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے، یہ ہے کہ اس نے برما، بنگال، دکن، رنگون، کابل، بخارا، ایران، سماٹرا، جاوا، کشمیر اور نہ جانے کہاں کہاں دور دراز مقامات تک اردو زبان کو پھیلا دیا۔" (اردو کے فروغ میں دارالعلوم کا حصہ، مشمولہ ماہنامہ ترجمان دارالعلوم، نئی دہلی، جولائی 1994)

انھوں نے یہ لکھنے کے بعد کہ دار العلوم سے سند یافتہ حضرات جب اردو سے آشنا ہوکر اپنے وطن لوٹتے تھے تو وہ مقامی اور مادری زبان کے بجائے اسی اردو زبان میں اپنے ملک کے طلبہ کو تعلیم دیتے تھے، جس کی وجہ سے اردو افغانستان سے لے کر بنگال اور پشاور و بخارا تک پھیل گئی۔ لکھتے ہیں:

"ان علما کے بہت سے شاگردوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اردو اخبارات و رسائل کی ایڈیٹری، نگرانی یا سرپرستی کی اور بہت سے مصنف اور مضمون نگار پیدا کیے۔ اگر ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے جرائد و اخبارات و تصانیف وغیرہ سے کتنے لوگوں نے اردو سیکھی اور ان کی تقریروں سے کتنے عوام نے زبان سے آشنائی پیدا کی، تو یہ دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے، جس کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔" (ایضا)

سمرقند و بخارا میں اردو کے سبک رو قافلے کی حدی خوانی اور اس کو تیز گامی عطا کرنے میں بھی دار العلوم دیوبند کے سپوتوں نے ہی کلیدی رول ادا کیا ہے۔ تاریخ دار العلوم کے مصنف سید محبوب رضوی نے یہ لکھا ہے کہ ایک صاحب جنھوں نے مختلف ممالک کی سیاحت کی تھی جب وہ دار العلوم آئے تو اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ جب میں بخارا پہنچا، تو وہاں کا ایک شہری مجھے ہندستانی سمجھ کر مجھ سے اردو میں ہی ہم کلام ہوا، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہندستان سے اتنی دور اتنی صاف ستھری اردو کیسے پہنچی، انھوں نے سوال کرنے پر بتلایا:

"یہ دار العلوم دیوبند کا تعلیمی فیض ہے اور میں ہی نہیں، بلکہ یہاں کا علمی حلقہ بالعموم اردو بولتا اور سمجھتا ہے۔" (سید محبوب رضوی، حاشیہ تاریخ دار العلوم، ج: 1، ص: 365 مکتبہ دار العلوم دیوبند، 1993)

مختصر مضمون میں اس تحریک کے پلیٹ فارم سے اردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں انجام دی جانے والی تمام خدمات کا احاطہ ممکن نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک نے اردو کو سرحد پار کی سیر کرانے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ آج اگر اردو دنیا کے طول و عرض میں پھل پھول رہی ہے اور بین الاقوامی رابطے کی زبان بن چکی ہے تو اس میں یقینا تحریک ریشمی رومال اور دار العلوم کے فیض یافتہ افراد کا خون جگر شامل ہے۔ یہ تحریک زیادہ دنوں تک اپنی زندگی کا ثبوت نہیں دے سکی، لیکن اس نے اپنے کارکنان کے خلوص، ان کے بے لوث جذبات کی وجہ سے چند سالوں میں ہی اردو زبان کے تن نازک میں وہ توانائی بھر دی کہ آج اردو عالمی زبان کے درجے میں رکھی جاسکتی ہے۔ امریکہ، افریقہ، یورپ اور عرب ممالک جہاں کہیں بھی عوامی سطح پر اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اس میں اس تحریک کے وابستگان کا لہو شامل ہے۔ جس طرح تاریخ آزادی کے باب سے ان مسلم مجاہدین آزادی کے نام کو غائب کر دیا گیا ہے اسی طرح اس تحریک کی اردو کے فروغ کے حوالے سے انجام دی جانے والی خدمات کو بھی بدقسمتی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ خدمت کسی صلے اور ستائش کی تمنا کے بغیر انجام دی تھی، لیکن آج جب کہ اردو ادب کے بالشتیوں کو بھی گراں قدر قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازا جا رہا ہے اردو کے ان مجاہدوں کو جب فراموشی کے اس روز افزوں مرض کا علم ہوگا تو ان کی روحوں کو تکلیف پہنچے گی۔

تحریک ریشمی رومال کے اعمال و افعال کو ہی ہم نے فراموش نہیں کر دیا، بلکہ اس تحریک کے بنیادی کردار شیخ الہند مولانا محمود حسن کو ہی ہم نے تاریخ کے کوڑے دان کی نذر کر دیا ہے۔ یہی وہ شخص تھا جس نے ملک سے باہر یورپ

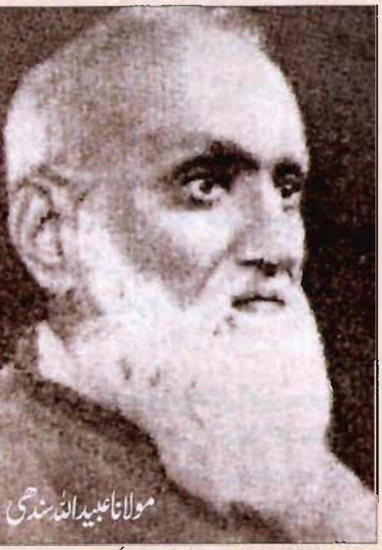

کے ایک اجنبی خطے ٹاپو نما مالٹا کے انتہائی سرد قید خانے میں تین سال اور سات مہینے سخت اسیری کے ایام گزارے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ہی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ایک طلبہ گروپ کے سامنے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کا تصور پیش کیا تھا جو آج ایک اقلیتی ادارے کی حیثیت سے دار الحکومت دہلی میں قوم و ملت کے نونہالوں کو جدید تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہی ہے۔ انھوں نے تعلیم کو جدید و قدیم و عصری اور مذہبی خانوں میں تقسیم نہیں کیا، بلکہ وسعت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے علی گڑھ اور دیوبند کو ایک پلیٹ فارم پر بھی لانے کی کوشش کی۔ جامعہ ملیہ کے سنگ بنیاد کی تقریب میں وہاں موجود عصری تعلیم یافتہ افراد اور طلبہ کے مقام و مرتبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے درد مندانہ لہجے میں فرمایا تھا:

"اے نونہالان وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غمخوار (جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں۔ تو میں نے اور میرے چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں "دیوبند اور علی گڑھ" کا رشتہ جوڑا۔" (اسیران مالٹا، مولانا سید محمد میاں، ص: 81، دار الکتاب دیوبند، 2002)

شیخ الہند نہ مصلحت پسند تھے اور نہ مفاد پرست، بس انھیں انگریزوں سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ ان کو انگریز اور انگریزی حکومت سے کتنی سخت نفرت تھی کہ یوپی کے گورنر جیمس میسٹن نے کہا تھا: "اگر اس شخص کو جلا کر خاک بھی کر دیا جائے تو وہ بھی اس کوچے سے نہیں گزرے گی جس میں کوئی انگریز ہوگا۔" اور یہ بھی کہا: "اگر اس شخص کی بوٹی بوٹی بھی کر دی جائے تو ہر بوٹی سے انگریزوں کی عداوت ٹپکے گی۔" (دار العلوم دیوبند: ادبی شناخت نامہ، حقانی القاسمی، ص: 31، تنظیم علمائے حق، نئی دہلی 2006)

جامعہ ملیہ کے ذمے داروں کو تقریباً 90 سال بعد مولانا کے کردار اور جامعہ کی تاسیس میں ان کی تگ و دو کا احساس ہوا تو انھوں نے جامعہ کے اسکول کا دروازہ ان کے نام موسوم کر دیا۔ ابھی حال ہی میں، جمعیۃ علماء ہند کے ارباب بست و کشاد کی کوششوں سے ریشمی رومال تحریک کی یاد میں اس کے سو سال پورے ہونے پر وگیان بھون میں صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی کے ہاتھوں ڈاک ٹکٹ کا اجرا عمل میں آیا۔ ادھر یوپی حکومت کو بھی سو سال گزر جانے کے بعد جنگ آزادی میں اس تحریک کے انقلابی رول کی بو باس محسوس ہوئی تو اس نے صدر جمعیۃ علما ہند مولانا ارشد مدنی کی یاد دہانی کے بعد سہارن پور کے ایک میڈیکل کالج کا نام شیخ الہند میڈیکل کالج رکھنے کا اعلان کر دیا ہے:

لیکن اس سے تحریک ریشمی رومال اور اس کے کرداروں کی وسیع تر خدمات کا کما حقہ صلہ نہیں ادا ہوگا۔ آج چھوٹے چھوٹے اور غیر ضروری عنوانات پر بھی قومی اور بین الاقوامی سطح کا سیمینار اور کانفرنس منعقد کرانے کا رواج چل پڑا ہے، اس تحریک کے نام سے بھی قومی سطح کا سیمینار منعقد کرنے اور اس سے متعلق تمام دست یاب لٹریچر کو عصری انداز میں شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی خدمات، کارناموں، اس کی تاریخی اہمیت، جنگ آزادی میں اس کے انقلابی رول پر سے بھی دھول صاف ہو سکے اور اس تحریک کے جاں بازوں کو سو سال بعد ہی سہی سچا خراج عقیدت پیش ہو سکے۔ ■

Abrar Ahmad, At & Post Ijra, Via Raiyam Factory, Dist. Madhubani - 847237 (Bihar)

محمد نعمان خان

اسکولی سطح پر اردو زبان کی تدریس کے مسائل اور تقاضے

زبانوں کا گھر، ہندوستان، ایک کثیر اللسان ملک ہے۔ اس کی بے مثال ہمہ جہت تکثیریت کی شناخت میں دیگر امور کے ساتھ ساتھ کثیر لسانیت کا پہلو بھی شامل ہے۔ 1961 کی مردم شماری کے مطابق پانچ لسانی خاندانوں: ہند آریائی، دراوڑ، آسٹرو ایشاٹک، تبتو برما اور سیمنٹو ہیمیٹک سے متعلق 1652 زبانیں ہندوستان میں رائج تھیں۔ ایک لسانی جائزے کے مطابق 71 زبانیں ریڈیو میں اور 15 زبانیں ملک کے انتظامی امور میں استعمال کی جاتی ہیں۔ این سی ای آر ٹی کے 'آل انڈیا اسکول ایجوکیشن سروے 2004، کی رپورٹ کے مطابق 1990 تک 60 زبانیں ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کی جاتی تھیں لیکن 2002 میں ان کی تعداد گھٹ کر 47 رہ گئی ہے۔

آئینِ ہند کے حصّہ XVII کی دفعات '351'- '343' میں ہندوستانی زبانوں کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ دستورِ ہند کے آٹھویں شیڈول میں مندرج اہم ہندوستانی زبانوں میں اردو زبان بھی شامل ہے۔ ہندی کو ہندوستان کی دفتری زبان اور انگریزی کو معاون دفتری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اردو کا شمار ہندوستان کی جدید مقبول زبانوں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح اردو زبان کا اپنا کوئی مخصوص علاقہ یا صوبہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ کشمیر سے کنیا کماری اور آسام سے گجرات تک، ملک کے طول و عرض میں اردو زبان بآسانی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اس کا حلقۂ اثر محض ہندوستان، پاکستان اور اسلامی ممالک تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ کئی یوروپی ملکوں میں بھی اس کی تعلیم نیز ترویج و اشاعت کا کام شدومد کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے۔

ہند آریائی خاندان سے تعلق رکھنے والی، مختلف بولیوں، زبانوں اور افراد کے باہمی ارتباط سے تشکیل پانے والی اور ہندی، ہندوی، اردوئے معلّٰے، ریختہ اور ہندوستانی کے ناموں سے موسوم کی جانے والی اردو محض ایک زبان ہی نہیں، ایک تہذیب بھی ہے۔

کثیر لسانیت کے فروغ اور مساوی معاشرے کے قیام کی خاطر ہندوستان کے آئین میں تمام زبانوں کی ترقی کے لیے مساوی رویہ اختیار کرنے کی تجویز ہے۔ تمام ماہرین تعلیمات اس بات پر متفق ہیں کہ بچے کو اس کی مادری زبان میں تعلیم دی جائے۔ پروگرام آف ایکشن-1992 ''قومی درسیات کے خاکے 1975 تا 2005' اور قومی تعلیمی پالیسی 1986، RTE-2009 میں بھی بچوں کو ان کی مادری زبان / گھریلو زبان میں تعلیم حاصل کرنے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔

سہ لسانی فارمولہ میں مادری زبان پر محیط، کثیر لسانیت کو فروغ دینے کی بات کہی گئی ہے۔ اس کے مطابق اسکولی تعلیم کے دس سال کے اثنا میں کم سے کم تین زبانوں کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ 'سہ لسانی فارمولا' کے تحت اردو زبان کی تدریس تین سطحوں: مادری زبان، ثانوی زبان اور تیسری زبان کے بطور عمل میں آتی ہے۔

صد فی صد خواندگی کے ہدف کو حاصل کرنے کی خاطر فاصلاتی نظام تعلیم کے اداروں کو قائم کرنے اور انھیں ترقی سے ہم کنار کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ 'Ignou' نئی دہلی 'Manuu' حیدر آباد، ڈاکٹر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی حیدر آباد ،مہرشی، اوپن یونیورسٹی الہ آباد (اتر پردیش)، ڈائریکٹوریٹ برائے فاصلاتی تعلیم کا اسکول، دہلی یونیورسٹی، نظامت فاصلاتی تعلیم، پٹنہ یونیورسٹی (بہار) وردھمان، مہاویر اوپن یونیورسٹی ، 'کوٹہ (راجستھان) اترا کھنڈ اوپن یونیورسٹی (ہلدوانی) ڈائریکٹوریٹ آف ڈسٹینس ایجوکیشن، کشمیر، یونیورسٹی (سری نگر) اردو خط و کتاب کورس، جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) بھوج اوپن یونیورسٹی (بھوپال)، مرکز برائے فاصلاتی تعلیم، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد میں اردو تعلیم کی سہولتیں مہیا ہیں۔ اسکولی سطح پر یہ کام NIOS، ریاستی تعلیمی بورڈس، اور اوپن اسکولس کے تحت بخوبی انجام دیا جا رہا ہے۔ اسکولی سطح کے لیے ہزاروں دینی مدارس، مدرسہ بورڈس، ریاستی اردو اکامیاں، NCPUL،NCERT ، CIIL، SSA، CBSE، DIETS، SCERTS ، ریاستی ٹیکسٹ بک کارپوریشن، اور NGOS اردو نصابات کی ترتیب، درسی کتب اور معاون درسی مواد کی اشاعت، اساتذہ کی تربیت اور تعلیم و تدریس کے کاموں میں مصروف ہیں لیکن اردو زبان کی تعلیم و تدریس سے متعلق خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہو پا رہے ہیں۔ سب سے سنگین مسئلہ اردو کی ابتدائی تعلیم کا ہے۔ بچّے ملک و قوم کے معمار ہوتے ہیں۔ ملک و قوم اور زبان و ادب کی ترقی میں تعلیم کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ ابتدائی سطح کی تعلیم و تدریس نہایت ضروری ہے کہ اسی سے اس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اور پھلنے پھولنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔

ہندوستان میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے مقابلے میں اس کی ابتدائی تعلیم کا انتظام و انصرام اطمینان بخش نہیں ہے۔ ابتدائی، اعلیٰ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطحوں پر اردو تعلیم و تدریس سے بے اعتنائی کے دراصل کئی علل و اسباب ہیں۔ اس کے لیے محض حکومت، اسکول انتظامیہ اور معاشرے کو ہی موردِ الزام قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اہلِ اردو خصوصاً والدین، اردو اساتذہ اور طلبا بھی بڑی حد تک ذمّے دار ہیں۔ اپنی زبان کو حقیر سمجھنا، احساس کم تری کے باعث مادری زبان کی تدریس سے بے توجہی اور انگریزی میڈیم اسکولوں کی جانب والدین کا جھکاؤ، اردو طلبا اور اساتذہ کی مایوس کن تعداد، اردو درسی کتب، اور معاون درسی مواد کی عدم دستیابی، اردو اساتذہ کو جدید تقاضوں کے بموجب پیشہ ورانہ تربیت نہ دیا جانا، اردو زبان کی تدریس دیگر مضامین کے اساتذہ کے ذریعے تکمیل پانا، اردو اساتذہ کی سہل پسندی، والدین اور طلبا کی اردو سے بے رغبتی، اردو زبان کے تئیں فراخ دلانہ رویے کی کمی، لسانی

عصبیت اور سہ لسانی فارمولے، RTE، اور دستور ہند کے سیکشن A-350، کا صحیح اور موثر نفاذ اور انطباق نہ ہونا وغیرہ ایسے مسائل ہیں کہ جن کے سبب اردو زبان، اس کی ترقی و تدریس متاثر ہورہی ہے۔

KVS میں سوائے کیندریہ ودیالیہ اے ایم یو علی گڑھ اور بی ایچ یو، وارانسی کے دیگر کسی KVS میں اردو تدریس کا انتظام نہیں ہے۔ البتہ JNVS (جواہر نودے ودیالیوں) میں اردو بطور ثانوی زبان چھٹی سے نویں جماعت تک لازمی طور پر پڑھائی جاتی ہے اور Lateral Entry کے بطور بھی اردو طلبہ داخلہ لیتے ہیں لیکن دسویں جماعت میں اردو تدریس نہ ہونے اور اردو کے نمبروں کو نتیجے میں شامل نہ کرنے کے سبب طلبا میں نہ صرف عدم دل چسپی اور بے کیفی پیدا ہوتی ہے بلکہ اعلیٰ ابتدائی سطحوں پر اردو تدریس کا مقصد بھی پورا نہیں ہو پاتا ہے۔

اردو زبان کی پناہ گاہ سمجھے جانے والے دینی مدارس میں Medium of Instruction کے بطور اردو زبان کا ماحول اور رواج ساز گار اور عام ہے لیکن دینی مدارس کے مقاصد میں دینی تعلیم کے حصول کو جو اوّلیت اور اہمیت حاصل ہے، وہ اردو زبان کی تدریس کو نہیں دی جا سکی ہے۔

بعض ریاستی اردو اکادمیوں، جامعات، NCPUL، اور NGO's کے تحت غیر اردو داں حضرات کو اردو زبان سکھانے کی غرض سے Diploma Courses / Certificate کا انتظام ہے لیکن صحیح حکمت عملی اور مناسب رہنمائی کے فقدان کے سبب وہ نتائج برآمد نہیں ہو پا رہے جو ہو جانے چاہیے تھے۔

سہ لسانی فارمولا محض ایک لسانی حکمت عملی ہے جس کے تحت طلبا کو ایک سے زیادہ زبانیں سکھانا مقصود ہے۔ لیکن ریاستی حکومتوں کی جانب سے سہ لسانی فارمولے پر خاطر خواہ عمل درآمد نہ ہونے اور سنسکرت جیسی کلاسیکی زبان کو جدید ہندوستانی زبان قرار دیے جانے کے سبب اس محاذ پر بھی اردو زبان کو نقصان کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

اتر پردیش کے اسکولوں میں آج بھی NCERT یا دیگر اداروں کی شائع کردہ 20-25 سال پرانی Out dated درسی کتب پڑھائی جارہی ہیں اور بار بار اس جانب توجہ مبذول کرائے جانے کے باوجود بھی ذمے داران کے کانوں پر جوں نہیں رینگتی۔ آموزگار، ان پرانی کتابوں کو پڑھ کر نئے حالات کا مقابلہ کس طرح کرسکیں گے؟ اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تبدیلی ایک فطری عمل ہے جس کا انعکاس زندگی کے ہر شعبے کی طرح تعلیمی، تدریسی امور میں بھی نمایاں ہوتا ہے۔ انقلاباتِ زمانہ کے سبب موضوعات، متن اور طریقۂ تدریس میں بھی تبدیلیاں واقع ہورہی ہیں اور طلبا کا مزاج بدل رہا ہے۔ یقیناً آج کا طالب علم، کل کے طالب علم سے ہر

ہندوستان میں اردو کی اعلیٰ تعلیم کے مقابلے میں اس کی ابتدائی تعلیم کا انتظام و انصرام اطمینان بخش نہیں ہے۔ ابتدائی، اعلیٰ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی سطحوں پر اردو تعلیم و تدریس سے بے اعتنائی کے دراصل کئی علل و اسباب ہیں۔ اس کے لیے محض حکومت، اسکول انتظامیہ اور معاشرے کو ہی موردِ الزام قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اہل اردو خصوصاً والدین، اردو اساتذہ اور طلبا بھی بڑی حد تک ذمّے دار ہیں

اعتبار سے مختلف ہے۔ ان امور کے پیش نظر جب اسکولی تعلیم سے متعلق ریاستوں کے تعلیمی نصابات اور تیار کردہ درسی کتب کا بغور مطالعہ کیا جاتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ سوائے مہاراشٹر، آندھرا پردیش، بہار اور مدھیہ پردیش SCERTS کے بیشتر ریاستوں کے اردو نصابات اور درسی کتب کی تیاری میں ہماری قومی تعلیمی پالیسی 1986 نیشنل پروگرام آف ایکشن 1992، نیشنل کیری کولم فریم ورک 2005، کی سفارشات اور جدید عصری تعلیمی تقاضوں کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا ہے۔

کمزور نصاب اور غیر تربیت یافتہ اردو اساتذہ، اردو زبان کی تدریس کو کس طرح بہتر، مفید اور معیاری بنا سکتے ہیں، اس کا بھی بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

ماہرینِ تعلیمات نے موثر، مفید معیاری اور کامیاب تدریس کے لیے چار عناصر یعنی مدرسہ یا اسکول، معلّم، نصاب اور تدریس کے مناسب طریقۂ کار کو ضروری قرار دیا ہے۔ مدرسہ یا اسکول کی خوش گوار، موافق اور مانوس فضا، معلّم کی شفقت اور لیاقت، نصاب کی جاذبیت اور جامعیت اور طلبا مرکوز، سرگرمی اساس، پرلطف اور دل چسپ طریقۂ تدریس کے ذریعے تدریس سے متعلق کئی مسائل حل کیے جاسکتے ہیں۔

مدرسہ یا تعلیمی ادارے کا ماحول جس قدر موافق و ساز گار ہوگا بچوں کے لیے تدریس کا عمل اُسی قدر بہتر اور معیاری ہو سکے گا۔ لیکن عام طور پر ہمارے اسکولوں کا ماحول اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ بچوں کی اسکول سے بے زاری کا بڑا سبب گھر اور اسکول کے ماحول میں مطابقت اور یکسانیت کا نہ ہونا بھی ہے۔

ہماری قدیم، روایتی تعلیم کا طریقۂ کار معلم مرکوز تھا جس کے سبب بچوں کی شمولیت اور انھیں آزادانہ غور و فکر نیز آموزش کے بہتر مواقع نہیں مل پاتے تھے۔ لیکن عصر حاضر کا طریقۂ تدریس 'طفل مرکوز' اور سرگرمی اساس ہے۔ جن اسکولوں میں اس اہم نکتے کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا ہے۔ وہاں کئی طرح کے مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔

جدید تعلیمی نظام میں استاد یا معلم کی حیثیت 'Facilitator' یعنی تسہیل کار کی ہے اس لیے اس کے مزاج اور رویے میں طلبا کے تئیں شفقت، اپنائیت معاونت اور ہمدردی کی خوبیوں کا ہونا لازمی ہے۔ ایک اچھے معلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف طلبا کا مزاج شناس ہو بلکہ مطالعے کا اچھا ذوق بھی رکھتا ہو اور تدریس کو محض منصبی فریضہ ہی نہیں بلکہ محبوب مشغلہ بھی سمجھتا ہو، موضوع یا متن پر اس کی گرفت مضبوط ہو اور وہ تدریس کے عام و خاص مقاصد، تعمیریت یعنی Constructivism، سی سی ای (Comprehensive Continuous Evaluation) شمولیتی تعلیم (Inclusive Education) جیسے جدید طریقۂ کار سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا ہو۔ اکتسابی مہارت، فرض شناسی، پیشہ ورانہ ترتیب اور ذاتی جوہر کا ہونا بھی اچھے استاد کی پہچان ہے۔

نظام تدریس کے غیر معیاری یا غیر موثر ہونے کے اسباب میں بچوں کی ذہنی سطح، نفسیات، مزاج و ماحول سے ہم آہنگ نہ ہونا اور سبھی ریاستوں کے اسکولوں میں یکساں نصاب کا نفاذ نہ ہونا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ اس ضمن میں NCERT عصری تقاضوں اور قومی سطح کے معیار و ضروریات کو ملحوظ رکھ کر درسی کتاب اور معاون درسی مواد فراہم کرکے No Profit, No Loss کے تحت Model Text Books شائع کرتی ہے۔ CBSE سے ملحقہ اسکولوں، KVS، JNVS، Public Schools کے علاوہ ہندوستان کی سترہ ریاستوں نے NCERT ٹیکسٹ بکس کو بعینہٖ اختیار کرلیا ہے۔ اس طرح نصاب کی یکسانیت اور اس کے معیار کا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا ہے، اگر تمام ریاستیں اس پر عمل پیرا ہو جائیں گی تو یہ مسئلہ مکمل طور پر حل ہوجائے گا۔

معیاری اور مفید درسی کتب کی تیاری کے لیے محض معیاری مواد و متن کا انتخاب ہی کافی نہیں ہے بلکہ عملی مشقوں کے ساتھ ساتھ سرورق، طباعت، رنگین تصاویر، مناسب فونٹ سائز اور خوبصورت اور دیدہ زیب گیٹ اپ بھی ضروری ہے۔ بیشتر SCERTS کی درسی کتب ان اوصاف سے عاری نظر آتی ہیں۔

طریقۂ تدریس کو دلچسپ، پرلطف اور موثر بنانے کے لیے درج ذیل تدریسی اصولوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً آسان سے مشکل، کل سے جز، معلوم سے نامعلوم، محسوس سے غیر محسوس اور مقرون سے مجرد کی جانب عمل آوری کی پابندی دیگر مضامین کی طرح اردو زبان کی تدریس میں بھی معاون ثابت ہوتی ہے لیکن ہمارے بیشتر اساتذہ، دورانِ تدریس مذکورہ بالا

اصولوں کو ملحوظ نہیں رکھ پاتے ہیں۔ اسی طرح دوران تدریس معاون درسی اشیا کا صحیح استعمال، طلبا کے اکتسابِ علم کے لیے Across the Curriculum کے مواقع فراہم کرنا، اسکولوں کے نظام الاوقات یعنی Table Time میں Flexibility پر لطف آموزش کے لیے کھیل کھیل میں تدریسی عمل پر توجہ وغیرہ معاملات، طلبا کی دل چسپی اور ان کی سطحِ اکتساب میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں لیکن دوران تدریس عام طور پر ان امور پر توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

زبان کے حصولِ تعلیم کے لیے جو اصول لازمی قرار دیے گئے ہیں، اُن میں زبان دانی، ادب شناسی، لطف اندوزی، متعلقہ مضمون میں مہارت کے ساتھ ساتھ حب الوطنی، قومی یکجہتی، اچھے انسان کی تعمیر Scientific temper، کثیر لسانیت، ماحولیات اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا فروغ دیگر مضامین کی طرح اردو زبان کی تدریس کے لیے بھی ضروری ہے۔

تدریس ایک معزز پیشہ ہے۔ اس کی ابرومندی سماج کے ہر فرد پر لازم ہے۔ ابتدائی درجات کی تدریس سب سے مشکل، اہم اور نازک فریضہ ہے۔ لیکن کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ کے مقابلے میں اسکولی اساتذہ کو کم اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کی تنخواہیں بھی کم ہوتی ہیں، انھیں سہولتیں اور مواقع بھی کم فراہم کیے جاتے ہیں جس کے سبب اسکول اساتذہ میں نہ صرف بے دلی، بے کیفی پیدا ہوتی ہے بلکہ وہ کبھی کبھی احساسِ کمتری کا بھی شکار ہو جاتے ہیں۔ حکومت، سماج اور انتظامیہ کا یہ فرض ہے کہ وہ اس جانب متوجہ ہو کر اس اہم مسئلے کے تدارک کی سعی کریں۔

انگریزی زبان کی برتری اور بالادستی کے سبب سبھی ہندوستانی زبانوں کے وجود کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ انگریزی زبان، اہلِ اردو کے لیے بھی ایک Challenge بنی ہوئی ہے۔ بلاشبہ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے اور کامیاب عملی زندگی کے لیے اس کا جاننا اور سیکھنا ضروری ہے لیکن انگریزی کی چاہ میں اپنی زبان سے منہ موڑ لینا یا اسے کمتر سمجھنا، دانش مندی اور وفاشعاری نہیں ہے۔ بطور فیشن یا فوقیت گھر، روزمرہ زندگی کے نجی کاموں، عام گفتگو، تحریر و تقریر میں انگریزی زبان یا الفاظ کے بکثرت استعمال کے سبب اردو زبان کی فطری روانی، چاشنی، اثر انگیزی ادبیت، لطف اندوزی اور آہنگ و حسن متاثر ہو رہا ہے۔ اردو زبان کے مسلّمہ اصول و قواعد سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ SMS کے استعمال کے سبب نہ صرف تحریری اور تخلیقی صلاحیتیں متاثر ہو رہی ہیں بلکہ اسکولوں اور جامعات ہی میں نہیں، پورے معاشرے میں ایک ایسی 'متوازی اردو' پیدا ہو رہی ہے کہ جسے معیاری یا مثالی اردو سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ اس اہم مسئلے کے تدارک کے پیش نظر NCPUL نے اردو رسم خط میں SMS کی سہولتیں بہم پہنچا کر ایک انقلاب آفرین قدم اٹھایا ہے۔ کسی ایک زبان میں مکمل عبور یا اکملیت حاصل نہ ہونے کے سبب ہماری نسلیں محض اپنی مادری زبان سے ہی بے بہرہ نہیں ہو رہی ہیں بلکہ گونگی، بہری ہوتی جا رہی ہیں۔ ذخیرۂ الفاظ میں کمی واقع ہونے کے سبب ان کی خود اعتمادی اور اظہار کی صلاحیتیں بھی متاثر ہو رہی ہیں۔ گھروں میں اردو کا ماحول نہ ہونے کے سبب ان کے بگڑے ہوئے تلفظ، مخرج یا غلط ادائیگی پر کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں ہے۔ اس طرح محض اسکولوں یا تعلیمی اداروں میں ہی نہیں بلکہ گھروں میں بھی معیاری اردو کے فروغ کی صورتیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ عوامی ذرائع ابلاغ خصوصاً الیکٹرانک میڈیا کے بڑھتے اثرات کے سبب طلبا اور اساتذہ میں مطالعے کا ذوق کم ہو رہا ہے۔

نئی نسل میں مادری زبان سے رغبت پیدا کرنا، اس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا احساس دلانا، اردو زبان کے تئیں پنپنے والے احساسِ کمتری کو دور کرنا، اردو زبان کے ذریعے ملنے والے مواقع خصوصاً روزگار کے حصول کے ذرائع سے آگاہ کرانا اور روشن مستقبل کی تعمیر کا احساس دلانا، ہر اہلِ اردو کا فرضِ اوّلین اور وقت کا تقاضا ہے۔

مذکورہ بالا تمام مسائل اس بات کا بیّن ثبوت ہیں کہ آزاد ہندوستان میں اردو زبان کا سب سے اہم مسئلہ اس کی تدریس کا مناسب اور معقول انتظام نہ ہونا ہے۔ اس ضمن میں سب سے حیران کن رویہ اہلِ اردو خصوصاً والدین، اردو اساتذہ، فن کاروں اور اردو دانشوروں کا ہے جو بہ ظاہر اردو زبان سے محبت کا دم بھرتے ہیں، اردو کے نام پر عزت، شہرت اور دولت کماتے ہیں لیکن اس کے فروغ اور بقا کے تئیں کوئی مثبت قدم نہیں اٹھاتے، کوئی ٹھوس منصوبہ مرتب نہیں کرتے۔ اکثر اردو انجمنوں، اداروں اور اکادمیوں کا دائرہ محض تفریحی مشاعروں اور پامال موضوعات پر سیمیناروں کے انعقادات کی حد تک محدود رہتا ہے۔ مادری زبان تو مادری زبان ہوتی ہے لیکن اہلِ اردو کو اپنی مادری زبان سے وہ لگاؤ دکھائی نہیں دیتا جو کہ ہمارے دیگر ہم وطنوں خصوصاً علاقائی زبانوں کے بولنے والوں کو اپنی اپنی زبانوں سے ہے۔ ہمارے دانش ور اور فن کار، قدیم و جدید، ترقی پسند، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی بحثوں میں الجھے نظر آتے ہیں لیکن انھیں یہ احساس نہیں ہے کہ جب زبان کا وجود ہی خطرے میں پڑ جائے گا اور اس کے قاری کی تعداد گھٹنے لگے گی تو پھر سارے موضوعاتِ بحث آپ ہی ختم ہو جائیں گے۔

ابتدائی سطحوں پر جب اردو زبان کی تدریس متاثر ہوگی تو نئی نسل سے متعلق بچوں کا زبان داں بننا تو درکنار ہے، وہ حرف شناس بھی نہیں بن پائیں گے۔ اردو ان کے لیے ایک اجنبی غیر مانوس اور مشکل زبان بن کر رہ جائے گی۔ وہ نہ صرف اپنی لسانی اور تہذیبی شناخت کھو بیٹھیں گے بلکہ اردو زبان کی شیرینی، لطافت اور تونگری کے ساتھ ساتھ اس میں موجود وقیع ترعلمی، ادبی، مذہبی سرمائے سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ وہ بنیادی اور اہم کام یعنی اردو زبان کی تدریس جس سے اردو کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں، اس کا مستقبل سنورتا ہے، اس میں وسعت پیدا ہوتی ہے، اس کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی میں اضافہ ہوتا ہے، افسوس کہ اس اہم کام کی جانب ہماری توجہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ یہ وقت دراصل زبان کی تحریک چلانے کا ہے، ادبی تحریکات کا نہیں! زبان کی ترقی، ترویج و اشاعت اور صورتِ حال پر خصوصی سیمینار اور مباحثے منعقد کر کے صحیح لائحہ عمل مرتب کرنے کا ہے۔

یہ سوال بجائے خود خاص اہمیت کا حامل ہے کہ مادری زبان کی بقا اور ارتقا میں خود قوم کا کس قدر حصّہ ہوتا ہے؟ مادری زبان کی ترقی میں جب تک پوری قوم بیدار و باعمل نہیں ہوگی، بہتر نتائج سامنے نہیں آسکیں گے۔

نئی نسل میں مادری زبان سے رغبت پیدا کرنا، اس کی اہمیت، ضرورت اور افادیت کا احساس دلانا، اردو زبان کے تئیں پنپنے والے احساسِ کمتری کو دور کرنا، اردو زبان کے ذریعے ملنے والے مواقع خصوصاً روزگار کے حصول کے ذرائع سے آگاہ کرانا اور روشن مستقبل کی تعمیر کا احساس دلانا، ہر اہلِ اردو کا فرضِ اوّلین اور وقت کا تقاضا ہے۔ جس دن نئی نسل کو مذکورہ بالا امور کا احساس ہو جائے گا وہ دیگر مضامین کی طرح اردو زبان کی تعلیم کو بھی قابلِ اعتنا سمجھنے لگے گی۔ جن باشعور لوگوں نے اس راز کو پا لیا ہے وہ کامیاب اور باعزت عملی زندگی سے ہم کنار ہو رہے ہیں۔ مہاراشٹر ریاستی بورڈ کے امتحانات میں اردو میڈیم طلبا کی امتیازی کامیابیاں، سِول سروسز کے مقابلہ جاتی امتحانات میں اردو میڈیم یا اردو بحیثیت مضمون کے طلبا کا انتخاب، عوامی ذرائع ابلاغ کے شعبوں میں اردو مترجمین، مدیران اور اناؤنسرس کے عہدوں پر تقررات اس امر کا بیّن ثبوت ہیں اور یہ بھی واضح کرتے ہیں کہ اس نوع کے تمام کام سرکاری سرپرستی یا معاونت سے زیادہ انفرادی محنت و لگن اور ایثار و عمل کے متقاضی ہیں۔

اہلِ اردو کی سرگرم اور پرخلوص شراکت سے ہی اردو زبان کی تدریس کے مسائل بآسانی حل ہو سکتے ہیں۔ اہلِ اردو کا فرض ہے کہ اس ضمن میں وہ مثبت حکمتِ عملی کے تحت اردو زبان کی ترقی نیز اس کی تدریس کے تئیں سازگار فضا ہموار کریں۔ ■

Prof. Mohd Noman Khan
NCERT, New Delhi - 110016

محمد نورالحق

اردو زبان کی تاریخی اہمیت

ہندوستان کی تہذیبی اور لسانی تاریخ میں کئی اہم موڑ آئے اور ہر موڑ پر پڑاؤ ڈالنے والوں نے اپنی اپنی قوت اور صلاحیت کے مطابق اپنے کارنامے انجام دیے۔ کسی نے اپنے کارناموں سے تاریخ کے سنہرے اوراق کو مزین کیا تو کوئی ملک عدم کو سدھار گیا، اور کسی کو دیس نکالا ملا، زیادہ تر نے محدود خطوں میں پناہ لی۔ اردو ہندوستان کی لسانی تاریخ میں وہ اہم موڑ ہے جس نے ابتدا میں تو محدود مقام پر پڑاؤ کیا لیکن اس نے صمیم قلبی سے اپنا سفر جاری رکھا اور علاقائیت کی حدود کو توڑتے ہوئے ملک گیر پیمانے پر اثر و تاثر سے اپنا ہیولیٰ تیار کیا۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ و ملتان نے یہ دعویٰ کیا کہ اردو ہماری ہے تو پنجاب، برج دیس، مگدھ، نواح دہلی اور دکن والوں نے بھی اپنی دعویداری برقرار رکھی۔ ہندوستان کی جدید لسانی تاریخ میں اردو کے علاوہ کسی کو یہ منصب حاصل نہیں ۔دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد اپ بھرنش کے بعد اردو ہی وہ زبان ہے جسے پورے برصغیر کی لنگوا فرینکا کہلانے کا حق حاصل ہے۔

عہد اپ بھرنش میں مہاراشٹری، شورسینی، پشاچی، ماگدھی اور اردھ ماگدھی کے علاوہ ناگر، اپ ناگر اور پراچڈ اپ بھرنشوں کے علاقائی وجود سے کسی کو انکار نہیں۔ ان میں سے مہاراشٹری اور شورسینی کو لنگوا فرینکا کی حیثیت حاصل رہی۔ شورسینی نے راجپوت راجاؤں کے زمانے میں کافی اہمیت اختیار کر لی تھی بلکہ زیادہ تر جدید ہند آریائی زبانیں اسی کی کوکھ سے پیدا ہوئیں۔ جن میں سے اردو بھی ایک ہے۔ شورسینی اپ بھرنش کا یہ کارنامہ کبھی بھلایا نہیں جاسکتا۔ لیکن وقت کی آندھیوں نے اسے قصۂ پارینہ بنا دیا۔ مگر اردو نے اپنی ماں کے دودھ کا حق ادا کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر درباروں کا دروازہ کھٹکھٹایا تو بادشاہ، امیر، وزیر اور بیگمات حیران و ششدر ہی نہیں ہوئے بلکہ اسے گود لینے پر مجبور ہو گئے۔ خانقاہوں میں پہنچی تو ہر فقیر نے اپنے کاسے اور جھولی میں ڈال کر اس کی پرورش کی۔ بازار میں پہنچی تو سبھی نے اسے جنس نفیس کی طرح رکھا اور اپنی روح کو تازگی بخشی۔

روح کو تازگی بخشنے اور بادشاہوں کے سر چڑھ کر بولنے والی اس ہندوستانی زبان نے عربوں، ترکوں، ایرانیوں، افغانیوں کو ہی متاثر نہیں کیا، بلکہ ڈچوں، پرتگالیوں، فرانسیسیوں اور انگریزوں کو بھی اپنے دامِ گرفت میں لے لیا۔ ہندوستان کی ملکاؤں سے لے کر انگلستان کی ملکہ تک کو اس نے عزت بخشی۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے اردو نے لگ بھگ ایک ہزار سال کا تاریخی سفر طے کیا۔ اس سفر کے دوران بادشاہوں اور وزیروں نے کبھی کبھی اس سے ناراضگی کا اظہار بھی کیا، لیکن اس نے اپنا دل چھوٹا کرنے کے بجائے اپنے آپ کو صیقل کر کے بہتر سے بہتر کیا اور اپنا لوہا منوا کر رہی۔ عوام نے اس پورے تاریخی سفر میں اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ ہاں عالموں مثلاً حاتم و ناسخ نے ضرور تراش خراش اور قطع و برید و جراحی کا عمل اس کے ساتھ جاری رکھا جو اس کے حق میں کبھی مفید اور کبھی مضر ثابت ہوتا رہا۔ تاہم اس کی توانائی کبھی مجروح نہیں ہوئی۔

اردو کی توانائی کا اندازہ ہندوستان کی تاریخ (تاریخ محض سیاسی نہیں ہے) کے محض چند واقعات سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ مثلاً صوفیوں، سنتوں نے جن کا سلسلہ ہندوستان کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پھیلا ہوا تھا انھوں نے محبت و اخوت، مذہبی رواداری اور انسانیت وغیرہ کے پیغام کا بیڑا اٹھایا تو خواہ وہ دلی مثلاً (امیر خسرو، نظام الدین اولیا) ملتان و پنجاب (بابا فرید گنج شکر، گرو نانک) مہاراشٹرا (نامدیو) بہار و بنگال (احمد یحییٰ منیری) اودھ (عبدالقدوس گنگوہی) اور گجرات (بندہ نواز گیسو دراز، شیخ احمد گجراتی) وغیرہ کہیں سے بھی اٹھے ہوں۔ انھوں نے عوام تک اپنی باتیں پہنچانے کے لیے جس زبان کا سہارا لیا وہ اردو ہی ہے۔ حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے

کہ جس زمانے میں اردو محض رابطے کی زبان تھی اسی زمانے میں اس کی توانائی کو دیکھتے ہوئے صوفیا حضرات نے اس میں تصوف کے ادق مسائل اور مابعد الطبیعاتی تصورات کو جذب کر کے اسے اہم زبان کا درجہ دے دیا تھا۔ اگر تاریخ کے اس واقعہ کو وسعت دیں تو ایک دفتر بن جائے گا جس کا نہ یہاں مقام ہے اور نہ ہی وقت۔

دوسرا سب سے اہم واقعہ جس سے اردو کی تاریخی اہمیت واضح ہوتی ہے وہ محمد بن تغلق کی تبدیلی دارالسلطنت سے جڑا ہے جو 1326 میں واقع ہوا۔ تغلق نے ایک سال کے اندر ہی دولت آباد سے دوبارہ اپنی راجدھانی دہلی منتقل کر لی۔ نتیجتاً دکن نے خود مختاری کا اعلان کر دیا، 1347 میں دکن خود مختار ہوا، تو سب سے اہم مسئلہ سرکاری دفاتر کے کام کاج کی زبان کا پیدا ہوا۔ کیونکہ بہمنی سلطنت کا علاقہ مراٹھی اور کنٹر کے علاوہ مختلف ذیلی شاخوں کی کٹر بولیوں سے گھرا ہوا تھا۔ ایسے میں اردو نے سرکاری دفاتر اور امور کو انجام دینے کی ذمے داری قبول کر کے اہم تاریخی کارنامہ انجام دیا اور بقول خافی خاں بہمنی سلطنت کی سرکاری زبان ہندوی تھی۔

1401 میں صوبہ دار ظفر خان نے گجرات میں خود مختاری کا اعلان کیا تو گجرات میں بھی اردو نے بین الاقوامی رابطے کی زبان کا کام انجام دیا اور وہاں گجراتی اردو کے نام سے پروان چڑھتی رہی۔ بہمنی سلطنت کے ملبے پر پانچ ریاستوں نے جن کا نام بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، بیدر اور برار ہے، اپنی اپنی حکومت قائم کی۔ فرشتہ کی تاریخ میں لکھا ہے کہ بیجاپور میں اردو سرکاری زبان قرار دی گئی۔ یوسف عادل شاہ نے اردو کی جگہ فارسی کو دی تو ابراہیم عادل شاہ نے شاہی دفتروں کو پھر سے اردو میں کر دیا۔ تاریخ فرشتہ بھی اس کی تصدیق کرتی ہے اور خافی خاں بھی اس کی ہمنوائی کرتا ہے۔ ابراہیم عادل شاہ کے بعد علی عادل شاہ نے فارسی کو پھر سے دفتری زبان قرار دیا۔ جب ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف بہ جگت گرو (1627-1585) نے حکومت سنبھالی تو اردو کو پھر سے دوبارہ دفتر میں رائج کر دیا۔ عادل شاہی دور کے بعد قطب شاہی خاندان تخت پر بیٹھا تو اس نے اس زبان کو نہ صرف اہم سمجھ کر اس کی پرورش و پرداخت کی، بلکہ اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ محمد قلی قطب شاہ اس کا پہلا صاحب دیوان شاعر ہوا۔ قلی قطب شاہ کی زندگی کا اگر کوئی مطالعہ کرنا چاہتا ہے تو اس کی اردو شاعری سے بہتر اس کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر

ہندوستان کی جدید لسانی تاریخ میں اردو کے علاوہ کسی کو یہ منصب حاصل نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ عہد اپ بھرنش کے بعد اردو ہی وہ زبان ہے جسے پورے بر صغیر کی لنگوا فرینکا کہلانے کا حق حاصل ہے۔

نے جب شمال اور جنوب کو ایک کر دیا، اس زمانے میں اردو نے سب سے اہم تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے اور فارسی جو دربار و سرکار کی زبان کے ساتھ ساتھ عالموں، شاعروں اور ادیبوں کی محدود زبان تھی اس وقت اردو نے بین الاقوانی زبان کی حیثیت سے تمام ملک کو ایک مضبوط رسی میں باندھنے کا کام کیا۔ 1707 سے لے کر 1857 تک مغلیہ سلطنت روبہ زوال رہی۔ لیکن اس زمانے میں اردو نے اپنی تہذیبی قوت کے ساتھ تمام ملک کو جوڑے رکھا اور ہند اسلامی یا ہند ایرانی تہذیب کی پرورش کا ذمہ اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ آگے چل کر انگریزوں نے ہندوستانی تہذیب کو سیکھنے اور جاننے کی غرض سے جب اردو کا مطالعہ کیا تو اردو کو بہت ہی طاقتور زبان سمجھ کر اس کی آبیاری شروع کر دی اور اس میں ہر طرح کے مضامین کو ڈھالنے اور سمو لینے کی قوت والی زبان سمجھ کر اپنا لیا یہی وجہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج قائم کرنے سے پہلے ہی انگریزوں نے اپنے مذہب علم وفکر کو اس زبان میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس کا سب سے بڑا علم بردار ڈاکٹر جان گلکرسٹ ثابت ہوا، یہ اردو زبان ہی کی قوت تھی کہ ہندوستان میں ورنا کولر ٹرانسلیشن سوسائٹی قائم ہوئی تو خاص طور سے قدیم دلّی کالج میں تمام عصری علوم کو اردو میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ اردو زبان کی ہی قوت تھی جس نے انگریزوں کے بنائے ہوئے Constitution of India کا ترجمہ تعزیرات ہند کے نام سے کروایا۔ اسی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے انگریز جیسی فاتح قوم نے بھی اردو کو ہی سرکاری زبان بنایا۔

1857 میں ہندوستان نے پہلی جنگِ آزادی کا اعلان کر دیا، اس زمانے میں جس زبان میں ہندوستانیوں میں اشتراک واتحاد پیدا کرنے کی ٹھانی وہ اردو ہی ہے، ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں کا کوئی بھی نعرہ کوئی بھی جلسہ اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں اردو زبان ہی دکھائی دے گی۔ لیکن آزاد ہندوستان میں صرف ایک ووٹ نے جو ہمارے پہلے صدر جناب ڈاکٹر راجیندر پرساد کا تھا، اردو کی قسمت کا ستارہ بدل دیا، تاہم آج بھی اگر ہندوستان کی تمام جدید ہند آریائی زبانوں کا جائزہ لیا جائے تو اس میں اردو ہی ملک گیر ملتی ہے، اور سب سے زیادہ اپنے دامن کو وسیع کر کے کہہ رہی ہے کہ میں وہ ہوں جس نے عربوں اور ایرانیوں کے فخر کو توڑا۔ میں وہ ہوں جس نے انگریزوں کے تاج وتخت کو چکنا چور کیا، میں وہ ہوں جس نے سارے ہندوستان کو ایک دھاگے میں پرو دیا، میں وہ ہوں جس کے پروانے سر کٹانے سے نہیں تھکتے ، لیکن میں ان کی قربانیوں کو رائیگاں جانے نہیں دیتی۔ مجھ پر ایک پروانہ قربان ہوتا ہے تو میں سیکڑوں پروانوں کو زندگی بخشتی ہوں۔ مجھ سے سرکار و دربار ناخوش ہوں تو میں گلی کوچوں میں پروان چڑھنے والی فکر کو تازگی بخشتی ہوں۔ یہ میں نے تب بھی کیا ہے جب فارسی دربار کی زبان تھی اور عالموں نے اپنی شان کو برقرار رکھنے کے لیے مجھ سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کی۔ لیکن نہ تو وہ میرے بغیر سوچ سکتے تھے اور نہ ہی خواب دیکھ سکتے تھے، اس لیے انھیں قدم قدم پر میری ضرورت پڑتی تھی، خواہ بابر کے زمانے کے مشہور فارسی شاعر شیخ جمالی کنبوہ (وفات 1535) ہوں یا اکبر کے زمانے میں مشہور فارسی قصیدہ 'سرد وگرم زمانہ' لکھنے والے عشقی خاں عشقی رہے ہوں۔ شاہ جہاں کے زمانے میں تو شاہی ملازمتیں میری دین تھیں۔

آج تو میرا دامن بہت وسیع ہو گیا ہے۔ میں برصغیر سے نکل کر یورپ وافریقہ اور امریکہ کو اپنے دامن میں ان کی نئی نئی تکنیک اور نئی لغات کے ساتھ خوشی خوشی پناہ دے کر تاریخی کارنامے انجام دے رہی ہوں۔

کتابیات:

قدیم اردو ادب کی تاریخ : محمد حسن
مقدمہ تاریخ اردو : مسعود حسین خاں
اردو کی ابتدائی نشوونما میں
صوفیاء کرام کا کام : مولوی عبدالحق
تاریخ ادب اردو : جمیل جالبی

■

Dr Mohd Noorul Haque, Head Dept of Urdu, Bareilly College, 243001UP-Bareilly

ذکی انور

چاند نزدیک ہے

''میں برگد کا ایک درخت ہوں۔'' برگد نے سینہ تان کر کہا، میرا موڈ اچھا نہیں تھا میں نے صرف ''ہوں'' کر دی۔ اس نے پھر کہا۔

''میں بہت پرانا برگد ہوں۔''

''ہو گے۔'' میں نے پھر بے دلی سے کہا۔ لیکن یا تو وہ اپنی دھونس جمانے پر تلا ہوا تھا یا پھر مجھے دق کرنے پر۔ اس نے پھر کہا۔

''اشوک کو جانتے ہو؟''

''ہاں'' میں نے کہا۔ ''اشوک کمار فلم اسٹار کو۔''

''میں شہنشاہ اشوک کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔'' وہ بولا۔ ''فلموں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، تم نے کبھی مجھے فلم دیکھتے ہوئے دیکھا ہے۔

''نہیں۔ لیکن تم درخت ہو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے پھر فلم کیسے دیکھو گے؟'' میری بات کو اُس نے وار سمجھا اور سینہ تان کر کہا

''میں درخت ہوں تو کیا ہوا، میں عظیم ہوں۔ جب تم شہنشاہ اشوک کو جانتے ہو تو بدھ کو بھی جانتے ہو تو بدھ کو بھی جانتے ہو گے۔ یعنی گوتم بدھ کو، جانتے ہو! گوتم بُدھ کو میرے ہی سائے میں معرفت حاصل ہوئی تھی۔''

''ہوئی ہو گی۔'' میرا موڈ آف ہو گیا، کیونکہ سامنے کے قبرستان کی طرف ایک جنازہ جا رہا تھا۔ میں سوچنے لگا آدمی مرتا کیوں ہے۔ برگد جو دل کی بات بھانپنے میں ماہر تھا میرے دل کی بات بھانپ کر بولا۔

''میں برگد ہوں۔ میں کبھی نہیں مروں گا۔''

''میں انسان ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے فرشتوں نے سجدے کیے ہیں۔ مجھے تاؤ آنے لگا تھا۔

وہ بڑے زور سے ہنسا۔ اتنی زور سے کہ آندھی آ گئی، اور پھر بارش شروع ہو گئی۔ قبرستان ابھی دور تھا۔ چنانچہ جنازہ لے جانے والے بھاگ کر آئے اور برگد کے نیچے ٹھہر گئے، پھر چار آدمی جنازہ لیے بھی آ پہنچے۔ تب برگد نے مجھ سے کہا۔

''قبلہ آپ یہ جنازہ دیکھ رہے ہیں؟''

میں سمجھ گیا، وہ مجھ پر طنز کر رہا تھا کہ انسان کو مرنے کے بعد بھی میرے سائے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے غصّے سے کہا۔ ''ہاں دیکھ رہا ہوں اندھا نہیں ہوں۔''

''آج پہلی بار میں نے سُنا ہے تم اندھے نہیں ہو۔'' وہ پھر زور سے ہنسا اور بارش اور بھی تیز ہو گئی۔ ہوا اور بھی تند ہو گئی اور پھر جنازے کا کفن ہوا کے ایک تیز جھونکے سے ایک طرف سرک گیا۔ مردے کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔ وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن لبوں پر اب تک مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ لب مردہ تھے لیکن مسکراہٹ زندہ تھی۔

برگد نے پھر میرے دل کی بات بھانپ لی اور بولا۔

''تم کہانیاں لکھتے ہو، پھر بھی نہیں جانتے کہ مسکراہٹ کبھی نہیں مرتی۔''

''جانتا ہوں۔'' میں چڑ سا گیا۔

اور وہ بھانپ گیا کہ میں چڑ رہا ہوں۔ چنانچہ اس نے نرمی سے کہا۔

''خیر چھوڑو ان باتوں کو، مجھے اس حسین لڑکی کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس لڑکی کے بارے میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا کہ یہ حسین لڑکی تھی جو مر گئی ہے۔''

''مجھے یہ بتاؤ اس کی موت کیسے واقع ہوئی؟'' برگد نے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے جواب دیا۔

''اچھا میں اس لڑکی سے پوچھتا ہوں۔'' اس نے کہا اور جنازے کے ٹھیک اوپر کی کچھ ڈالیاں ہوا کے جھونکے سے

کچھ اس طرح ایک طرف ہو گئیں کہ جنازے پر پانی کی بوندیں گرنے لگیں۔

لڑکی آنکھیں ملتی ہوئی اُٹھ بیٹھی۔ لیکن اسے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے میرے اور برگد کے علاوہ اور کسی نے نہیں دیکھا۔

لڑکی نے اپنے گردوپیش نظر دوڑائی پھر مجھ سے بولی۔

''کیا آپ میری کہانی لکھیں گے؟''

''سردست کوئی ارادہ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''زندوں ہی کی کہانیاں لکھنا چاہوں تو ساری زندگی لکھتا رہوں اور مردوں کے جھمیلے میں کون پڑے۔''

''پھر تم نے مجھے زندہ کیوں کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''میں نے تمھیں زندہ نہیں کیا۔'' میں نے جواب دیا۔

''پھر کس نے یہ گستاخی کی ہے؟'' اس کے ابرو تن گئے۔

''میں نے۔'' برگد بولا اور لڑکی سہم گئی۔

''کیا تم نے مجھے پہچان لیا ہے؟'' وہ کانپ رہی تھی۔

''ہاں'' برگد نے جواب دیا۔

''تو مجھے مار دو۔'' لڑکی گڑگڑائی۔ ''میں نہیں چاہتی کہ کوئی مجھے پہچانے۔''

اور لڑکی پھر لیٹ گئی۔ لیکن اب تک وہ زندہ تھی اور تابوت پر پڑی پھٹی پھٹی نظروں سے برگد کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''قبلہ آپ نے اس لڑکی کو پہچانا، جو انسان ہے اور جسے فرشتوں نے سجدے کیے ہیں اور جو مر گئی ہے۔؟'' برگد نے پھر طنز کیا اور اس وقت اگر میرے ہاتھ میں کلہاڑا اور بازوؤں میں اتنی طاقت ہوتی تو میں اسے کاٹ کر گرا دیتا۔ اس نے پھر میرے دل کی بات بھانپ لی اور مسکرانے لگا۔ دیر تک مسکراتا رہا پھر بولا۔

''تمھاری کوشش کارگر نہیں ہو سکتی۔ میں تو مر جاؤں گا لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ حقیقتیں بھی مسکراہٹ کی طرح امر ہوتی ہیں وہ مر نہیں سکتیں۔'' اب غصّے سے میرا بُرا حال تھا۔ میں نے کہا۔ ''تمھارے کہنے کا مطلب شاید اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ تم انسان سے بڑے ہو۔''

اس نے کائی جواب نہیں دیا۔ صرف ہنسنے لگا۔

لڑکی پھر اُٹھ بیٹھی اور اس نے آنکھوں کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بُلا کر کہا۔ ''تمھیں فخر ہے کہ تم راکٹ پر بیٹھ کر چاند پر جانے کو تیار ہو۔ لیکن ہار مان لو۔ انسان کی سب سے حقیر ترین تخلیق ہے۔ یہ بڈھا کھوسٹ برگد سب کچھ جانتا ہے اور میں بھی مانتی ہوں۔ تم بھی ہار مان لو۔ ورنہ تم پدرم سلطان بود کرتے مر جاؤ گے اور تمھاری کہانیوں میں حقیقت کا فقدان رہے گا۔ ہار مان لو۔''

وہ بہُت خوبصورت لڑکی تھی اور خوبصورت لڑکیوں پر مجھے غصّہ نہیں آتا۔ لیکن مجھے اس پر غصّہ آیا اور میں نے چیخ کر کہا۔

''بکواس بند کرو، میں زندوں سے بھی نصیحتیں سننے کا عادی نہیں اور تم تو ایک بے جان ہستی ہو۔ اپنا کام کرو اور تمھارا کام سرِ دست اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ تم مر جاؤ۔''

لڑکی مر گئی اور اس کے لب مر گئے۔ لیکن لبوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ بدستور زندہ رہی اور برگد نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی۔

اس وقت بھیگا ہوا ایک کوّا کسی طرف سے آیا اور برگد کی ایک ٹہنی پر بیٹھ گیا اور قائیں قائیں کرنے لگا۔

برگد نے کہا۔ ''میرے دوست یہ انسانی لاش ہے جلا دی جائے گی یا دفن کر دی جائے گی، تم گوشت نہیں کھا سکو گے انسان بہت عظیم ہوتا ہے اسے ملائک نے سجدے کیے ہیں چنانچہ اس کی لاش کوّے نہیں نوچ سکتے۔''

میں سمجھ گیا وہ پھر مجھ پر طنز کر رہا تھا۔ لیکن میں صرف غصّہ پی کر رہ گیا۔

کوّا کہنے لگا۔ ''واہ تم کچھ نہیں جانتے۔ ایک زمانے میں بنگال میں انسانی لاشوں سے سڑکیں پٹی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ وہاں لوکل کوّے اور چیلیں کھا نہیں پاتی تھیں۔ چنانچہ میرے ایک دوست نے خط لکھ لکھ کر مجھے اور ہزاروں باہر کے کوّوں کو بُلا لیا تھا۔ پھر ہندو مسلم فساد کے زمانے میں مت پوچھو! اور بھی افراط تھی لاشوں کی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ گزشتہ باتوں پر کائیں کرنا فضول ہے۔ کیا تم اخبار نہیں پڑھتے؟ آئے دن جنگوں اور خانہ جنگیوں کی خبریں نہیں پڑھتے۔ کروڑوں انسان یوں ہی مارے جاتے رہتے ہیں اور اُن کی لاشیں نہ جلائی جاتی ہیں نہ دفن کی جاتی ہیں۔ بلکہ ہمارے کام آتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔''

کوّا اب غالباً کسی جنگ کا واقعہ سُنانا چاہتا تھا کہ برگد نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''اچھا میاں کوّے ایک بات تو بتاؤ۔ تم میں سے کوئی بھی بھوکا مرا ہے۔۔۔۔۔۔؟''

''تمھاری قوم کی کسی جوان لڑکی کو اپنے باپ کا علاج کرانے کے لیے اپنی جوانی اور حُسن کا سودا کرنا پڑا ہے؟''

''کائیں۔۔۔۔۔۔ کائیں ۔۔۔۔۔۔ کائیں۔۔۔۔۔۔ کائیں ۔۔۔۔۔۔'' کوّا حیرت سے برگد کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ''یار یہ جوانی اور حسن تو سمجھ میں آنے کی باتیں ہیں، لیکن یہ علاج اور سودا وغیرہ کا چکّر اپنے پلّے نہیں پڑ سکا۔''

''گولی مارو'' برگد بولا۔ ''یہ بتاؤ تمھاری قوم میں کسی لڑکی کے ساتھ یہ حادثہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ کسی جوان کوّے نے کسی جوان کوّی کو محبت کا فریب دیا ہوگا اور وہ کوّی اُس کے فریب میں پھنس کر ایک گھنے برگد کے سائے میں آ گئی ہوگی اور کوّا اور کوّی نے اندھیرے میں عہد وفا کیا ہوگا اور پھر کوّے نے کوّی کی محبت کو نوچ ڈالا ہوگا اور پھر کوّی کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہوگا اور کوّی بے چاری۔۔۔۔۔۔۔۔''

''مولانا'' کوّے نے بوکھلا کر کہا۔ ''یا تو آپ کا دماغ خراب ہے یا پھر آپ مجھے پاگل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''نہ میں پاگل ہوں اور نہ ہی تم کو پاگل بنانا چاہتا ہوں۔'' برگد نے کہا۔ ''لیکن میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک یہ پاگل انسان، یہ پاگل کہانی کار یہاں بیٹھا رہے گا اور چاند پر جانے کے منصوبے بناتا رہے گا اور سوچتا رہے گا کہ'' میں وہی ہوں کہ جسے ملائک نے کیے ہیں سجدے''۔ میں ہر کسی سے یہ سب کچھ پوچھتا رہوں گا جو تم سے میں نے پوچھا۔ پھر ایک عقاب آ کر بیٹھے گا اس سے پوچھوں گا۔ پھر کوئل سے۔ پھر پپیہے سے۔ پھر ایک گیدڑ سے جو میرے ایک تنے کے ایک خول میں آ کر بیٹھا کرتا ہے۔ پھر کسی آوارہ کتّے سے باتیں کروں گا۔ پھر کسی اُلّو سے جو بارش تھمتے ہی یہاں آئے گا۔ یہاں تک کہ وہ دیکھو ایک گدھا بھاگا آ رہا ہے۔ یقیناً میرے سائے میں پناہ لے گا۔ میں اُس سے بھی یہی کچھ پوچھوں گا۔''

فائدہ؟'' کوّے نے پوچھا۔

لیکن برگد نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف ہنس کر رہ گیا۔

تب ہی وہ لڑکی زندہ ہو کر پھر اُٹھ بیٹھی۔

اور میں یہ دیکھ کر چونک گیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس نے پھر اشارے سے مجھے پاس بُلایا اور پھر نہایت ہی سرگوشی سے کہنے لگی۔

''یہ بڈھا برگد پاگل ہو گیا ہے، یوں ہی اُٹ پٹانگ باتیں کرتا ہے۔ تم بھاگ جاؤ ورنہ تمھیں بھی پاگل بنا دے گا۔ میں اس کم بخت کو ایک عرصے سے جانتی ہوں۔ کتنی راتیں میں نے اس کے گھنے سائے میں گزاری ہیں۔ لیکن پھر بھی میرا باپ مر گیا۔''

وہ سسکیاں لینے لگی اور میں واپس ہی ہونے کو تھا کہ اس نے پھر نہایت ہی التجا سے میری طرف دیکھا اور جیسے گڑگڑانے لگی۔

''میرے محبوب سے ملنا اور اُس سے کہنا کہ میں اُس کا گناہ اپنے ساتھ لیے اس دنیا سے نکل چکی ہوں۔ اب اُسے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تب بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی اور اب تو میں ایک بے جان ہستی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ بس تم جاؤ میں پھر مر جاتی ہوں۔''

وہ پھر مر گئی۔

اور جس وقت ایک گدھا اس برگد کے نیچے آ کر رکا میں بھیگتا ہوا واپس ہو رہا تھا اور برگد بڑے زور و شور کا قہقہہ لگا رہا تھا اور بارش اور بھی تیز ہو گئی تھی اور ہوا کے جھونکے اور بھی تند ہو گئے تھے۔

(ماہنامہ 'صبا' حیدرآباد، جولائی، اگست 1960)

'چاند نزدیک ہے' کا تجزیہ

اختر آزاد

زکی انور (پیدائش: 16 جون 1924، موت: 11 اپریل 1979) نے تقریباً 500 افسانے، 27 ناول اور 100 سے زیادہ ڈرامے لکھے۔ دنیا میں پہلی بار اتنے بڑے کسی ادیب کے ساتھ ایسا ہوا تھا کہ انھوں نے اپنے کنویں سے جس کے گھر کی آگ بجھائی تھی اسی پڑوسی نے انھیں زندہ جلا کر اسی کنویں میں ڈال دیا تھا۔ بربریت کی ایسی دوسری مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی ہے اور یہ سب تب ہوا تھا جب ہندو مسلم اتحاد کے لیے جمشید پور میں بھوک ہڑتال کی تھی اور امن سے جلوس گزر جانے کے لیے دونوں فریقین سے گزارش کی تھی۔ لیکن انھیں کیا معلوم تھا کہ دونوں طرف کے کچھ لوگ مخالفت پر اُتر آئیں گے اور امن کی خاطر کی گئی یہی ہڑتال موت کا سبب بن جائے گی۔

زکی انور کا شمار ترقی پسند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ویسے اُنھوں نے رومانی تحریر سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ تجربہ، مشاہدہ، اور مطالعہ بڑھا تو حقیقت نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ پھر آگے چل کر انھوں نے اپنے لیے الگ ڈگر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مقصدی ادب سے نکل کر فطری ادب کی طرف بڑھے۔ آخر دم تک اسی راستے پر ہی چلتے رہے۔ لیکن اس عرصے میں وہ جدید رجحان سے کبھی متاثّر نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کا شمار جدیدیت کے کٹّر مخالفوں میں ہوتا رہا۔ وہ اس رجحان کو ادب کے لیے سب سے بڑا خطرہ مانتے تھے اور کسی بھی قیمت پر حمایت کے لیے تیار نہیں تھے۔ لیکن اچانک اُن کے اندر تبدیلی رونُما ہوئی اور اُنھوں نے اس رجحان کو سمجھنے کی کوشش کی۔ سوچ و فکر کے مقفّل روزن کو وا کرنا چاہا۔ ان کی شخصیت ایسی تھی کہ وہ بے جا ضد پر اڑنے والے نہیں تھے۔ لہٰذا انھوں نے اس نہج پر سوچنا شروع کیا۔

"جدیدیت ہے کیا؟

اس ادب کا مقصد کیا ہے؟

کردار کی اہمیت سے کیوں انکار کیا جا رہا ہے؟

پلاٹ کے بغیر کہانی کیوں کر تخلیق پا سکتی ہے؟

ایسے کئی اور سوالات تھے جو اُنھیں پریشان کر رہے تھے۔ وہ اس رجحان کا مناسب جواب چاہتے تھے۔ جس کے لیے انھوں نے دوسروں کی مدد سے بھی گریز نہیں کیا۔ اس سلسلے میں عشرت کرتپوری اور محمد سالم کو کئی خطوط لکھے تاکہ جدیدیت کے منفی اور مثبت پہلوؤں کا علم ہو سکے۔ کس حد تک انھیں اپنے اس سوال کا جواب ملا یہ معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن ان کے افسانوں کی چھان بین کرنے کے بعد ان کے دو جدید افسانے 'چاند نزدیک ہے' اور 'نرمان' سامنے آئے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ زکی انور جو زندگی بھر ترقی پسند تحریک کے حامی رہے، مذکورہ بالا افسانے میں سے ایک افسانہ جدید لب و لہجہ میں اس وقت لکھا جب جدیدیت کی کونپلیں بھی صحیح سے پھوٹی نہیں تھیں۔

افسانہ 'چاند نزدیک ہے' ماہنامہ 'صبا' (حیدرآباد) جولائی اگست 1960 کے شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ جدیدیت کے سب سے بڑے حمایتی شمس الرحمن فاروقی کا رسالہ 'شب خون' کا پہلا شمارہ جون 1966 میں منظر عام پر آیا۔ یعنی یہ افسانہ 'شب خون' کی پیدائش سے تقریباً چھ سال قبل عالم وجود میں آ چکا تھا۔ جب بھی جدیدیت کی بات ہوتی ہے تو عموماً گفتگو کی شروعات 60 کے آس پاس سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن مثال کے لیے ہم رسالہ 'شب خون' کے افسانے کو ہی حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اگر اس رسالے سے باہر نکلیں تو بھی حوالوں میں جن افسانوں کا ذکر خاص ہوتا ہے۔ اس کا تعلق بھی 60 کے بعد کے افسانوں سے ہوتا ہے۔ یہاں چاہوں تو مثال کے طور پر کئی افسانوں کے نام گنوائے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہاں مقصد افسانوں کی فہرست سازی نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ جہاں جدید دور کے افسانوں پر گفتگو کرتے ہیں وہاں ہمارے ناقدین اس افسانے سے بے خبر کیوں ہو جاتے ہیں؟ کیا صرف اس لیے کہ اس کے خالق زکی انور ہیں، جنھوں نے پوری زندگی ترقی پسند تحریک کی حمایت کی اور جدیدیت کی مخالفت میں صفحات برباد کیے۔ اگر ایسا ہے تو ہم جدید افسانہ نگاری کے ابتدائی نقوش 'چاند نزدیک ہے' پر قصداً پردہ پوشی کر رہے ہیں۔ اس سے ہر ایماندار ناقد کو اجتناب برتنا چاہیے اور تخلیق کو اس کے منصب پر بٹھانا چاہیے۔

اس بات میں سچائی ہے کہ زکی انور نے اس افسانے کو جدید رجحان کے تحت نہیں بلکہ تجربے کے طور پر لکھا ہوگا۔ لیکن فارمیٹ وہی جدید افسانے کی اساس ہے۔ اس کا شمار ان کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے جب ان کے تقریباً پانچ سو افسانوں میں سے بیس افسانوں کا انتخاب 'زکی انور: جائزے اور افسانے' (اشاعت 2003، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی) شائع کیا تو ان کے اس افسانے کو بھی عزت بخشی۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اگر زکی انور اس طرز کے دس بارہ افسانے اور لکھ جاتے تو جدید افسانہ نگاروں کی صفِ اوّل میں شمار کیے جاتے۔

تو آیئے چاند کے کچھ اور قریب چلتے ہیں۔

لیکن اس افسانے کا چاند کے بجائے 'برگد' کو مرکزی

حیثیت حاصل ہے۔ برگد جو اپنی عظمت کے لیے، اپنی پُر وقار جسامت کے لیے، اپنی پھیلائی ہوئی شاخوں کی چھاؤں کے لیے، معرفت کی تلاش کے لیے اور زمین میں پیوست اپنی بے شمار شاخوں کی مضبوطی کے لیے جانا جاتا ہے، اُس طاقت کی علامت کے طور پر موجود ہے، جو دنیا کا خالق ہے اور سب کچھ اس کے قبضے میں ہے۔ وہ جیسا چاہتا ہے کرتا ہے۔ اُسے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ وہ کسی کی سنتا نہیں ہے اور نہ اُسے کسی کی پرواہ ہے۔ وہ لازوال ہے۔ اُسے اپنی عظمت اور جلال پر فخر ہے۔ اس لیے وہ افسانے کا 'میں' جو خود مصنف ہے، سے گفتگو کرتا ہے اور ابتدا میں ہی اپنا تعارف یہ کہہ کر کراتا ہے کہ ''میں برگد کا درخت ہوں... میں بہت پرانا برگد ہوں۔۔۔'' جس طرح سے سینہ پھلا کر برگد اپنی عظمت کا اعلان کر رہا تھا۔ افسانے کا 'میں' اسی تیور میں ''ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہو گے ۔۔۔۔۔۔۔۔'' کے طنز سے اس کے اندر کی ہوا نکالنا چاہتا ہے تاکہ وہ اُس پر اپنی دھونس نہ جما سکے۔

بات جاری رہتی ہے اور ایک بار پھر افسانے کے 'میں' سے، برگد اپنی دھونس جمانے کے لیے کہتا ہے۔ ''اشوک کو جانتے ہو'' اور جواب میں افسانہ نگار کا 'میں' کہتا ہے کہ ''ہاں! اشوک کمار فلم اسٹار کو''۔ لیکن برگد اس کے اس جواب سے برانگیختہ ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

''میں شہنشاہ اشوک کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔ فلموں سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم نے کبھی مجھے فلم دیکھتے ہوئے دیکھا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تم درخت ہو اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتے پھر فلم کیسے دیکھو گے؟'' میری بات کو اُس نے وار سمجھا اور سینہ تان کر بولا۔

''میں درخت ہوں تو کیا ہوا، میں عظیم ہوں۔ جب تم شہنشاہ اشوک کو جانتے ہو تو بدھ کو بھی جانتے ہو گے۔ یعنی گوتم بُدھ کو، جانتے ہو گوتم بُدھ کو میرے ہی سائے میں معرفت حاصل ہوئی تھی۔''

اس افسانے میں آگے یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ لوگ نہ صرف معرفت و سکون کی تلاش میں 'برگد' کی جانب رجوع کرتے ہیں بلکہ دنیا سے جانے والے بھی اُس کے محتاج ہیں۔ دونوں کی بحث و تکرار کے درمیان ایک جنازہ جا رہا ہوتا ہے۔ عین اُسی وقت موسم خراب ہو جاتا ہے اور جنازہ لے جانے والے لوگ بارش اور طوفان سے بچنے کے لیے اُس کے سائے میں آکر ٹھہر جاتے ہیں جنازہ کسی اور کا نہیں ایک خوبصورت لڑکی کا ہوتا ہے۔ جس کے لب مردہ تھے۔ لیکن مسکراہٹ زندہ تھی۔ خوبصورت لڑکی، بند آنکھیں، مردہ لب اور زندہ مسکراہٹ... ان تمام اشاروں کی ایک الگ ہی حیثیت ہے۔ اور الگ ترجمانی بھی۔ لڑکی حُسن کی علامت ہے۔ جس کا زوال ہے۔ بند آنکھیں اور مردہ لب موت ہے۔ جو حقیقت ہے اور زندہ مسکراہٹ روح ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے۔ افسانہ نگار نے زندگی کے اس فلسفے کو چند اشاروں میں بیان کر دیا ہے جو کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

افسانہ نگار بحث میں برگد سے اُلجھا ہوا ہے۔ وہ برگد کی ہر بات میں کوئی نہ کوئی سوال کھڑا کرتا ہے اور مناسب جواب پا کر لاجواب ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ جس سے محوِ گفتگو ہے وہ عظیم ہے اور ساری باتوں سے واقف ہے۔ وہ افسانہ نگار کو لڑکی کی روح سے ملواتا ہے۔ افسانہ نگار نہیں جانتا کہ وہ کون ہے۔ لیکن برگد لڑکی کے سارے بھید سے واقف ہے۔ کیوں کہ وہ لڑکی ہمیشہ اس کی چھاؤں میں آکر بیٹھا کرتی تھی۔ برگد اُس کے سارے کرموں کا شاہد ہے۔ وہ عظیم طاقت جو اس

افسانے میں وقت کا پرندہ اُڑتا اُڑتا برگد کی ٹہنی پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ برگد اس لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہتا ہے کہ یہ انسانی لاش ہے جسے فرستوں نے سجدے کیے ہیں، جسے جلایا یا دفن کیا جائے گا۔ لیکن تمھیں کھانے کے لیے نہیں ملے گا۔ تب وہ کوّا اپنی کائیں کائیں سے وقت کے اوراق پلٹنے لگتا ہے اور اُلٹتے اُلٹتے عظیم انسانوں کی انتہائی کریہہ اور مکروہ صورت دکھانے لگتا ہے اور افسانہ نگار کے 'میں' کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کیا واقعی انسان عظیم المرتبت ہے۔

دنیا کو چلاتی ہے۔ اسے روشنی اور تاریکی میں ہونے والے سارے حالات کا علم ہے۔ وہ ہر اُس بات سے باخبر ہے، جسے عام آدمی نہیں جان سکتا ہے۔ نہ سمجھ سکتا ہے۔ اُس نے اپنی قوت سے انسان کی تخلیق کی۔ مٹی سے بنے اس پتلے کے سامنے اپنے فرشتوں سے سجدہ کرا کر اُسے بڑی فضیلت سے سرفراز کیا۔ دنیا میں بھیج کر تمام مخلوق پر اوّلیت دی۔ اُسے اشرف المخلوقات ہونے کا شرف بخشا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود اُسے زوال بھی بخشا۔ اُس کی جان اپنے قبضے میں رکھی۔ خود کو عظیم کہنے والا انسان کس قدر بے بس ہے۔

اسی بحث و تکرار کے دوران برگد افسانہ نگار کے 'میں' سے لڑکی کی موت کا سبب پوچھتا ہے۔ وہ نہیں بتا پاتا ہے۔ لیکن برگد کا پیڑ یہ کہہ کر کہ میں لڑکی سے پوچھتا ہوں کہ اُس کی موت کیسے ہوئی، اپنی ڈالیاں اس کے اوپر جھکا دیتا ہے۔ پانی کی بوندیں جنازہ کے اوپر گرتی ہیں اور لڑکی اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور سامنے افسانہ نگار کو دیکھ کر سوچتی ہے کہ اسی نے مجھے زندہ کیا ہے شاید یہ کوئی کہانی لکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ پوچھتی ہے۔ ''کیا آپ میری کہانی لکھیں گے؟'' انکار کی صورت میں وہ دوبارہ پوچھتی ہے ''پھر تم نے مجھے زندہ کیوں کیا؟ پھر کس نے یہ گستاخی کی؟'' اس کے بعد برگد سامنے آتا ہے اور کہتا ہے کہ ''میں نے''۔ لڑکی اُسے پہچان لیتی ہے اور گڑگڑانے لگتی ہے کہ'' مجھے مار دو ۔۔۔۔۔۔۔ مجھے مار دو'' اور پھر وہ اپنی پہچان چھپانے کے لیے تابوت میں لیٹ جاتی ہے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے برگد کو دیکھنے لگتی ہے۔ برگد طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ افسانہ نگار کے 'میں' سے کہتا ہے کہ یہ لڑکی بھی وہ انسان ہے جسے فرشتوں نے سجدے کیے تھے، لیکن آج وہ مر چکی ہے۔ اس کی بات پر افسانہ نگار کو غصہ آجاتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ اگر اس وقت اُس کے پاس کلہاڑی ہوتی تو وہ برگد کو کاٹ کر گرا دیتا۔ وہ غصّے میں اس کے اہنکار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم انسان سے بڑے ہو۔۔۔۔۔۔؟ لیکن اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ اُس وقت وہ لڑکی تابوت میں اُٹھ کر بیٹھ جاتی ہے اور افسانہ نگار کے 'میں' کو اپنے پاس بُلا کر سمجھانے کے انداز میں کہتی ہے۔

''تمھیں فخر ہے کہ تم راکٹ پر بیٹھ کر چاند پر جانے کو تیار ہو۔ لیکن ہار مان لو۔ انسان کی سب سے حقیر ترین تخلیق ہے۔ یہ بڈھا کھوسٹ برگد سب کچھ جانتا ہے۔ اور میں بھی مانتی ہوں۔ تم بھی ہار مان لو۔ ورنہ تم پدرم سلطان بود کرتے مر جاؤ گے اور تمھاری کہانیوں میں حقیقت کا فقدان رہے گا۔ ہار مان لو۔''

انسان کی خواہشات بے پناہ ہیں چاند پر جا بسنے کی خواہش، کائنات کو تسخیر کرنے کا حوصلہ سب اپنی جگہ پر۔ لیکن خدا کی طاقت کے سامنے اس کا وجود گھاس پھوس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا بھلائی اسی میں ہے کہ اُس کی عظمت کا اعتراف کر لو اور اپنی شکست تسلیم کر لو، اسی میں بھلائی ہے۔ اتنا کچھ سمجھا کر لڑکی تو مر گئی، لیکن مسکراہٹ یعنی اُس کی روح باقی رہی۔

افسانے میں وقت کا پرندہ اُڑتا اُڑتا برگد کی ٹہنی پر آکر بیٹھ جاتا ہے۔ برگد اس لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہتا ہے کہ یہ انسانی لاش ہے جسے فرستوں نے سجدے کیے ہیں، جسے جلایا یا دفن کیا جائے گا۔ لیکن تمھیں کھانے کے لیے نہیں ملے گا۔ تب وہ کوّا اپنی کائیں کائیں سے وقت کے اوراق پلٹنے لگتا ہے اور اُلٹتے اُلٹتے عظیم انسانوں کی انتہائی کریہہ اور مکروہ صورت دکھانے لگتا ہے اور افسانہ نگار کے 'میں' کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ کیا واقعی انسان عظیم المرتبت ہے۔

''کوّا کہنے لگا... الخ... جوانی اور حسن کا سودا کرنا پڑے''

افسانہ نگار کی یہ کوشش یقیناً قابلِ ستائش ہے کہ وہ کوّے کی زبانی ہمیں اپنا ماضی دکھاتا ہے۔ ہمارے رویّے اور ہمارے کارنامے گنواتا ہے، جس میں کوئی قابلِ فخر بات نہیں

ہے۔ سوائے مذمت کے۔۔۔۔۔ بنگال کا ہولناک قحط اور اس قحط کے عوض پیدا ہونے والی تباہ کاریاں ہیں۔ انسان انسان کو نوچنے پر آمادہ ہے۔ آبرو کی ایسی نیلامی پھر نہ دیکھی گئی اور نہ ہی سُنی گئی بھوک سے مرتے لوگ، لاشوں سے پٹی گلیاں، سڑک، راستے، ہر طرف موت کی حکمرانی تھی۔ یہ وہ انسان تھا جسے اپنے اشرف ہونے پر بڑا فخر تھا کہ کوّے بھی اُس کا گوشت کھانے سے انکار کر رہے تھے۔ لیکن وہی انسان کس قدر بے حس ہے کہ اُس کا ذکر کرنا بھی فضول سمجھتا ہے۔ وہ اُسے یاد رکھنے، اُس سے سبق لینے کے بجائے اُسے بھلا دینے والی بات کرتا ہے۔

وقت کا پرندہ انسان کی اس ستم ظریفی پر ماتم کرتا دکھائی دیتا ہے۔ پھر وہ ہماری لاعلمی اور بے حسی کو کوس کر ہمیں ہمارے عہد میں لا کھڑا کرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ کیا تم اخبار نہیں پڑھتے۔ آئے دن فرقہ وارانہ فسادات اور اُس میں انسانوں کا خون، خانہ جنگی جو اپنے ہی لوگوں اور بھائیوں کے بیچ ہے اور سب اپنے ہی لوگوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ جان لینے اور دینے کے تقاضے اور رویّے دونوں بدل گئے ہیں۔ ایک طاقت ور ملک کمزور کو غاصبانہ نظروں سے دیکھتا ہے اور بزور قوت اُسے زیر کرتا ہے۔ انسانی قدروں کی پامالی کرتا ہے اور فتح کے عالم میں انسانی کشتوں پر جشن مناتا ہے کہ وہ کامیاب ہوئے ہزاروں کی تعداد میں لاشیں جنگ کے میدان میں پڑی سڑتی گلتی رہتی ہیں۔ بے کفن لاشوں کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ کوّے اور گدھ بھی اس جانب توجہ نہیں دیتے۔ کیوں کہ پیٹ پہلے سے بھرا ہوتا ہے۔

برگد، کوّے کو اور بھی اُلجھا کر رکھتا ہے۔ اس دوران وقت اور بھی تیزی سے گزرتا ہے اور اس سے بھی تیزی کے ساتھ انسان پستی میں گرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی عظمت پر فخر کرتا ہے۔ چاند کو پالینے کی خواہش اپنے سینے میں دبائے اُمید بھری نظروں سے آسمان کی جانب تکتا رہتا ہے۔

قدرت یہ سوال صرف انسان سے نہیں چرند پرند سب سے کرتی ہے کہ بتا عظیم کون ہے۔ میں یعنی خالق تو یعنی مخلوق ۔۔۔۔۔۔۔؟ برگد اور کوّے کی درمیان آگے بھی اسی طرح کی گفتگو جاری رہتی ہے۔ یہاں برگد کوّے سے کہتا ہے۔

"۔۔۔۔۔۔۔ یہ بتاؤ تمھاری قوم میں کسی لڑکی کے ساتھ یہ حادثہ تو ضرور ہوا ہوگا کہ کسی جوان کوّے نے کسی جوان کوّی کو محبّت کا فریب دیا ہوگا اور وہ کوّی اُس کے فریب میں پھنس کر ایک گھنے برگد کے سائے میں آ گئی ہوگی اور کوّا اور کوّی نے اندھیرے میں عہدِ وفا کیا ہوگا اور پھر کوے نے کوّی کی محبت کو نوچ ڈالا ہوگا اور پھر کوّی کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہوگا اور کوّی بے چاری۔۔۔۔۔۔۔"

برگد دراصل یہ ساری باتیں اس کوے سے نہیں کہہ رہا ہے۔ پسِ پردہ اُسے افسانہ نگار کے 'میں' کو سُنانا ہے اور کوّے کوّی کے بہانے اُس لڑکی کی موت کا قصّہ بھی قاری تک پہنچانا ہے۔ اس لیے افسانہ نگار نے اس قصّے کو نہایت ہی خوبصورتی کے ساتھ گڑھا ہے۔ لیکن اس قصّے کو سُننے کے بعد یا یہ کہا جائے کہ بے چاری کوّی کے بارے میں برگد کی طرف سے ایسے سوالات پوچھے جانے کے بعد کوّا اندر سے بھنّا جاتا ہے اور وہ جھلّا کر کہتا ہے۔ آپ اس طرح کی باتیں کر کے مجھے پاگل کر دیں گے۔ لیکن پاگل کر دینے کی بات کو برگد کس طرح لیتا ہے اور کس طرح جواب دیتا ہے۔ یہی دراصل ایک منجھے ہوئے فنکار کی علامت ہے:

"نہ میں پاگل ہوں اور نہ ہی تم کو پاگل بنانا چاہتا ہوں ۔۔۔ لیکن میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک یہ پاگل انسان، یہ پاگل کہانی کار یہاں بیٹھا رہے گا اور چاند پر جانے کے منصوبے بناتا رہے گا اور سوچتا رہے گا کہ "میں وہی ہوں کہ جسے ملائک نے کیے ہیں سجدے"۔ میں ہر کسی سے یہ سب کچھ پوچھتا رہوں گا جو تم سے میں نے پوچھا۔ پھر ایک عقاب آکر بیٹھے گا اس سے پوچھوں گا۔ پھر کوئل سے۔ پھر پپیہے سے۔ پھر ایک گیدڑ سے جو میرے ایک تنے کے ایک خول میں آکر بیٹھا کرتا ہے۔ پھر کسی آوارہ کُتّے سے باتیں کروں گا۔ پھر کسی اُلّو سے جو بارش تھمتے ہی یہاں آئے گا۔ یہاں تک کہ وہ دیکھو ایک گدھا بھاگا آ رہا ہے۔ یقیناً میرے سائے میں پناہ لے گا۔ میں اُس سے بھی یہی کچھ پوچھوں گا۔

عقاب، کوئل، پپیہے، گیدڑ، آوارہ کُتّے، اُلّو، گدھا۔ ان تمام الفاظ کے درون میں جھانکیں تو کچھ اور بھی سامنے آتا ہے۔

"عقاب" ۔۔۔۔۔۔۔۔ بہت بلندی پر اُڑنے والا پرندہ۔ اپنا شکار خود کرنے والا یعنی وہ طبقہ جو امیر بھی ہے اور طاقت ور بھی، اُس کی فیاضیاں بھی بڑی ہیں اور اُس کے ستم بھی انوکھے ہیں۔

"کوئل" ۔۔۔۔۔۔۔۔ اچھے اور نیک لوگ۔ اپنی گفتار کا جادو جگانے والے لوگ۔

"پپیہے" ۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنے لوگوں کو کبھی نہ بھولنے والے۔ اُن کی یاد ہمیشہ دلوں میں بسائے رکھنے والے لوگ۔

"گیدڑ" ۔۔۔۔۔۔۔۔ ڈرپوک، مکّار اور موقع پرست لوگ۔ جنھیں پہچاننا کچھ آسان کام نہیں۔

"آوارہ کُتّے" ۔۔۔۔۔۔۔۔ عیاش، اوباش اور بدکردار لوگ جن کی دانست میں انسان اور جانور کے درمیان کوئی تمیز نہیں۔ اُن کے کام اور اُن کی سوچ جانوروں سے بھی بدتر ہے۔

"اُلّو" ۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسے بہروپیے جو دن کے اُجالے میں کچھ، رات میں کچھ۔ ان کی ذات دوہری۔ اُن کی شخصیت دوہری۔ ان کی باتیں دوہری۔ غرض ہر وقت دوہری نیتی کا جال پھیلائے گھومنے والے لوگ۔

"گدھا" ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ایسے لوگ جن کی اپنی کوئی سوچ نہیں۔ اپنی کوئی مرضی نہیں۔ کوئی آزادی نہیں۔ اُن کا سب کچھ دوسروں کے اختیار میں ہے۔ غرض معاشرے کا وہ طبقہ جو اس عظیم طاقت کا اسیر ہے اور سارے تماشے بیٹھ کر دیکھ رہا ہے اور لوگوں کی قسمت کا فیصلہ خود کر رہا ہے۔

انسان کے متعلق وہی ایک سوال جسے برگد تمام جانوروں سے پوچھنا چاہتا ہے۔ لیکن کوّے کو اُس کی بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ خواہ مخواہ برگد سب سے کیوں پوچھے گا؟ پوچھنے کا فائدہ کیا ہے؟ جب وہ برگد سے پوچھتا ہے تب وہ اُس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا ہے۔ ہنس کر رہ جاتا ہے۔ اُسی وقت وہ لڑکی ایک بار پھر زندہ ہو کر تابوت میں بیٹھ جاتی ہے اور افسانہ نگار کے 'میں' کو پاس بُلا کر سمجھاتی ہے کہ وہ کسی مخمصے میں نہ پڑے۔ وہ اُسے بھاگ جانے کا صلاح دیتی ہے۔ لیکن جانے سے پہلے افسانہ نگار سے ایک وعدہ لیتی ہے اور کہتی ہے۔

"میرے محبوب سے ملنا اور اُس سے کہنا کہ میں اُس کا گناہ اپنے ساتھ لیے اس دنیا سے نکل چکی ہوں۔ اب اُسے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تب بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی اور اب تو میں ایک بے جان ہستی ہوں ۔۔۔۔۔۔ بس تم جاؤ میں مرجاتی ہوں۔"

افسانے کا انجام بہت پُر اثر ہے۔ افسانہ نگار نے ایک مرتبہ انسان کی عظمت کو بنائے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُس نے انسان کے اندر موجود خیر و شر کے دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ دیا ہے۔ اُس لڑکی کی صورت میں جو اپنے عاشق کی کرتوتوں، اُس کی بے وفائی کو اپنے سینے میں چھپائے اُسے نیک نامی اور خوشی سونپ کر اس دنیا سے جا رہی ہے۔ اُسے یقین دلانا چاہتی ہے کہ اُسے اپنے کیے پر نادم ہونے کی ضرورت نہیں۔ شرمندگی اُٹھانے کی ضرورت نہیں۔ وہ سارے داغ سمیٹے اس دنیا کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔

دوسری جانب افسانہ نگار خود ایک طرح سے اس حقیقت کو مان چکا ہے کہ وہ بہت کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں ہے۔ سب سے زیادہ طاقتور وہی ہے جس کے قبضے میں تیز ہوا، بارش، آگ، زندگی اور موت ہے۔ جو صرف ہمارے اور تمھارے نہیں بلکہ پوری کائنات کا مالک ہے۔

زکی انور کے اتنے اہم افسانے کو جدید وقت کی گرد نے ڈھانپ رکھا ہے۔ میرے خیال میں "چاند نزدیک ہے" کا شمار صرف زکی انور کے بہترین افسانوں میں ہی نہیں بلکہ جدید افسانوں کے نقشِ اوّل کے طور پر بھی ہونا چاہیے۔ ■

DR.AKHTAR AZAD, House No 38, Road No-1, Azad Nagar, Jamshedpur - 832110 (Bihar)

محمد بشیر مالیر کوٹلوی

افسانے میں کردار نگاری کی اہمیت

ماضی بعید میں قصہ گو کہانی بیان کرتا تھا۔ آغاز سے انجام تک پوری کہانی سناڈالتا یا صفحۂ قرطاس پر رقم کر دیتا تھا جس کو سن کر یا پڑھ کر لوگ محظوظ ہوتے تھے۔ وہ مکمل تصوراتی اور خواہشاتی اُڑانوں پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ پچھلی صدی کی پیدائش کے ساتھ ہی مغربی ہواؤں نے کہانی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ کہانی کو ڈرامائی انداز میں پیش کرنے کے رواج کی ابتدا ہوئی جو افسانے کی شکل میں بے حد مقبول ہوئی قارئین تصوراتی دنیا سے نکل کر اپنی حقیقی دنیا میں آ گئے۔ اپنے شب و روز کی طرف اپنی مشکلات اپنے مسائل کی طرف۔ افسانہ ایک خاص تکنیک کے ساتھ ہمارے سامنے نکھر کر آ گیا۔ افسانہ نگاروں نے واقعات اور حادثات کے بیان کو منظر نگاری کردار نگاری، جزیات اور مکالمہ نگاری سے آراستہ کیا۔ افسانے کے کردار کو شباہت، گیٹ اَپ نفسیات اور فطری زبان عطا کی۔ افسانے کے مطالعے کے دوران قاری محسوس کرنے لگا کہ وہ خود بھی اُسی ماحول میں سانس لینے لگا ہے، جو افسانے میں بیان کیا جا رہا ہے۔ تحریر کیے گئے واقعات اور حادثات جیسے اُس کی کھلی آنکھوں کے سامنے رونما ہونے لگے ہیں۔ جی ہاں جی! قاری کی نظر آپ کی تحریر پر ہو اور اُس کے ذہن میں آپ کے بیان کے مطابق آپ کے افسانے کے مطابق انھیں واقعات کی فلم چل رہی ہو یہ ایک کامیاب افسانے کا وصف ہے۔ کرداروں کی جذبات نگاری ایسی ہو کہ ان کا دکھ درد آپ کے قاری کے دل میں جاگ اٹھے کرداروں کی گرمی سردی کا خوشی اور غم کا اثر قاری کے احساس پر ہو یہ اچھے اور کامیاب افسانے کی نشانی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ افسانے کو کامیاب بنانے میں کردار نگاری کا بہت اہم رول ہوتا ہے۔ کسی افسانے کا کرداروں کے بغیر آگے بڑھنا بہت مشکل ہے۔ کہانی کہہ لیجیے یا افسانہ اس کا براہِ راست تعلق انسانی زندگی سے ہے پھر افسانے کا تصور کرداروں کے بغیر کیسے کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے کردار اور افسانہ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ جہاں افسانے کے دیگر لوازمات مثلاً مشاہدات، منظر نگاری، زمان و مکان، مکالمہ نگاری وغیرہ بھرپور توجہ چاہتے ہیں وہاں کردار نگاری بھی کم توجہ نہیں چاہتی اگر آپ کی کردار نگاری میں تھوڑا سا کچا پن آ گیا تو افسانہ کمزور ہو جائے گا۔

کردار تین طرح کے ہوتے ہیں:

(1) مرکزی کردار
(2) ذیلی کردار (درمیانی اہمیت والے)
(3) سرسری کردار

مرکزی کردار زیادہ تر ایک ہی ہوتا ہے جو موضوع کے

لیے انتہائی اہم ہوتا ہے جس کے بغیر کہانی کا تخلیق کرنا ممکن نہیں ہوسکتا کیونکہ مکمل افسانہ اُسی کے گرد گھومتا ہے۔ مرکزی کردار دو بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ کہانی کی ضرورت کے مطابق قائم کیے جاسکتے ہیں۔ ایک بات عرض کرتا چلوں کہ موضوع کو لے کر جب آپ کے ذہن میں کہانی پکتی ہے تو کہانی خود کرداروں کو جنم دے دیتی ہے۔ آپ کو کچھ نہیں کرنا ہوتا، بس ان کرداروں پہ توجہ دے کر ان کی Requirments کو سمجھنا ہے اور پورا کرنا ہے۔ ان کے تعارف، گیٹ اَپ، فطرت اور زبان کو ذہن میں رکھ کر آگے بڑھنا ہے۔ ان کرداروں کو سنوارنا ہے۔ ان سے کام لینا ہے۔

ذیلی کردار درمیانہ روی کے ہوتے ہیں۔ یہ کردار ایک بھی ہوسکتا ہے۔ ایک سے زیادہ بھی ذیلی کرداروں کا تعلق مرکزی کرداروں سے ہونا قدرتی ہے۔ دوست بھائی بہن ماں باپ اور دوسرے رشتے دار جن کے تعارف کی زیادہ ضرورت بھی نہیں ہوتی مثلاً مرکزی کردار کی ماں، کو آپ ماں کے طور پر ہی اختتام تک یا جہاں تک اُس کردار کی ضرورت ہے پیش کر سکتے ہیں۔ پتا جی۔ بھیا۔ دیدی ایسے کردار ہوتے ہیں جن کا تعارف ان کا رشتہ ہی ہوتا ہے۔ ہاں فطری اشارے جزیات میں آنا ضروری ہیں مثلاً اُس کا باپ بڑا ظالم تھا اگر کہانی کی ضرورت کے مطابق مرکزی کردار یا جس سے اس کا تعلق ہو اُس سے سختی یا جبر دکھانا ہو، تو فطری اشارے ضروری ہیں۔ آگے چل کر جہیز مانگے گا، یا بچے سے مزدوری کروائے گا، یا اور کچھ تو جزیات میں ہم اشارہ دیں گے کہ باپ لالچی تھا۔ وغیرہ ذیلی کردار اگر گھٹاتے بڑھاتے بھی جائیں تو تھیم یا افسانے پر اُن کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ آیئے اب سرسری کرداروں کی بات کریں۔ سرسری کرداروں کا تعارف یہاں تک رہے تو زیادہ بہتر مثلاً گاؤں والے۔ محلے والے۔ پولیس والے۔ اسٹاف ممبر۔ سرسری کردار کہانی کی ضرورت کے مطابق قائم کیے جاتے ہیں جن کے عمل اور اظہار کی ضرورت کہانی میں بہت کم ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ سرسری کرداروں کے بغیر بھی کہانی آگے بڑھ سکتی ہے۔ کئی بار سرسری کردار بہت اہم بھی ہوتے ہیں مثلاً اگر آپ کا موضوع فرقہ وارانہ فساد ہے تو اس میں بلوائیوں کا ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ ان کے بغیر کہانی مکمل نہیں ہو پاتی۔ ان کی اینٹری اس قدر ضروری ہوتی ہے۔ بس اسی حد تک جہاں تک کہانی کی ضرورت ہو۔ سرسری کرداروں کے تعارف کی ضرورت نہیں ہوتی ہم اُنھیں اس طرح سے استعمال کر جاتے ہیں۔ جیسے، محلہ کے تمام لوگ خاموش تھے، ان میں سے ایک بولا۔ دوسرے نے یہ کہا۔ سرسری کرداروں کی افسانے میں ضرورت کے مطابق ہی ایک یا دو بار شمولیت ہوسکتی ہے۔ بس اُن کی حیثیت اور اہمیت کو مدِ نظر رکھنا ہوتا ہے۔ سرسری کردار حسب ضرورت عمل پیرا بھی ہوتے ہیں مکالمہ بھی ادا کرتے ہیں اور تاثر بھی چھوڑتے ہیں۔

ہمیں کردار نگاری میں سب سے زیادہ توجہ کرداروں کی تعداد پر دینی چاہیے۔ کرداروں کی تعداد بلا ضرورت بڑھانی نہیں چاہیے۔ کرداروں کی بھیڑ افسانے کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ زیادہ کرداروں کے درمیان قاری کا ذہن الجھ جاتا ہے۔ کئی بار وہ بھول جاتا ہے کہ کون سا کردار کیا ہے

فن کار کا افسانہ نگار کا حساس ہونا ضروری ہے۔ دوسروں کے دکھ پر آنسو بہانے والی فطرت ہونا شرط ہے۔ ویسے میرا ماننا ہے کہ نرم، حساس اور اپنے آپ کو کم تر سمجھنے والا ہی سچا فن کار ہوسکتا ہے۔ سخت اور آہنی فطرت کے لوگ فن کار بن جاتے ہیں فن کا ہوّا نہیں کرتے۔ فن خداداد صلاحیت ہے اور خدا کے دینے کا کوئی پیمانہ کوئی کسوٹی نہیں ہوتی۔

اور اس کا دوسرے کرداروں سے کیا رشتہ ہے کیا تعلق ہے؟ کس نے کیا کہا؟ اور کیوں کہا؟ چاہے آپ اپنے کرداروں کو نام اور تعارف پہلے ہی دے دیتے ہوں۔ زیادہ نام بھی ذہن میں نہیں سما پاتے۔ کرداروں کی بھر مار قاری کے ذہن میں پریشانی پیدا کر دیتی ہے اور قاری بہت جلد اکتا جاتا ہے۔ قاری کی اکتاہٹ آپ کے افسانے کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ کردار دو یا تین ہوں تو بہتر۔ ظاہر ہے کردار کم ہوں تو قاری کے ذہن میں اُن کی شناخت اور حیثیت بآسانی سما جاتی ہے وہ بھٹکتا نہیں۔ بلکہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ اُن کے مکالموں اور اعمال میں دلچسپی لیتا ہے۔ بہر حال افسانے میں ہمیں نمائندہ کرداروں کا تعارف ہی دینا چاہیے۔

کردار نگاری میں کرداروں کی جذبات نگاری بہت اہم مانی جاتی ہے۔ جذبات نگاری میں فن کار کے فن کی جھلک دکھائی دیتی ہے، جو جذبات نگاری کے فن کے ماہر ہیں وہ کردار کے جذبات کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ مان لیجیے آپ کے کسی کردار کا افسانے کے کسی موڑ پر جوان بیٹا، کسی حادثے میں مارا گیا، اُس کردار کی کیفیت اُس کا غم اگر آپ نے جذبات نگاری میں صحیح ڈھنگ سے پیش کر دیا تو قاری کی آنکھوں کا بھیگ جانا طے ہے۔ جواں سال بیوہ کی حالت پہ آپ کے الفاظ بین کرتے ہوئے نظر آنے چاہئیں۔ کسی غریب کی لاٹری لگ جائے اس کی حیرت اور خوشی کی انتہا آپ کے الفاظ میں سما جانی چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہو؟ جی!؟ سب سے پہلی شرط تو یہ ہے کہ فن کار کا افسانہ نگار کا حساس ہونا ضروری ہے۔ دوسروں کے دکھ پر آنسو بہانے والی فطرت ہونا شرط ہے۔ ویسے میرا ماننا ہے کہ نرم، حساس اور اپنے آپ کو کم تر سمجھنے والا ہی سچا فن کار ہوسکتا ہے۔ سخت اور آہنی فطرت کے لوگ فن کار بن جاتے ہیں فن کا ہوا نہیں کرتے۔ فن خداداد صلاحیت ہے اور خدا کے دینے کا کوئی پیمانہ کوئی کسوٹی نہیں ہوتی۔ میں شاید اصل موضوع سے بھٹک گیا۔ معاف کیجیے۔

اس سلسلے میں میرا مشاہدہ ہے کہ ایک اچھے افسانہ نگار کو اچھا اداکار ہونا بھی ضروری ہے۔ آپ ضرور حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں یہ کیا کہہ رہا ہوں؟ آیئے میں ثابت کرتا ہوں۔ بہترین اداکار وہی ہے جو اپنی اداکاری سے فلم بینوں کو رونے پر مجبور کر دے۔ ہم نے بہت لوگوں کو فلم کے دوران آنسو بہاتے دیکھا ہے۔ خاص طور پر حساس طبیعت کی عورتوں کو۔ اسی طرح بہترین اداکار کی اداکاری دیکھ کر ہم اپنی ہنسی نہیں روک سکتے۔ اچھا ویلن وہ ہی اداکار ہوتا ہے جس کی شکل دیکھ کر فلم بین گالیاں دینے لگیں۔ یہ سب اداکاری کے کمالات ہیں۔ یہ تبھی ممکن ہوتا ہے جب ایک اداکار اپنے رول میں اپنے کردار میں ڈوب جاتا ہے۔ جس کردار کی وہ اداکاری کر رہا ہوتا ہے اُس کردار کو جب اپنے اوپر اوڑھ کر اُس کا دکھ درد محسوس کرتا ہے۔ پھر وہ ایسی اداکاری کرتا ہے جیسے کردار کے دکھ وہ ذاتی طور پر خود بھوگ رہا ہے۔ اُس کے زخموں کی تکلیف وہ خود برداشت کر رہا ہے اس طرح وہ اپنی اداکاری میں واقعی حقیقت کا رنگ بھر دیتا ہے جو دیکھنے والوں پہ اثر انداز ہوتی ہے۔ بس ہی اسی طرح افسانہ نگار کو بھی یہ سب کرنا ہوتا ہے۔ اداکار اپنی اداکاری سے کردار کو زندہ کر دکھاتا ہے۔ افسانہ نگار اپنی کردار نگاری اور کرداروں کی جذبات نگاری سے اپنے کرداروں کو حقیقی رنگ دے دیتا ہے۔ اس میں مکالموں اور مکالموں کی بھی اہم رول ادا کرتی ہے۔ یہ سب تبھی ممکن ہے جب آپ اپنے کرداروں کے دکھ درد ان کی ٹیس اپنی انگلیوں کے پوروں پر اپنے دل کی گہرائی میں محسوس کریں۔ آپ محسوس کریں کہ ظلم اُس پر نہیں آپ پر ہو رہا

ہے۔ حادثہ اُس کو نہیں آپ حادثے کا شکار ہو رہے ہیں۔ اس احساس کے بغیر آپ کردار کی حقیقی عکاسی رقم نہیں کرسکتے۔ بس کردار کو اپنے اوپر اوڑھ لیجیے اس کی گرم اور سرد ہواؤں کو خود محسوس کیجیے پھر دیکھیے آپ کا قلم اپنے آپ کرداروں کی کیفیت بیان کرتا جائے گا اور آپ کی تحریر جادو بیانی کا عنوان لے کر قاری کو اپنی گرفت میں لے لی گی۔ آپ کچھ دیر اپنے کردار کی زندگی جی کر دیکھیں۔ آپ کے کردار کا ذہنی تناؤ اُس کا غم آپ کے اعصاب پر اثر انداز ہوگا۔ یہ اس عمل کا سائیڈ افیکٹ (Side effect) ہے۔ آپ ذہنی تناؤ کے شکار ہوں گے۔ کرشن چندر کو دل کا دورہ پڑا تو ڈاکٹروں نے اسے لکھنے کے لیے منع کیا تھا۔ ادیب فطری طور پر ہاتھ کی آخری جنبش تک قلم نہیں چھوڑ سکتا۔ یہی حال میرے عزیز دوست مزاح نگار، دلیپ سنگھ کا ہوا۔ ان کو بھی ڈاکٹروں نے نہ لکھنے کا مشورہ دیا تھا۔ اس سائیڈ افیکٹ کا شکار ممکن ہے اور ادبا بھی ہوئے ہوں۔ استاد منٹو بھی شاید اسی لیے شراب میں ڈوب گئے کیونکہ وہ بھی اپنے کرداروں کے کرب میں گھرے رہے۔ بہر حال اپنے کرداروں کے دکھوں کو جھیلنا آسان نہیں۔ اس کے بغیر چارہ بھی نہیں کیونکہ اس کیفیت سے گزرے بغیر آپ اپنے کردار کے جذبات کی صحیح عکاسی نہیں کرسکتے۔

کئی بار ہم زندگی کے کسی موڑ پر کسی ایسی شخصیت سے ملتے ہیں جو عام لوگوں سے تھوڑا ہٹ کر ہوتی ہے۔ اس کی عادات، اُس کا اندازِ گفتگو، اس کا لباس اور اس کا رکھ رکھاؤ عام لوگوں سے ہٹ کر ہوتا ہے۔ ہم اُس کردار سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے وہ قدرتی طور پر ہمارے خیالوں میں بس جاتا ہے۔ وہ ہمارے ذہن پر ایک چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ ہم افسانہ تخلیق کرتے ہیں تو والہانہ طور پر ویسا ہی کردار قائم کر لیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا قاری بھی ایسی منفرد شخصیت سے لطف اندوز ہو۔ کئی بار تو ہم اُس کردار کو مرکزی کردار بنا کر پورا افسانہ اس کے اردگرد بن دیتے ہیں۔ ایسا کردار منفی بھی ہوسکتا ہے مثبت بھی۔ ہم کسی ڈان کی کچھ حرکات سے بھی متاثر ہوسکتے ہیں۔ کسی کی دین داری ایمانداری اور پرہیز گاری کے بھی گرویدہ ہوسکتے ہیں۔ کسی کے حسن کے چال ڈھال کے بھی قائل ہوسکتے ہیں۔ کسی کھلاڑی کے کھیل سے کسی اداکار کی اداکاری سے بھی ہم تاثر ہوسکتے ہیں۔ کبھی کبھی ہم کسی کے خوبصورت نام سے بھی متاثر ہوسکتے ہیں۔ ایسے نئے ناموں کو ہم اپنے کرداروں کے حوالے کردیتے ہیں ناموں کی مثال کچھ یوں ہے امتیاز علی تاج نے لاہور میں کسی قبر کا کتبہ پڑھا اُس پر نام لکھا تھا 'انارکلی' انارکلی نام امتیاز علی صاحب کو اس قدر بھایا کہ اُن کے ذہن میں وہ نام گھر کر گیا اسی نام کو لے کر انارکلی کے کردار کو لے کر انھوں نے ڈرامہ لکھ دیا۔ یہ محض اُن کے ذہن کی اُپج تھی کہ انھوں نے انارکلی کو اکبر اعظم کے دور میں کھڑا کردیا۔ انارکلی ڈرامہ بے حد مقبول ہوا۔ بالی ووڈ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ پہلے فلم 'انارکلی' بنی جس کے بعد اسی کہانی کو 'مغل اعظم' کا نام دے کر فلم بنائی گئی۔

انارکلی کا مغلیہ تاریخ سے کوئی تعلق یا واسطہ نہ تھا۔ محض فکشن نے اُسے تاریخ کا ایک کردار بنا ڈالا۔ یہ صرف ایک خوبصورت نام کا ہی کرشمہ تھا۔ 'امراؤ جان ادا' کی مثال بھی

ہم افسانہ تخلیق کرتے ہیں تووالہانہ طور پر ویسا ہی کردار قائم کر لیتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا قاری بھی ایسی منفرد شخصیت سے لطف اندوز ہو۔ کئی بار تو ہم اُس کردار کو مرکزی کردار بنا کر پورا افسانہ اس کے اردگرد بن دیتے ہیں۔ ایسا کردار منفی بھی ہوسکتا ہے مثبت بھی۔ ہم کسی ڈان کی کچھ حرکات سے بھی متاثر ہوسکتے ہیں۔ کسی کی دین داری ایمانداری اور پرہیز گاری کے بھی گرویدہ ہوسکتے ہیں۔

ایسی ہی ہے۔ امراؤ جان لکھنؤ کی ایک طوائف تھی جو شاعرہ تھی، اس کا گھر اس کا خاندان سب حقیقت تھا۔ رسوا امراؤ جان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اس طوائف شاعرہ پہ ناول لکھ دیا جو بہر حال فکشن تھا۔ اس ناول کو بھی بالی ووڈ نے دو بار فلمایا۔ ریکھا کی 'امراؤ جان ادا' کا شمار بہترین فلموں میں ہوتا ہے۔ اسی طرح کا کردار دیوداس تھا جو اسی زمرے میں آتا ہے۔ اس بنگالی ناول پر تین بار فلم بن چکی ہے۔ حالانکہ اس فلم کا اس کہانی کا (message) پیغام انتہائی منفی ہے۔ ایک نوجوان کا محبت میں ناکام ہو کر شراب میں ڈوب جانا اور مرجانا۔ ادب کے تاجر، فن بیچنے اور خریدنے والے کہاں اس بات پر غور کرتے ہیں کہ اس فلم کے تفہیم کا نوجوان طبقے پر منفی اثر پڑے گا یا مثبت۔ بہر حال یہ درست ہے کہ ہم جس کردار یا محض نام سے متاثر ہوتے ہیں اُسی کو اپنی تخلیق میں اپنا لیتے ہیں۔ یہ کرداروں کی کشش کی بات ہے۔ ایسا کرنا کوئی غلط نہیں۔ غلط اُس وقت ہو جاتا ہے جب ہم کسی کردار سے بہت زیادہ متاثر ہو کر مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں۔ اگر ہمارا مرکزی کردار دین دار ہے مہذب ہے، ہم اُس کو اس قدر بلند نہ کردیں کہ خدانخواستہ اُسے پیغمبر یا ولی بنا ڈالیں اور ہمارے اوپر مبالغہ آرائی کا الزام عائد ہو جائے۔ دوسری طرف اگر کردار منفی ہے تو ہم اسے اس دور کا چنگیز خاں ہی نہ بنا ڈالیں۔ کردار نگاری میں درمیانہ روی اپنانا بہت ضروری ہے۔ کہانی کی ضرورت ہو تو شدت سے کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ وقار عظیم نے اپنی کتاب 'فن افسانہ نگاری' میں افسانے کے کرداروں پہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محبت اور رومانس سے بھرپور افسانوں کے لیے ایسے نام منتخب کریں۔ جیسے: ثریا، ریحانہ، نجمہ، کملا، پریم کنور اور عشقیہ افسانوں کے لیے شاہد، نسیم، کنہیا وغیرہ۔ بہادر سپاہیوں کے لیے اس طرح کے نام منتخب کریں۔ پرتھیپال سنگھ، چتھر پال سنگھ، دلاور خان، اسد بجرنگ وغیرہ وغیرہ۔ تعجب ہے کیا دلاور خاں صرف جنگ کرسکتا ہے عشق نہیں لڑا سکتا۔ کیا عشق، رومان اور لڑائی کے لیے اللہ نے الگ الگ لوگ پیدا کیے ہیں؟ بچے کی ولادت کے بعد ماں باپ اپنی سمجھ کے مطابق بچے کو نام دیتے ہیں۔ کسی کو کیا معلوم بچہ بڑا ہو کر کیا بنے گا؟ جو پریم کمار ہے کیا وہ صرف رومانس کے لیے مخصوص ہے بی؟ سرحد پر جا کر لڑ نہیں سکتا بی؟ بہادر سنگھ ایک فوجی بھی ہوسکتا ہے۔ وہ رومانس بھی کرسکتا ہے رومانس تو ایک فطری عمل ہے اور یہ عمل کسی خاص نام کے آدمیوں کے لیے نہیں۔ بہت سے شرون کمار ایسے ہوں گے جن کے برے سلوک سے ان کے ماں باپ پریشان ہوں گے۔ رومانٹک کہانی کے لیے نجمہ یا کملا کیوں فاطمہ، مریم، سیتا اور ساوتری بھی کسی کے عشق میں گرفتار ہوسکتی ہیں میرے نزدیک ہمیں ناموں کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ وقار عظیم ستر سال پہلے کے افسانے کی بات کر رہے ہیں۔ آج کا افسانہ بہت سے نئے مراحل طے کر گیا۔ اس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ آج کا قاری بھی بہت سلجھا ہوا حقیقت پسند ذہن رکھتا ہے۔ ہاں نام دینے سے پہلے کردار کی حیثیت پہ توجہ دینا ہوگی، یہ دیکھنا ہوگا کہ کردار شہری ہے یا دیہاتی اَن پڑھ خاندان کا فرد ہے یا پڑھی لکھی فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔ اُس کا مذہب اُس کا عقیدہ کیا ہے؟ مثلاً اگر کردار پنجاب کے دیہات کا ہے اور سکھ ہے۔ اُس کو سُکّھا، سیما مسلمان ہے تو رحمو نام دے دیجیے۔ سُکّھے سے مراد سکھبیر سنگھ سیما یعنی ترسیم سنگھ رحمو یعنی رحمت علی وغیرہ کچھ نام سانجھے ہوتے ہیں۔ جیسے کالا، بگا، بٹو، ببلو، بنٹی یہ نام ہر مذہب کے بچوں کے رکھ دیے جاتے ہیں۔ یہ چھوٹے نام ہیں جنھیں ہم عرف بھی کہہ سکتے۔ اصلی نام سے ہی تعارف

ہوتا ہے کہ وہ کون ہے کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ دیہاتوں میں زیادہ نام چھوٹے ہوتے ہیں جو آسانی سے زبان پہ چڑھ جاتیں۔لڑکیوں کے نام پرمیت کور یتو، پرمجیت کور کو جیتو۔رضیہ کو رجّی، سیتا کو سیتو وغیرہ۔اسی طرح یوپی کے نام اس طرح سے ہیں۔ دیہاتوں میں مثلاً شدّن، اَچھن، چھٹّن، بھیکو، منگتو، رامو، کرپو وغیرہ شہروں کے پڑھے لکھے لوگ اس طرح کے نام رکھتے ہیں۔جیسے رام پال یادو، سریندر کمار شرما، سید جاوید اقبال، سلیم سالک وغیرہ باقی منٹو، ببلی، ببلو ایسے چھوٹے نام تو ہر مذہب میں پائے جاتے ہیں۔جس مقام جس خطّے جس مذہب کے کردار ہوں گے اُس کے عین مطابق نام دیے جائیں گے تو افسانے میں خوبصورتی پیدا ہوگی۔کردار اپنا نقش چھوڑیں گے۔اسی طرح لباس بھی کردار کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً آپ یوپی یا بہار کے گاؤں کا کردار لے رہے ہیں جو جوتے گانٹھنے والا غریب بوڑھا ہے وہ کھدّر کا میلا کچیلا اور بوسیدہ کرتا اور سوتی دھوتی پہنے گا۔ وی شیپ کی ربڑ کی چپل جس کا اسٹیپل ٹوٹا ہوا ہوگا اور کپڑے کی دھجّی سے کام چلا رہا ہوگا۔ بڑھی ہوئی داڑھی زرد دانت بجھی ہوئی بیڑی کان میں ٹنگی ہوگی سردی کا موسم دکھا رہے ہیں تو پرانا جو رستا سا بوسیدہ کمبل اپنے اردگرد لپیٹے ہوگا۔ میلا کچیلا اور پرانا سا مونکی ٹوپا۔کردار نگاری میں کردار کا حلیہ جس قدر تفصیل سے دیں گے جس قدر حقیقی تصور پیش کریں گے اتنا ہی بہتر۔کردار کے مطابق آپ نے اُس کا حلیہ اُس کا لباس پیش کردیا تو آپ کا کردار قاری کے ذہن میں سما جائے گا۔ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ کردار آپ کے قاری کے ذہن میں جی اٹھے گا۔مان لیجیے آپ دیہات کے کسی جاگیردار، جو رئیس اور عیاش ہے، کا کردار پیش کررہے ہیں تو اس کو سلک کا کڑھائی والا کرتا اور پاجامہ گلے میں سونے کی موٹی زنجیر، ہاتھوں میں انگوٹھیاں، سر پر سفید پگڑی آگے والے دو دانت سونے کے۔پیروں میں سنہرے تلّے دار دیسی جوتی، فطرتاً مغرور، لباس اور گیٹ اَپ کردار کی حیثیت کے عین مطابق ہو تو کردار افسانے میں چار چاند لگا دیتا ہے۔لباس اور گیٹ اَپ ہی کردار کو قاری کے ذہن میں زندہ کردیتا ہے۔ اِس لیے لباس کا خاص طور پر خیال رکھنا چاہیے۔ یہ سب کچھ آپ کو کردار نگاری کے حصے میں ہی کرنا ہے۔اس معاملے میں آپ کے مشاہدات کمزور نہیں ہونے چاہئیں۔ مثلاً اگر آپ کا کردار سیاست دان ہے اور پنجاب کا سکھ ہے تو کیا پہنے گا۔ ہریانے کا جاٹ ہے اُس کا لباس کیا ہوگا۔ تامل ناڈو کا ہے تو کیا پہنتا ہوگا۔لباس اور گیٹ اَپ کے بارے میں آپ کے مشاہدات کمزور ہوئے تو افسانے کی خوبصورتی چھین لیں گے۔ ویسے ہمارے اس دور میں بہت آسان ہے۔آج کا دور فلموں اور ٹی وی کا دور ہے اور ٹی وی پر جو کردار پیش کیے جاتے ہیں۔ظاہر ہے وہ ہر صوبے ہر فرقے کے مختلف اسٹیٹس (Status) کے لوگ ہوتے ہیں۔اُن کا انداز، بولی سب کچھ آپ کے سامنے ہوتا ہے، اس لیے دورِ حاضر میں زیادہ محنت درکار نہیں۔ پولیس والا کیسے بولتا ہے، بھکاری کا کیا انداز ہوسکتا ہے۔ویشیا کیا پہنتی ہے اس کا انداز کیسا ہے۔وغیرہ وغیرہ۔سب کچھ ہمارے سامنے ہوتا ہے، تو مشاہدات کا کمزور ہونا نہیں چاہیے۔ ٹی وی کے مختلف کردار آپ کے ذہن میں سمائے رہتے ہیں۔

جس کردار کی فطرت میں بے وفائی ہے وہ وفا کرهی نہیں سکتا۔ جو کردار چور ہے، ٹھگ ہے وہ کبھی سخاوت نہیں کرسکتا کیونکہ سخاوت اُس کی فطرت ہی نہیں۔ ہمیں کردار کی حیثیت اور فطرت نظر میں رکھ کر کردار نگاری کرنا ہوگی۔ کردار نگاری کی اہمیت افسانے میں اتنی ہی ہوتی ہے جتنی جسم میں روح کی۔ اس لیے کردار نگاری بہت ہی سنجیدگی اور احتیاط سے کرنا چاہیے۔

کردار کی فطرت کے مطابق اس کا عمل اور گفتگو بہت ضروری ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر موذیل کو ہی لے لیجیے۔ سعادت حسن منٹو کا منتخب افسانہ ہے۔کرپال کور کنواری لڑکی ہے۔اپنے معذور ماں باپ کے ساتھ رہتی ہے۔ تقسیم کے فسادات کے دن ہیں کرپال کور کٹّر اور دادا قسم کے مسلمانوں کے محلے میں پھنسی ہوئی ہے۔اس کا محبوب ترلوچن اور اس کی دوست موذیل اُسے بچانے کی غرض سے اُس محلے سے نکالنے کے لیے آتے ہیں۔ بلوائی اوپر والی منزل پر قتل و غارت کررہے ہیں۔کرپال کور ترلوچن اور موذیل کے کہنے پر اپنی جان بچا کر اپنے فلیٹ سے چلی جاتی ہے۔لڑکی کی ذات جو مہذب ہے، کنواری ہے وہ اپنے ماں باپ کو مرنے کے لیے چھوڑ جاتی ہے۔ایک بار بھی نہیں کہتی کہ اُس کے ماں باپ کا کیا ہوگا۔فطری طور پر لڑکیوں کا ماں باپ سے زیادہ لگاؤ ہوتا ہے۔اُس کو ایک بار تو کہنا چاہیے تھا کہ وہ ماں باپ کو چھوڑ کر نہ جائے گی۔لڑکی کو منٹو نے اس قدر بے حس بنادیا کہ وہ ایک بار یہ بھی نہیں کہتی کہ آخری بار وہ اپنے ماں باپ کو دیکھ تو لے۔کرداروں کے تعارف میں اپنی جزیات میں ہم جو عادات، انداز، فطرت وغیرہ کردار کو دیتے ہیں وہ نظر میں رکھ کر کردار نگاری کرنا چاہیے۔ اُس کی حرکات و سکنات اُس کا عمل ویسا ہی ہو جیسا ہم اُس کے بارے میں اشارہ دے چکے ہیں۔ ہم تعارف میں جزیات میں کسی شخص کو نرم دل، شریف النفس نمازی بلکہ بزدل ظاہر کردیں، آگے چل کر اُسی سے ہم کسی لڑکی کا ریپ کروادیں۔ اُس کے ہاتھ میں تلوار دے دیں جو دس آدمیوں کو للکار دے اور گالیاں بکے۔ایسا کرکے ہم اپنے کردار سے اُس کی فطرت کے خلاف کام کروائیں گے جو قاری کو ہضم نہیں ہوگا۔ یہ غلطی اکثر و بیشتر دیکھنے کو ملتی ہے جس سے پرہیز کرنا چاہیے۔جس کردار کی فطرت میں بے وفائی ہے وہ وفا کر ہی نہیں سکتا۔ جو کردار چور ہے، ٹھگ ہے وہ کبھی سخاوت نہیں کرسکتا کیونکہ سخاوت اُس کی فطرت ہی نہیں۔ ہمیں کردار کی حیثیت اور فطرت نظر میں رکھ کر کردار نگاری کرنا ہوگی۔ کردار نگاری کی اہمیت افسانے میں اتنی ہی ہوتی ہے جتنی جسم میں روح کی۔اس لیے کردار نگاری بہت ہی سنجیدگی اور احتیاط سے کرنا چاہیے۔ خاص طور پر کردار کے فطری تقاضوں کو مدِّنظر رکھ کر کردار نگاری کرنا بہت نازک مرحلہ ہے۔ ذرا سی بھول بھی کردار کو کمزور کردیتی ہے اور کرداروں کے بل بوتے ہی کہانی کو آگے بڑھنا ہوتا ہے۔اسی طرح جذبات نگاری، جو کردار نگاری کا ہی ایک حصہ ہے، کو بھی بڑی سنجیدگی سے تخلیق کرنا ہوتا ہے۔ جذبات نگاری میں آپ کا فن بولتا ہے۔ قاری کی فکر قاری کا احساس آپ کی گرفت میں ہوتا ہے آپ چاہے اُسے اپنے فن سے رُلادیں یا ہنسادیں یہ آپ کے فن آپ کی تخلیق پر موقوف ہے کردار کا گیٹ اَپ اُس کا لباس اُس کے مکالمے ہی اُسے قاری کے ذہن میں زندہ کرتے ہیں۔ یہ کمال بھی آپ کے فن آپ کی بہترین کردار نگاری کا ہوتا ہے۔آپ اپنے کرداروں کے بل بوتے ایسے حالات پیدا کردیتے ہیں کہ قاری محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ خود بھی آپ کی تخلیق کردہ سچویشن (Situation) میں سانس لے رہا ہے اور آپ کے تخلیق کردہ کردار اُس کے اردگرد پھیلے ہوئے ہیں اور محوِ عمل ہیں۔یہی آپ کے افسانے کی کامیابی کا راز ہے۔

■

Mohd Basheer
Malerkotlvi Retd. Estate Officer, Near
Urdu Academy, Delhi Gate,
Malerkotla - 148025 (PB)

حلیمہ فردوس

نسائی شاعری اور صنفی مساوات

اردو کی ادبی تاریخ میں نسائی شعری سرمایے کو عرصۂ دراز تک قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ شعری ایوان کے یہ چراغ اہلِ ادب کی نگاہوں سے محروم رہے۔ اس بے اعتنائی کے دیگر جوازات کے علاوہ سماجی پابندی بھی سب سے اہم جواز تھی۔ آج تانیثیت کے حوالے سے نسائی ادب کے سماجی، تاریخی، تہذیبی اور لسانی پہلوؤں پر غور کیا جا رہا ہے، ایسے میں نسائی شاعری پر گفتگو کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ جب بات اردو شاعری میں صنفی مساوات کی ہوتی ہے تو سارا منظر نامہ آنکھوں کے آگے گھوم جاتا ہے۔ تفصیل میں گئے بنا صرف نسائی شاعری پر گفتگو کرنا میرا مقصد ہے۔ ایک عرصے تک شعری میدان میں نسائی نقوش نہیں ملتے۔ بھلا ہو محققین کا جنھوں نے شاعرات سے متعلق لکھے گئے دو سو تذکروں سے چند ایک کی فہرست مرتب کی۔ اہل ادب کے اس رویے کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ''نسائی شاعری گم شدہ آواز اور گم شدہ پرواز کا نام ہے۔'' پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز اور ماہ لقابائی چندا جیسے ناموں کو حاشیے پر رکھا گیا۔ سماج میں موجودہ روایت کے تحت عموماً شاعرات پر متشاعر ہونے کا الزام عائد کیا جاتا رہا۔ جس میں کچھ حقیقت ہو تو ہو، دراصل یہ خیال خود صنفی تفریق کا نتیجہ تھا۔ چھ ہزار اشعار پر مشتمل مثنوی ''گلشن شعرا'' کی خالق پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز کے مندرجہ ذیل اشعار سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے۔ امتیاز کا کلام اس کی شعری صلاحیتوں کا صداقت نامہ ہے:

عجب قصہ نادر بنائی ہے آج
جہاں میں بہت ہوگا اس کا رواج
ترا جو تخلص ہے اب امتیاز
ہے سب اہلِ ہنروں میں تو شاہ باز

یہ محض شاعرانہ تعلی نہیں بلکہ سر عام اپنی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔ یہ خود اعتمادی اور شعری صلاحیتیں امتیاز کے رفیقِ حیات کی صحبت کا نتیجہ تھیں۔ اُس نے مثنوی میں اپنے مرحوم شوہر کے شاعرانہ مرتبے اور عشق کا برملا اظہار کیا، گویا یہ صنفی مساوات کا پہلا ثبوت ہے۔ اس دور کا ایک اہم نام ماہ لقابائی چندا کا ہے۔ اس کے کلام میں صنفی مساوات کا ذکر نہیں ملتا البتہ اس کے لہجے سے تفاخر جھلکتا ہے، وہ کبھی احساسِ کمتری کا شکار نہیں رہی:

چندا کے دیکھنے کی جو خواہش کرے
رکھتا ہے وصف اپنے میں وہ عزو جاہ کا
بویا زمین دل میں سدا تخم آرزو
نارسائیوں کا نہ دیکھا ثمر کبھی

یہ شاعرانہ گفتگو نہیں ہے۔ محققین نے چندا کی ذہانت، علمیت اور بردباری کا اعتراف کیا ہے۔ ان مثالوں سے قطع نظر انیسویں صدی میں جب تعلیم نسواں کا غلغلہ اٹھا تو ز خ ش یعنی زاہدہ خاتون شیروانیہ نے اپنی شاعری کے ذریعے اردو برادری کو چونکا دیا۔ انھوں نے ایک جانب عورتوں کی غیرت کو للکارا تو دوسری جانب زعم میں ڈوبے مردوں اور احکام خداوندی کے مبلغوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عورت کے رُتبے اور وقار پر مہر لگا دی۔

اس دور تک نسائی شاعری میں مرد و زن کے مساوات کا تصور مفقود تھا۔ ز خ شیروانیہ نے پہلی بار اس حقیقت کی جانب مردوں کی توجہ مبذول کرائی:

مرد و زن مل کے لگا سکتے ہیں وہ کشتی پار
جو خلیج تلاطم میں پڑی ہے بیکار
چھوڑ دے بہر خدا چھوڑ دے اندازِ ستم
ایھا المسلم لا یرحم من لا یرحم

بہر کیف ز خ شیروانیہ کو صنفی تفریق مٹانے والی یا صنفی مساوات کی پہلی آواز قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کے بعد تعمیری رجحان رکھنے والی شاعرات کے چند نام جگنو کی طرح چمکتے ہیں لیکن ادا جعفری سے خواتین کی شعری کائنات میں ایک نیا باب وا ہوتا ہے۔ تانیثیت کی حامی کشور ناہید، فہمیدہ ریاض نے صنفی مساوات کا پرچم تھامے ایوانِ شاعری میں قدم رکھا۔ اس قبیلے سے تعلق رکھنے والی شاعرات کی لمبی فہرست ہے، ان میں سارا شگفتہ، عذرا عباس اور نسیم سید نے کھل کر حمایت کی۔ یہ شاعرات مارشل لا کے دور کی پیداوار ہیں۔ جہاں تک صنفی مساوات کا تعلق ہے نسائی شاعری کی ماہ تمام پروین شاکر کی شاعری میں پیار و محبت سے متعلق مرد کی نفسیات کی باتیں تو ملتی ہیں لیکن صنفی مساوات کے تئیں انھوں نے اجتہادی رویہ نہیں اپنایا۔ ان مجتہدانہ نسائی آوازوں نے مرد کے لیے کتا، بھیڑیا اور عورت کے لیے مکھی اور بلی جیسے غیر شاعرانہ الفاظ کے ذریعے اپنی شعری فرہنگ تیار کی۔ کشور ناہید، فہمیدہ ریاض اور سارا شگفتہ نے نہ صرف صنفی مساوات کی بات کی بلکہ صنف اور جنس کے موضوع پر بلا خوف وخطر اظہار خیال کیا۔ حتیٰ کہ ان کے نام نسائی احتجاج کا استعارہ بن گئے۔ بہر کیف نسائی مزاحمتی شاعری میں صنفی مساوات کی بہ نسبت صنفی امتیاز و تفریق نا مساوات کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔

کشور ناہید کا شعری سفر غزل سے شروع ہوا لیکن ان کے

سینے میں ابلتے درد کو نثری نظموں میں پناہ ملی۔ مہندی بھرے ہاتھوں کو چھپا کر رکھنے والی شاعرہ یہ کہنے پر آمادہ ہوگئی:

میں اپنے نیلو نیل بدن سے پیار کرتی ہوں/ مگر مجھے تم کبھی جتنی آزادی کہاں دے سکو گے/ تم نے عورت کو کبھی بنا کر بوتل میں بند کرنا سیکھا ہے (قید میں رقص 42-43)

عورت کی بے زبانی، کسمپرسی اور زبوں حالی صنفی تفریق کا نتیجہ ہی تو ہے۔ انتہا یہ ہے کہ مرد ہمیشہ اس کے وجود کو غیر اہم ہی سمجھتا رہا ہے۔ اس دور کی شاعرات نے نسائی تشخص پر زور دیا۔ انھوں نے مرد کو یہ باور کرایا کہ عورت محض آگ بجھانے والی ندی نہیں ہے وہ اپنی سوچ سمندر کی مالک ہے۔ فہمیدہ ریاض کو 'دریدہ بدن' کی نظموں سے شہرت اور بدنامی یکساں طور پر نصیب ہوئی۔ ان کی نظمیں 'مقابلۂ حسن' اور 'اقلیما' جنسی تجربوں کے بجائے اس ترقی یافتہ دور کی عورت کے تئیں برتی جانے والی بربریت کی ترجمان ہیں۔ صنفی تفریق ہی سے اس کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ شاعرہ عورت کے فکری وجود پر زور دیتی ہے۔ نظم 'مقابلۂ حسن' مرد اساس معاشرے کی صارفی سوچ پر کاری ضرب ہے۔ شہناز نبی کی کئی نظمیں جیسے 'پہچان'، 'گمشدگی' اور خموشی میں ایک ایسی عورت سانس لیتی ہے جس کے ذہن میں ہر دم سوچ کی لہریں اُٹھتی ہیں۔ خصوصاً ان کی نظم 'بھول' میں خواتین کی ذات سے وابستہ چینیوں کے ظالمانہ رویے کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

دراصل نسائی تشخص صنفی مساوات کا جز ہے اور نسائی وقار اس تفریق یا امتیاز کو ختم کرنے کا اہم رویہ ہے، خواتین کی شاعری میں شفیق فاطمہ شعریٰ نسائی وقار کی علمبردار شاعرہ ہیں۔ نظم رابعہ تابعہ کی یاد میں اور 'دعائے بانوئے فرعون'، 'بی بی مریم' اس کی مثالیں ہیں۔ شاعرہ نے اسوہ بانو کو ارتفاعِ آدمیت کا سنگ میل قرار دیا ہے۔ نظم کا مختصر سا اقتباس ملاحظہ ہو:

ارتفاعِ آدمیت کے اس دور کا آغاز ہے/ جس میں اُسوہ / بانوئے فرعون کا اسوہ وہ پہلا سنگ میل/ جس پہ اُتری تابشِ ام الکتاب/ آہ سچائی عجب شے ہے اگر پربت پہ ہو نازل/ تو ہو پربت پارہ پارہ

معاصر شاعرات میں شائستہ یوسف کے کلام میں نسائی وقار کا پرتو صاف جھلکتا ہے۔ شفیق فاطمہ شعریٰ کی طرح شائستہ نے اسلامی تمثالوں سے متعلق کامیاب نظمیں لکھی ہیں۔ صدائے زلیخا، صحراؤں میں اذاں، شرارت، رب ارنی انظر، تطہیر اور 'حاضری' جیسی نظمیں نسائی وقار سے منور ہیں۔ نظم حاضری میں ممتا کی ضوفشانی سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی ہیں۔ اس نسائی وقار کے آگے صنفی مساوات کا نظریہ بے وقعت نظر آتا ہے۔ حج و عمرہ کا حضرت ہاجرہ کے نام سے منسوب ایک رکن یعنی صفا مروا کا چکر گویا نسائی وقار کا اعتراف ہے۔

شعری میراث کی علمبردار زیدی بہنوں نے کبھی تانیثیت کی ہم نوائی نہیں کی۔ ساجدہ زیدی علی الاعلان صنفی مساوات کا ذکر نہیں کرتیں، البتہ عورت کے مجبور محض تصور کی تردید کرتی ہیں۔

ان کی نظم 'کلیاں نیلا آسمان زنجیریں' میں عورت کی محرومی کا ذکر تو ہے مگر یہ عورت مجبور، مجہول محکوم وجود نہیں رکھتی۔ وہ مدارِ نور میں مہتاب کی ہم رقص ہونے کی آرزومند ہے، یہ دورِ حاضر کی ترقی یافتہ عورت کا کردار ہے۔

گرچہ کہ شاعرات نے صنفی تفریق اور صنفی مساوات کا اظہار نثری نظموں کے پیرائے میں کامیابی سے کیا ہے مگر نظموں میں کہیں مزاحمتی لہجہ تو کہیں فلسفیانہ رنگ تو کہیں نغمگی ہے۔ شاعرات غزل کے فن شیشہ گری سے بخوبی واقف ہیں ان کے غزلیہ اشعار میں عورت کی داخلی کیفیت اور ذاتی اُلجھنوں کے علاوہ خود اعتمادی کے لشکارے بھی ہیں، وہ اس عورت کی بات کرتی ہیں جو نہ ابھاگن ہے اور نہ ہی جوگن وہ اپنی قسمت پر آنسو نہیں بہاتی خود کو تنہا نہیں محسوس کرتی وہ ماحول سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے، وہ زندہ رہنے کی خواہشمند ہے وہ توانا لہجے کی مالک ہے، شاعرات نے جہاں جنسی تفریق کو نشان زد کیا ہے وہیں مردوں کو مساوی حقوق کا سبق بھی یاد دلایا ہے، وہ اپنے تشخص کی بات کرتی ہیں وہ اپنے تئیں 'مجبور محض' کے تصور کو بے معنی ٹھہراتی ہیں۔ تانیثی بغاوت کے جو شعلے نظموں میں نظر آتے ہیں وہ غزلیہ اشعار میں مفقود ہیں لیکن طنز کی نشتریت برابر برقرار ہے:

کیا میرا زیاں ہے، جو مقابل ترے آجاؤں
یہ امر تو معلوم کہ تو مجھ سے بڑا ہے — فہمیدہ ریاض

تعظیم اُس کے لیے مخصوص رکھی
وہ جس کو مرے قد کا نکلنا نہیں بھایا — زہرا نگاہ

چھوڑیے پیروں میں کیا لکڑیاں باندھے پھرنا
اپنے قد سے مرا قد شوق سے چھوٹا سمجھیں — بلقیس ظفیر الحسن

عجب ہوں تم میں لگا کر خود اپنے خود کا جوڑ
تلاش کرتی ہوں یہ تم ہو یا مرا قد ہے — عذرا پروین

معاصر خواتین کی غزلوں کا منظر نامہ کچھ علاحدہ نہیں ہے، حیات و کائنات کے مسائل کے علاوہ اس میں عشق کے آب دار موتیوں کی چمک ہے، زندگی کی تلخ سچائیوں کے سنگ ریزوں کا نوکیلا پن بھی ہے، نسائی غزلیہ اشعار میں صنفی امتیاز، مرد کی بالا دستی اور مرد کی فطرت کے تذکرے بھی ہیں یہ غزلیہ اشعار خواتین کے مزاج و مذاق اور منہاجِ فکر و نگاہ کا نتیجہ ہیں۔ آج عورت مساوات کا دعویٰ کرے نہ کرے وہ اپنے آپ کو پہچان گئی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

پڑی ہوئی تھی کسی در پہ ٹھیکری کی طرح
میں اُٹھ کھڑی ہوئی اور مشعل کوہسار ہوئی — (نسیم سید)

بجھا کے رکھ گیا ہے کون طاقِ نسیاں پر
مجھے اندر سے پھونکے دے رہی ہے روشنی میری — (بانو داراب وفا)

مرے بالوں کی چاندی سے گریزاں آج ہے وہ
جسے کل میرا چاندی سا بدن اچھا لگا تھا — (مونا شہاب)

سورج کی تیز نظروں کا ہر وار سہہ لیا
شبنم تھی پھر بھی آنکھ میری شبنمی نہ تھی — (رفعیہ شبنم عابدی)

وہ ذہن کی سوچ کیا سمجھے بھلا
اُس کو بس ایک گڑیا چاہیے — (زرین یاسین)

مذکورہ بالا اشعار میں عورت کی خودداری اور خود اعتمادی کے علاوہ مرد کی فطرت کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ غزل کے کینو اس پر خود آگاہ عورت کئی سوال کے جواب تلاش کر رہی ہے۔ بُریدہ دست آذر کی لڑکی اور بے یقینیِ حوا کی خلق کردہ مخلوق معاشرے سے تفریق کا حساب مانگ رہی ہے، نسائی غزلوں کی یہ زبان، یہ استعارے اس کے اپنے ہیں۔ یہ شعری سرمایہ آدھے مرد کی دیومالا ہے، جیسے:

فلیٹ کی چابی، صوفہ، بستر کمرے کی ہر ایک شے
اس میں بسنے والا آدھا مرد مگر کب میرا ہے
(شہناز نبی)

آتی تھی ہمیں رفو گری بھی
ایک دوسرے کا لباس تھے ہم — (پروین شاکر)

کھڑی ہے فکر کے آذر کدے میں
بُریدہ دست آذر کی لڑکی — (عشرت آفرین)

میں بے یقینیِ حوا کی خلق کردہ ہوں
میرے خمیر میں شکِ آگہی کی ابجد ہے — (عذرا پروین)

نسائی شاعری کا معتدبہ حصہ صنفی تفریق کی گواہی دے رہا ہے، مگر کبھی کبھار شاعرات دھیمے لہجہ میں صنفی مساوات کی حقیقت سمجھانے لگتی ہیں۔ فاطمہ حسن کی گزارشات ملاحظہ ہوں:

آنکھوں میں نہ زلفوں میں نہ رخسار میں دیکھیں
مجھ کو میری دانش مرے افکار میں دیکھیں
پوری نہ ادھوری ہوں نہ کمتر ہوں نہ برتر
انسان ہوں انسان کے معیار میں دیکھیں

آج ہمارے سماج میں صنفی مساوات کی باتیں ہو رہی ہیں اور صنفی تفریق کو مٹانے کی کوششیں جاری ہیں، ہمارے شعر و ادب کا یہ ایک اہم موضوع بن گیا ہے، مگر "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" والا معاملہ ہے، یہ ایسا درد ہے جس کی دوا بھی ہے اور وہ لا دوا بھی، اس تعلق سے بس اتنا کہا جا سکتا ہے "درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا"۔

Dr. Halema Firdos
A-1.414, Ganga Block, National
Games Village, Kor Mangala,

ریحان حسن

ڈاکٹر محمد حسن کی فراق شناسی

روفیسر محمد حسن ان چند شخصیتوں میں سے ہیں جنھوں نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کے سبب اردو ادب کی تاریخ میں اپنا ایک منفرد مقام بنایا ہے۔ وہ صرف ایک ناقد ہی نہیں ڈرامہ نگار اور ادبی مورخ بھی ہیں ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد دینا مشکل ہے لیکن کلاسیکی ادبیات سے لے کر جدید ادب تک مختلف پہلوؤں پر انھوں نے لکھا ہے۔ جلال لکھنوی ہو یا مارکسی تنقید، اردو ڈرامہ ہو یا فیض آباد کی تاریخ یا دہلی میں اردو شاعری کا تاریخی و تہذیبی پس منظر، اردو ادبیات میں محمد حسن کے یہ وہ سنگ میل ہیں جن کے لیے اردو تاریخ میں انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ انھوں نے جدید شعرا کے بارے میں بھی بہت لکھا۔ اپنے رسالے 'عصری ادب' میں مستقل طور پر وہ موجودہ ادبی صورتِ حال اور جدید شعرا اور افسانہ نگاروں کے بارے میں لکھتے رہے ہیں۔

فراق کی شاعری سے انھیں ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ فراق انگریزی ادبیات کے ایک عالم جمالیات اور خاص طور پر شعری جمالیات پر گہری نظر رکھنے والے شاعر تھے۔ اردو میں عشقیہ شاعری اردو شاعری میں اپنا نوعیت کی منفرد کتاب ہے۔ اپنے ایک مجموعے 'طرزِ خیال' میں انھوں نے بہت سے شعرا و ادبا کی تخلیقات کے متعلق اپنی بے لاگ اور دوٹوک رائے کا اظہار کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے جن ادبا کے متعلق جو نظریہ پیش کیا ہے وہ محض نظریہ ہی نہیں بلکہ تنقید نگاروں کے لیے وہ نظریے مشعل راہ بھی ہیں۔ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کے متعلق اپنے مضمون 'فراق کا نظریۂ فن' میں لکھتے ہیں:

''فراق کی شاعری ان کی نثری تحریر وتقریر کے کاندھے پر کھڑی ہو کر بلند ہوئی ہے۔ وہ شاید اردو کے تنہا شاعر ہیں جس نے اپنے سخن کا ذوق خود پیدا کیا، اپنے قاری کو خود اپنے مضامین، جملوں اور تحریر وتقریر سے ترتیب کی۔ اس ترتیب کے بغیر فراق کی شاعری کی اس نئی کھنک کی پہچان مشکل تھی جو فراق کا سرمایہ تھی۔''

(طرزِ خیال، صفحہ 157، مطبوعہ اردو اکادمی، دہلی)

ڈاکٹر محمد حسن نے فراق کی شاعری کی اس نئی کھنک کی شناخت دراصل ان کے مختلف انٹرویوز اور ان کے تحریر کردہ مضامین کی روشنی میں کیے، بلاشبہ فراق کے متعلق پروفیسر محمد حسن کے ان خیالات سے انکار ناممکن ہے جن کا اظہار انھوں نے 'طرزِ خیال' میں کیا ہے۔ فراق کے جب نثری کارناموں کی جانب نگاہ اٹھتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ فراق کا شمار ہمارے ان شعرا میں ہے جس نے اپنی نثری تحریر وتقریر کے سبب اپنی شاعری کی عمارت استوار کی اور انھوں نے اس شعری شعور کو عام کیا جسے دیگر شعرا نے نہ کیا تھا جیسا کہ پروفیسر محمد حسن رقمطراز ہیں:

''فراق صاحب کے لیے یہ کہنا بہت چھوٹی بات ہوگی کہ انھوں نے اردو غزل کو ہندوستانیت بخشی۔ اردو غزل ان سے پہلے بھی ہندوستانی تھی گو اس کا نہج کچھ اور تھا۔ فراق کے لیے یہ بھی چھوٹی بات ہے کہ انھوں نے غزل کو نئی کھنک اور نیا لہجہ عطا کیا۔ یہ کام ان سے کمتر درجے کے شاعروں نے بھی کیا۔ البتہ جو شعری شعور فراق نے عام کیا وہ ان کا رنامہ ہے۔''

(ایضاً، ص 168)

یقیناً فراق نے اپنی شاعری کے حوالے سے لوگوں کے سامنے شعر کا جو تصور پیش کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فراق کے نزدیک شاعری دراصل ناکام اور زخمی وجود کے لیے ایسا مرہم ہے جس سے زندگی کے تمام دکھ اور درد ناکامی ومحرومی کا علاج ممکن ہے۔ ظاہر ہے کہ زندگی جس قدر تلخ ہوگی شاعر اسی قدر حیات افزا اشعار تخلیق کرے گا اور فراق بھی ایسے ہی شعرا میں تھے۔

ڈاکٹر محمد حسن فراق کی شاعری کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فراق کی شاعری بنیادی طور پر عشقیہ شاعری ہے اور غزل کی شاعری ہے۔ عشق کا تعلق بظاہر جنسیت سے زیادہ ہے، سماجی اور سیاسی انقلاب سے شاید بہت کم ہے۔ لیکن فراق عشق کو انسانی رشتوں کی بوطیقا سمجھتے ہیں اور عشق ہی کے وسیلے سے زندگی اور حیات و کائنات میں تبدیلیاں لانے والے احساس اور فکر کو ادب گردانتے ہیں۔" (ایضاً، ص 169)

پروفیسر محمد حسن نے فراق کی شاعری کو بنیادی طور پر عشقیہ اور غزل کی شاعری کو بجا طور پر صحیح قرار دیا ہے کیونکہ فراق نے اپنی شاعری کے حوالے سے انسانوں کے مسرت کے جنسی لمحات، درد اور مایوسی و ناکامی کو جو بیان کیا ہے اس کے ذریعے سے انسان کے دل میں حیات و کائنات سے بیزاری نہیں پیدا ہوتی بلکہ اس دنیا اور زندگی پر ایقان و ایمان میں اضافہ ہوتا ہے جیسا کہ فراق نے خود کہا بھی ہے۔

"تصوف کا سہارا لیے بغیر مجازی دنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرانا میری عشقیہ شاعری کا مقصد رہا ہے۔"
('نقوش' لاہور، ادب عالیہ نمبر 1960، ص 358)

اس طرح فراق نے اپنی شاعری کی عظمت و اہمیت کا رشتہ تہذیب اور تاریخ سے بھی جوڑ دیا ہے اور انھوں نے پوری انسانی تہذیب کو اپنی میراث قرار دیتے ہوئے انسانی تہذیب کو اپنے اندر جذب کیا اور اسی حسیت کو اپنی شاعری میں پیش کیا اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری ہندوستان میں بکھری ہوئی تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ دراصل فراق بقول ڈاکٹر محمد حسن:

"فراق بار بار اسی پر زور دیتے رہے کہ تہذیب ایک اکائی ہے۔ ایک خاص دور کی تہذیب کو ہندو یا سنسکرت تہذیب کہہ کر اس سے منہ موڑ لینا اتنا ہی احمقانہ ہے جتنا ترک، ایرانی، افغانی تہذیب کی دین کو اسلامی کہہ کر اس سے روگردانی کرنا یا مغربی یا یورپی تہذیب اور ادب کی دین سے انکار کرنا 'روپ' کی رباعیوں میں قدیم ہندوستانی کا رنگ روپ ہے۔ شبستان کی غزلوں میں میر اور غالب کی کھنک، غزلوں، نظموں میں ورڈزورتھ کی گونج ہے اور ان سبھی تہذیبوں آویزوں اور ادبی لہجوں کی مدد سے فراق نے اپنا لہجہ اور اپنا آہنگ تخلیق کیا ہے جو تہذیبوں کے آفاقی تسلسل کی نفی نہیں کرتا انھیں اپناتا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے بڑے پتے کی بات کہی تھی 'دانا پھیلاتا ہے اور نادان سکڑتا ہے' فراق کا شمار پھیلنے اور اپنانے والوں میں ہے، سکڑنے اور رد کرنے والوں میں نہیں۔"
(طرزِ خیال، صفحہ 66-165)

پروفیسر محمد حسن کے اس اقتباس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ فراق فہمی کے لیے تہذیبوں اور ان کے ارتقا کو سمجھنا زیادہ معاون ثابت ہوگا۔

فراق پر ایک اور مضمون 'فراق کے مکالمے' میں انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ فراق کے خواہ شعری مجموعے ہوں یا نثری مضامین یا ان کی عشقیہ شاعری ان سب میں فراق کی سچی سچائی تصویر نظر آتی ہے لیکن ان کی تقریروں، خطوط اور انٹرویوز سے فراق کی ایسی شبیہ بنتی ہے جس میں وہ سجے اور سنورے نظر نہیں آتے بلکہ بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ ان میں ان کا لہجہ اور رویہ عام تحریروں سے یکسر مختلف نظر آتا ہے۔ بقول محمد حسن:

"یہاں وہ گویا اپنی ذات کی روشنی میں لاٹھی ٹیکتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ ہر قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھتے اور سوچتے، نئے سرے سے سوچتے ہوئے لگتے ہیں پھر ان کے علاوہ اور ان سب سے کہیں بڑھ چڑھ کر ان کے مکالمات ہیں جن میں ان کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہوا ہے مگر یکبارگی نہیں مرحلہ وار۔ ارتقائی انداز میں! ان میں دانشور فراق شاعر فراق کو میلوں پیچھے چھوڑ دیتا ہے یا یوں کہیے کہ اگر اس دانشور کی نظر سے شاعر فراق کو دیکھیں تو ایک اور ہی عالم نکلتا ہے۔ ان چھوٹے چھوٹے جملوں میں بصیرتوں کے وہ جلوے ہیں جنھیں لفظوں کے انبوہ در انبوہ قافلے بھی سنبھال نہیں سکتے۔ مکالمے یا اس طریقے کے آوارہ جملے گفتگو میں تو کیف پیدا کرتے ہی ہیں مگر فراق کے یہاں فکر کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیتے ہیں جو نئے احساس اور ادراک کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ کہنا کچھ مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ مختصر سے چند لفظی جملے فراق کے فکر و فن ہی کے نہیں تمام تر فنی بصیرت کی کلید ہیں۔" (ایضاً، ص 74-173)

یہاں محمد حسن نے فراق کی مرحلہ دار ترقی اور ان کی ہمہ جہت شخصیت کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ان کی بصیرتوں کی گراں اور مختصر جملوں میں بیان کر کے آنے والے اسکالر اور قارئین کی تشفی کا سامان بہم پہنچایا ہے۔

فراق شاعری میں انداز بیان کو غیر معمولی اہمیت دیتے ہیں اور ان کا ماننا ہے کہ غیر معمولی اور عالمانہ لفظ سے لٹریچر پیدا نہیں ہوتا بلکہ معمولی لفظ کے صحیح استعمال سے ادب کی تخلیق ہو سکتی ہے اسی لیے فراق لفظ کے تفحص و تلاش کے سراسر خلاف تھے جیسا کہ محمد حسن نے تحریر کیا ہے کہ وہ:

"زبان کا رشتہ پوری تہذیبی وراثت سے جوڑتے ہیں اور جو لوگ نہیں جوڑ پاتے انھیں تہذیب کا غدار قرار دینے سے بھی نہیں چوکتے کہ ان کے نزدیک وہ ارتقا کے دشمن اور انسانیت کی فلاح سے روگردانی کرنے والے لوگ ہیں جن کی جگہ ادب ہی نہیں انسانیت کے خیر خواہوں کی صفوں میں بھی نہیں ہے۔" (ایضاً، ص 178)

بہرحال فراق کے سلسلے میں ڈاکٹر محمد حسن کے یہ دونوں مضامین خاصی اہمیت کے حامل ہیں جن میں انھوں نے فراق کے متعلق کچھ ایسی باتیں کہی ہیں جو اس سے قبل پیش نہیں کی گئی تھیں۔ یقیناً فراق ایک ایسے شاعر ہیں جن کی زندگی کے ایسے پہلو ہیں جنھوں نے ان کو ایک عظیم شاعر بنانے کے ساتھ ساتھ ایک متنازع شخصیت بھی بنا دیا تھا۔ بہتر ہوتا اگر اس رخ پر بھی روشنی ڈالی جاتی کیونکہ فراق کی روپ میں شامل رباعیاں متنازع ہیں اور جعفر علی خاں اثر نے اس پر روشنی بھی ڈالی ہے۔ اس کے باوجود پروفیسر محمد حسن نے فراق فہمی کے سلسلے میں جو نئے گوشے تلاش کیے ہیں جن کی طرف اس سے قبل توجہ نہیں دی گئی تھی وہ بلاشبہ ان کا اہم کارنامہ ہے۔

■

Dr. Raihan Hasan, 23/237, Banjari Tola, Victoria Street, Lucknow - 226003

بے بی تبسم

ساغر نظامی کی قومی شاعری کا جائزہ

ساغر نظامی نے اردو شعر و ادب کے لیے کچھ ایسے کام کیے ہیں، جن کی انفرادیت مسلم ہے اور جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ الگ بات ہے کہ تقسیم ملک سے کچھ لوگوں کو فائدہ پہنچا اور کچھ لوگوں کو نقصانات اٹھانے پڑے۔ مجھے یہ لکھنے میں کوئی تامل نہیں کہ پاکستان میں علامہ اقبال اور حفیظ جالندھری کی جو عزت افزائی اور پذیرائی ہوئی وہ ہندوستان میں جوش اور ساغر نظامی کو حاصل نہ ہوسکی۔ اس کی ایک وجہ تو نظریۂ پاکستان کی مخالفت تھی۔ دوسرے جواہر لعل نہرو سے ان کی قرابت۔ یہی وہ سیاسی حالات اور منافرت کی لہر تھی جس نے جوش اور ساغر کی مٹی پلید کی اور ان کی ادبی خدمات سے صرفِ نظر کیا گیا۔ لیکن دیر سے ہی سہی ساغر کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا جانے لگا ہے اور اب اہلِ علم حضرات نے ان کی نگارشات کی طرف توجہ دینی شروع کردی ہے۔ اس سلسلے میں کئی کام ان پر ہوئے ہیں لیکن ان کی حیات اور شاعری کے کئی گوشوں سے ہنوز پردہ اٹھنا باقی ہے۔ میں نے اپنی بساط بھر پوری کوشش کی ہے کہ ان کی زندگی کے ان گوشوں پر بھی نظر ڈالوں جن پر دوسروں کی نگاہیں نہیں جاسکی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اردو ادب کی تاریخ ساغر نظامی کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ وہ مختلف الجہات شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی مٹی اور اس میں بسنے والے انسانوں سے پیار کیا تھا اور یہ پیار اس قدر سچا تھا کہ ان کی شخصیت ہر دل عزیزی کا لطف اٹھاتی رہی اور ساغر یہ کہتے نظر آئے:

غنچے نے، نکہت و شبنم نے، شمیم و گل نے
سارے گلشن نے مجھے وقت سحر یاد کیا

اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور جب جب قومیت اور انسانیت کی بات ہوگی، ساغر نظامی کو یاد کرنا وقت کی مجبوری ہوگی، ان کی دیدہ وری اور کارنامہ ہائے ادب کا وسیع منظر نامہ ایک ایسے انسان کی تصویر آنکھوں کے سامنے لاتا ہے جو ہمیشہ سمندر میں چٹان کی مانند سینہ سپر رہا اور زندگی کے مصائب و آلام اس سے ٹکراتے رہے۔

ساغر نظامی وطن پرست انسان تھے اور ان کے اندر جو فن کار زندہ تھا وہ اردو ادب کی تمام اصناف کا عاشق بھی تھا اور اسے نظم و نثر دونوں پر قدرت حاصل تھی۔ وہ بیک وقت اعلیٰ پایہ کا نظم گو اور دلنواز غزل گو کے ساتھ ساتھ حمد و نعت اور رباعی و گیت کا بھی شاعر تھا۔ کہانیاں بُننا بھی جانتا تھا اور صحافت کے معیار و میزان کا بھی پاسدار تھا۔

ساغر نظامی نے اس عہد میں اپنی آنکھیں کھولیں جب اردو ادب داغ کی غزلوں کا اسیر تھا اور اقبال کی غزلوں میں بھی نظم کی چاشنی کا لطف اٹھایا جارہا تھا اور ہندوستان کی تاریخ 'پر پیچ راستے' سے گزر رہی تھی۔ ساغر نظامی کا تعلق نجیب الطرفین افغانی خانوادے سے تھا۔ ان کی شخصیت کی وجاہت اور دل آویزی، ان کی ثابت قدمی اور اولوالعزمی خاندانی ورثے کا حصہ بھی کہی جاسکتی ہیں۔

ساغر نظامی کی ابتدائی تعلیم تو گھر پر ہوئی بعد میں علی گڑھ کے ہائی اسکول میں داخلہ بھی ہوا لیکن وطن کی محبت کے جذبے سے سرشار یہ بچہ بھی عدم تعاون کی تحریک کا استقبال کرنے کے لیے آگے بڑھا اور اس نے رسمی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا۔ علی گڑھ کے قریب کے ایک گاؤں 'سومنا' میں ساغر کا بچپن گزرا تھا۔ جہاں ہندو مسلمان بلا تفریق مذہب و ملت بھائی کی طرح رہتے تھے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسی خوبصورت ماحول نے لاشعوری طور پر ساغر کی ذہنی تربیت اور شخصیت کی داخلی اور خارجی تعمیر و تشکیل نے بڑا اہم رول ادا کیا اور یہ اثرات ان کی زندگی میں ہمیشہ روشن رہے۔

ساغر فطری شاعر تھے اور اس کا اندازہ ساغر کے استاد علامہ سیماب اکبر آبادی کو بھی تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سیماب کی نظروں نے ساغر میں اچھال پیدا کیا اور صحافت سے شاعری تک ان کا راستہ ہموار کیا۔ ساغر کے شعری مجموعہ 'بادۂ ساغر' پر یہ تحریرِ صداقت درج کردی جو کسی سند سے کم نہیں:

''ساغر! مجھے تیرے روحانی منصب کا ادراک اور تیرے مادّی مدارج کا عرفان ہے۔ تو ان نوجوانوں میں سے ہے جنھیں فطرت شاعر بنا کر ملک و اقوام کی رہنمائی کے لیے دنیا میں بھیجتی ہے اور جو ایک دن مصلح کے قابل رشک خطاب سے فائز ہوتے ہیں۔ تو حساس ہے، تیرا ذہن بیدار اور تیرا کیریکٹر معصوم و سعادت مند ہے۔ تیری

نظر وسیع اور تیری نگاہ حقیقت شناس ہے۔''

علامہ سیماب اکبرآبادی کی مذکورہ بالا تحریر میں جو پیشن گوئی تھی وہ سچ ثابت ہوئی لیکن اس کہانی کا تاریک پہلو استاد وشاگرد کی ناچاقی قرار دیا جاسکتا ہے۔ساغر کو ادبی اعتبار سے بہت ہی کم عمری میں شہرت ومقبولیت نصیب ہوئی۔ اس کا اندازہ خواجہ حسن نظامی کے اخبار 'منادی' پر چھپی خبروں سے بھی ہوتا ہے اور خم خانۂ جاوید میں لالہ سری رام کے جملے اس کے گواہ بنتے ہیں۔

علامہ سیماب کی شراکت سے 'پیمانہ' کا اجرا ساغر کے صحافتی سفر کا آغاز ہے اور 'لیں گے سفر کا جائزہ ختم سفر کے بعد' کے مصداق جب 'پیمانہ سے ایشیا' تک کے سفر پر نگاہ ڈالی جاتی ہے اور علی گڑھ پنچ اور استقلال کو پڑاؤ کے طور پر محسوس کیا جاتا ہے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ساغر کے قلم کی صدا ساغر کے قلم کی آواز نہیں تھی بلکہ ہندوستان کی روح اس کے اندر پیوست تھی۔

ساغر نظامی بلاشبہ وطن پرست تھے اور ان کی تحریریں ہر دو صورتوں میں اس کا پرتو ہیں۔ یہ کہنا کسی بھی طور غلط نہیں کہ وہ جنگ آزادی کے ایسے سپہ سالار تھے جن کے نغموں نے نہ جانے کتنے دلوں کو وسعتیں بخش دیں۔ کتنے جاں باز کے دلوں کی دھڑکنوں نے ان کے گیت گنگنائے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کانگریس کے بیشتر جلسوں کا آغاز ساغر نظامی کی نظموں سے ہوا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں کہ یہ وہ زمانہ تھا جب اچھے اچھے ثابت قدم بھی لڑکھڑا جاتے تھے۔ انگریز سرکار کے خلاف لب کشائی اپنی اور ساتھ ہی ساتھ اپنے لواحقین کی زندگی کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ ان کی اولوالعزمی کا ہی نتیجہ تھا کہ اس وقت کے سیاسی رہنماؤں پنڈت جواہر لعل نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سید محمود، سروجنی نائیڈو اور مولانا مظہرالحق سے ان کے قریبی تعلقات تھے۔ ساغر کی بے باکی، اعلیٰ ظرفی اور ہمت عالی نے انھیں بحیثیت قومی شاعر تسلیم کرنے پر مجبور کیا اور انھیں ہر دل عزیزی حاصل ہوئی۔

بقول ڈاکٹر فاروق بخشی ان کی پہلی شہرت انھیں عروس البلاد بمبئی کے فلمی نگار خانوں تک لے گئی لیکن ساغر نظامی اپنی زندگی کا جو نصب العین بنا چکے تھے اور اپنے لیے جو راستہ منتخب کر چکے تھے اس سے گریز ان کے مزاج کے خلاف تھی۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان تقسیم وطن کے کرب سے دوچار تھا اور اس سلسلے میں ہونے والے ہولناک مناظر فسادات کی شکل میں رونما تھے۔ ساغر نظامی بھی اس سے محفوظ نہیں رہے۔ جب پنڈت جواہر لعل نہرو کو ان کے مصائب کا علم ہوا تو انھوں نے ساغر نظامی کو آل انڈیا ریڈیو، دہلی سے منسلک کر دیا۔ ساغر کے لیے یہ ایک اچھا پلیٹ فارم ثابت ہوا اور انھوں نے کئی قابل ذکر کارنامے انجام دیے۔ جس کا تفصیلی ذکر اس مختصر سے مقالے میں ممکن نہیں۔

ساغر نظامی وضع دار تھے اور ان کی شخصیت پرکشش اور اعتدال پسند تھی۔ انھوں نے اپنی زندگی کو کئی خانوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور ایک کا دوسرے میں دخول ممکن نہیں تھا۔ انھیں اپنے خاندان کی ذمے داری کا احساس بھی تھا اور وطن کی محبت انھیں انسانیت کو اجاگر کرنے کے لیے مجبور کرتی رہتی تھی۔ ساغر نے دونوں کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیے اور اناسی سال کی عمر میں پہنچ کر 2 فروری 1984 کو دہلی میں انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور وطن کی مٹی سے محبت کرنے والا یہ شاعر مٹی کی آغوش میں پناہ گزیں ہوگیا:

میں اسی مٹی سے اٹھا تھا بگولے کی طرح
اور پھر اک دن اسی مٹی میں مٹی مل گئی

ساغر مزاجاً رومانی تھے لیکن وطن پرستی اور تحریکِ آزادی سے ہم آہنگی ان کا ورثہ تھی۔ انھوں نے جب اپنی تخلیقات کے ساتھ ادبی منظرنامے پر اپنی شراکت درج کرائی اس وقت دو اہم تحریکیں فعال تھیں۔ حالات کی تبدیلی کے پیش نظر انھوں نے ترقی پسندی کی طرف رجوع کیا۔ انھوں نے لکھنؤ میں منعقد پہلی کل ہند ترقی پسند مصنّفین میں شرکت بھی کی اور ان نوجوانوں کی حوصلہ افزائی بھی کی جو وارد تھے اور وہی بعد میں اس تحریک کے مستحکم ستون ثابت ہوئے لیکن ساغر نظامی کا اپنا ایک مزاج تھا اور اس کے خلاف انھوں نے کبھی سفر نہیں کیا۔ یہی وجہ رہی کہ ترقی پسندی تو ان کا خاصہ رہی چونکہ وہ حق پسند تھے لیکن اس تحریک کو خالص مارکسی نظریات کی تحریک کہنے والوں کے خلاف انھوں نے علم بغاوت بلند کرنے میں عار بھی محسوس نہیں کیا۔ میرے خیال میں ترقی پسندوں سے ناچاقی کی یہ بڑی وجہ رہی ہوگی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوسان میں کئی سیاسی اور سماجی تحریکیں بیدار اور فعال تھیں۔ شاعری میں نظم گوئی کا رجحان حاوی ہوا تھا اور غزل گوئی بے اعتنائی کا شکار بھی ہوئی تھی۔ بذات خود ساغر نے بھی نظم کے فروغ میں ہی حصہ لیا لیکن غزل کی دلربائی سے بھی دامن نہیں بچا سکے۔ ساغر کے اظہار بیان کے لیے یوں بھی نظم کا فارم زیادہ مناسب تھا۔ جس پیغام کو لے کر وہ سینہ سپر تھے اس کے لیے نظم کی ہیئت کا اپنانا ضروری بھی تھا لیکن ساغر نے رائج ہیئتوں پر ہی بس نہیں کیا بلکہ ان میں وسعت پیدا کی اور ہر دو صورتوں یعنی اسلوب و ہیئت کی سطح پر راہ ہموار کی جو یقیناً آنے والے ترقی پسندوں کے لیے سودمند ثابت ہوا۔

بائیں سے دائیں: نریش کمار شاد، کیلاش چندر ناز، طالب دہلوی، خوشتر گرامی، بلراج حیرت، ساغر نظامی، طالب چکولی وغیرہ

اردو شاعری میں طویل نظم نگاری تو قلی قطب شاہ کے وقت سے ہی مل جاتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان طویل نظموں میں مثنویاں ہی اہم قرار پاتی ہیں اور موضوعاتی سطح پر مثنویاں بیشتر مافوق الفطری عناصر کے ذکر سے بھری پڑی ہیں۔ مثنوی کے علاوہ مسدس کا فارم عام طور پر مراثی کے لیے مخصوص ہو چکا تھا۔ موضوعاتی سطح پر حالی اور آزاد نے تبدیلی کو رائج کیا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ ساغر نے موضوعاتی سطح پر نہ صرف اسے مزید وسعت عطا کی بلکہ اس صنف میں کچھ ایسے کارنامے پیش کرنے میں کامیاب رہے جسے اردو ادب کی تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کی طویل نظموں میں نہرونامہ، ماضی اور مشعلِ آزادی اہمیت کی حامل ہیں۔

'نہرونامہ' کا مطالعہ اس بات کی وضاحت کرتا نظر آتا ہے کہ یہ محض پنڈت نہرو کی شخصیت اور ان کی موت کا مرثیہ نہیں ہے بلکہ اس نظم میں زندگی وموت کے فلسفے کو بھی اجاگر کیا گیا ہے اور اس بات کا اشارہ یہ بھی ہے کہ کسی ایک شخص کے قافلے سے بچھڑ جانے کی وجہ سے قافلہ رکتا نہیں خواہ وہ بڑے سے بڑا ہی کیوں نہ ہو۔ انھوں نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ جس طرح چراغ سے چراغ روشن ہوتا رہتا ہے ٹھیک اسی طرح بچھڑنے والے کی روشنی تو برقرار نہیں رہتی لیکن اس کا پرتو کہیں نہ کہیں جلوہ گر ضرور ہوتا ہے۔ اس نظم پر کئی اہم نقاد نے اقبال کی نظم 'ساقی نامہ' کی جھلک کا ذکر بھی کیا ہے اور یہ غلط بھی نہیں۔ ساغر کی شاعری میں ایسے مقام آتے ہیں جہاں یہ احساس ہوتا ہے اور یہ میرے خیال میں عیب نہیں۔ چراغ سے چراغ یوں ہی نہیں جلتے لیکن ہر چراغ کی اپنی روشنی کا

کوئی بھی منکر نہیں ہوسکتا۔

'ماضی' بھی ساغر کی طویل نظموں میں ایک ہے۔ جسے انھوں نے 1970-72 کے درمیان دہلی میں لکھا تھا۔ یہ نظم 17x27 سائز کے 57 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں ہیئت کی تبدیلی کو روا رکھا گیا ہے اور ارکان کی کمی وبیشی نظم کا عیب بنتی نظر نہیں آتی بلکہ ایک نئے آہنگ کی وجہ سے یہ تبدیلی اس نظم کا حسن کہی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ نظم زیور طباعت سے آراستہ نہ ہوسکی اور آج بھی یہ مخطوطے کی شکل ہی رکھتی ہے۔

اس بات کا ذکر پہلے بھی کر چکی ہوں کہ ساغر کا شعری سفر اس وقت شروع ہوا جب اردو شعر وادب پر رومانیت کی تحریک کا غلبہ تھا لیکن ساغر کی رومانیت کا مطالعہ اس بات کو واضح کر دیتا ہے کہ ساغر کی رومانیت ان کے ہم عصروں سے مختلف تھی۔ ساغر کے یہاں یاسیت اور قنوطیت کی جگہ رجائیت کا پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ بھی رہی کہ وطن سے ان کی والہانہ محبت اور ہندوستان کی سرزمین سے والہانہ عقیدت نے انھیں خیالی رومانیت سے دور رکھا اور حقیقت پسندی کی طنابوں کو مضبوط کرنا ان کا شیوہ بن گیا۔

'مشعل آزادی' ان کی تیسری طویل نظم ہے۔ اس نظم میں رزمیہ نشان اس کا حسن ہے۔ اسے ہندوستان کی جنگ آزادی کی مکمل تاریخ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن ساغر نظامی کے مطابق انھوں نے تاریخی ترتیب کا بھرپور لحاظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مختلف کرداروں کے ذریعے ان واقعات، شخصیات اور تحریکات کا ذکر شامل ہے جو ہندوستان کی آزادی میں اہمیت کی حامل رہی۔ اس نظم میں 1857 تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر مظفر حنفی اس طویل نظم میں ویسی نظمیں بھی اس کا حصہ بنی ہیں جو پہلے سے موجود ہیں لیکن اس میں ضروری ردّوبدل سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس نظم کا دوسرا حصہ جس میں 1947 تک کے واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے جسے ساغر نے بیماری کے عالم میں بستر علالت پر مکمل کیا تھا۔ اس کی اشاعت ہنوز نہیں ہوسکی ہے۔

ساغر نے نظموں کے علاوہ جن دوسری اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ان میں گیت، غزل اور رباعی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ویسے ان کی شاعری میں حمد ونعت اور منقبت کی بھی تعداد کم نہیں جو اُن کی مذہب سے وابستگی کا پتہ دیتی ہے۔

ساغر کے گیت مشاعروں کے حوالے سے کافی مقبول ہوئے۔ اس کی وجہ ان کا محبوب ترین موضوع تو رہا ہی لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے گیت کے لیے مترنم بحروں کا استعمال کیا اور اس کی فضا بھی ہندوستانی ہی رکھی اور الفاظ کے استعمال میں بھی انھوں نے کافی احتیاط برتی جس کی وجہ سے ان کے گیتوں کے لوگ مداح ہوئے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غزل میں ساغر فیض، فراق اور جذبی کی طرح اپنی کوئی الگ راہ نہ نکال سکے لیکن اس بات سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کی غزلوں کے ترنم اور تیور نے ایک ایسا نظارہ تو ضرور پیدا کیا کہ اردو غزل سے شغف رکھنے والوں کے لیے دل کی دھڑکن ثابت ہوئی۔ یہ بابت بھی درست ہے کہ ساغر نظامی، رباعی میں فراق کے مقام ومرتبے تک نہیں پہنچ سکے اور اس کی بنیادی وجہ موضوعات کی پیش کش بھی رہی۔ لیکن ساغر

کی انفرادیت وعظمت اس بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے اردو کو دو منظوم ڈراموں سے نوازا۔ 'انارکلی' اور 'شکنتلا' کا ذکر نہ کرنا بددیانتی ہوگی۔ 'شکنتلا' سنسکرت کا ڈرامہ ہے اور اس کے تخلیق کار کالی داس کافی معروف رہے۔ کالی داس کے اس عجوبہ روزگار ڈرامہ کو ساغر نے اردو میں منتقل کر کے ایک بڑا کام کیا۔ ترجمے کا فن ایک مشکل فن ہے اور ساغر نے تو منظوم ترجمہ کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ انتہائی دشوار مرحلوں سے گزرنے کے عادی رہے ہیں۔ اس ترجمے کا کمال یہ ہے کہ اس میں سنسکرت کا مزاج اور اردو زبان کا لوچ متاثر نہیں ہوا۔ یہی وجہ رہی کہ یہ ترجمہ مقبول بھی ہوا اور ملک کے مشاہیر ادبا نے ان کے اس کارنامے کو کافی سراہا۔

'انارکلی' کو امتیاز علی تاج نثر میں پیش کر چکے تھے۔ ساغر نے اس ڈرامے کا بھی منظوم ترجمہ پیش کیا۔ ساغر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس رومانی داستان میں سماجی معنویت کا رنگ ڈال کر اس کہانی کو مزید پرکشش بنا دیا۔ بحروں کا تغیر و تبدل یہاں بھی موجود ہے جس سے غنائیت پیدا کی گئی ہے۔

شاعر کے علاوہ نثر نگار کی حیثیت سے بھی ساغر کی حیثیت منفرد رہی ہے۔ ابتدا میں سیماب اکبرآبادی کے ساتھ انھوں نے آگرہ سے 'پیمانہ' جاری کیا۔ 'پیمانہ' ان کی صلاحیتوں کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے۔ انھوں نے اس رسالے کو دوسری مرتبہ بھی تنہا نکالا لیکن اسے بند کرنا پڑا بعد میں 'مستقبل' اور 'استقلال' جیسے سیاسی اخبارات نکالنے کی کوشش بھی کی لیکن کامیابی نصیب نہ ہوسکی۔ ان کی صحافت کی معراج 'ایشیا' ثابت ہوا۔ جو ان کی ادارت میں میرٹھ سے شائع ہوا کرتا تھا۔ اس کی فائلیں آج بھی کئی جگہوں پر موجود ہیں جو ان کی صحافت کے جوہر ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔

ساغر نے مختصر کہانیاں بھی لکھیں جو 'کہکشاں' کے عنوان سے کتابی صورت میں 1934 میں منظر عام پر آئیں۔ ان کہانیوں پر رومانی اثرات حاوی ہیں اور نثر میں شاعری کی خوشبو شامل ہے۔ شاید اسی وجہ سے معروف رسالہ 'نقوش' کے مدیر محمد طفیل نے 1954 میں ساغر کو لکھے گئے خط میں لکھا تھا کہ ''آپ کی نثر میں بھی نظم اور غزل کا سا مزہ ہے۔''

ساغر کے ریڈیو فیچرز اور مقالات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ساغر کے کئی اہم مقالات مختلف ادبی موضوعات پر موجود ہیں جو ان کے عمیق مطالعے کی نشاندہی کرتے ہیں۔ 'شکنتلا' اور 'انارکلی' پر جو تحریر انھوں نے لکھی ہے اس کی معنویت روشن ہے اور اسے اردو ادب کی تاریخ فراموش نہیں کر پائے گی۔

ان کی مکالمہ نگاری بھی کافی مقبول ہوئی۔ نیز ان کے خطوط کی عبارتیں ان کی نیک نیتی، روشن خیالی، حب الوطنی اور انسان دوستی کو بھی واضح کرتی ہیں۔ اس مختصر ترین محاسبے کے بعد ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ساغر نظامی اپنی قومی شاعری کی بنیاد پر ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے اور ان کے منجملہ کارنامے ان کے ہم عصروں میں ہر نہج سے زیادہ پراثر، اہم اور مختلف الجہات نوعیت کے ہیں۔ اس لیے ہر صورت میں وہ اپنے ہم عصروں میں ذرا فاصلے پر کھڑے نظر آتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو انھیں منفرد اور ممتاز بناتی ہے۔

Bebi Tabassum, Research Scholar,
Dept of Urdu, Sudarshan Public,
heekanpur, Bhagalpur - 812001(Bihar)

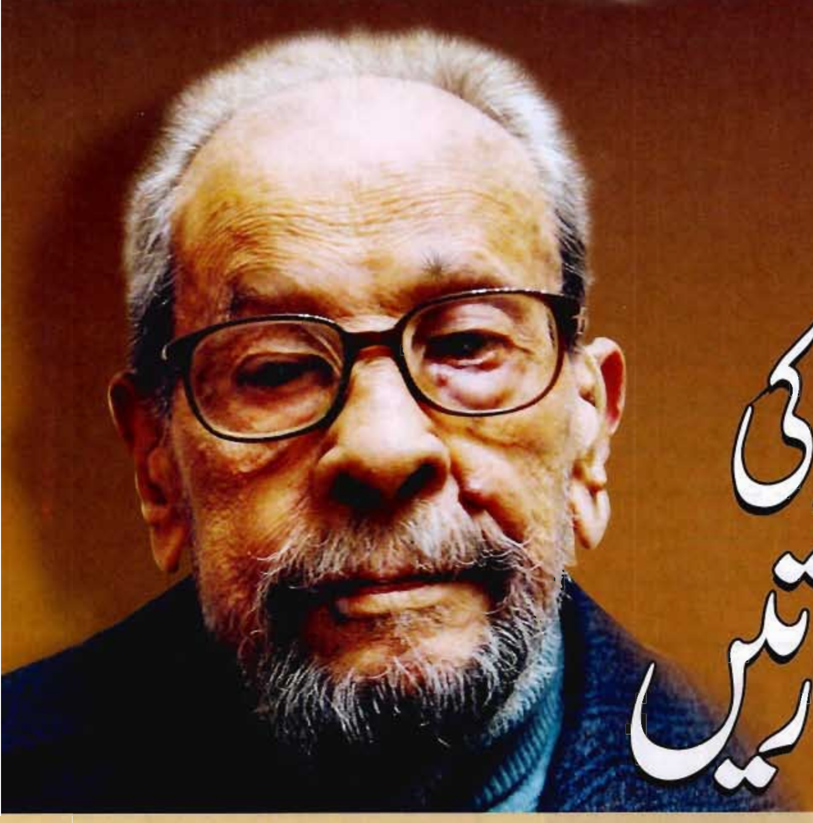

محمد جسیم الدین

نجیب محفوظ کی روشن عبارتیں

لفظ 'ادب' عربی زبان سے ماخوذ ہے۔ اردو کی طرح عربی میں بھی نثر اور شاعری کے حوالے سے استعمال ہوتا ہے۔ عربی ادب کی تاریخ کا کینوس دورِ جاہلیت سے موجودہ دور تک بہت وسیع ہے۔ عربی ادب کی ابتدا پانچویں صدی میں ہوئی۔ اس کے کل پانچ ادوار ہیں۔ جاہلی دور، اموی دور، عباسی دور، اندلسی دور (فاطمی اور ترکی ادوار بھی اسی دور میں شامل ہیں) اور جدید دور۔ ہم یہاں دورِ جدید میں عربی نثر نگاری میں نجیب محفوظ کی کاوشوں کا احاطہ کریں گے۔ عربی ادب میں کئی طرح کے رنگ نمایاں نظر آتے ہیں۔ ابتدائی دور میں یہ بتوں کی پرستش اور قدیم رسم و رواج کی عکاسی کرتا ہے۔ بعد کے ادوار میں یہ جنگی، علمی، رومانوی، سیاسی اور دیگر رنگوں سے آشنا ہوتا ہے۔ عربی شعر و ادب کے کینوس پر کہیں خوشی اور مسرت کے رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں اور کہیں یاس اور اذیت بھی اپنا چہرہ لیے اس میں جھلکتی ہے۔ جدید عربی ادب مختلف فنی جمالیات کا حسین مرقع ہے، نثر ہو یا شعر عربی ادب کا دائرہ شروع ہی سے وسیع رہا ہے، تاہم جدید مصری ادب کی بات ہی کچھ اور ہے۔ افسانے سے لے کر ڈرامے تک اور قصہ نگاری سے لے کر ناول نگاری تک عربی ادب ایک بحر بیکراں ہے، جس کی وسعتوں اور گہرائیوں کا اندازہ لگانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح عربی ادب میں بھی بڑا ذخیرہ موجود ہے، دنیا کی لائبریریاں عربی زبان و ادب کی کتب سے مالا مال ہیں، لیکن ان میں چند مصنّفین ایسے ہیں جن کی تحریریں مرکز نگاہ بنی ہوئی ہیں۔ نجیب محفوظ انھی قدآور شخصیات میں شمار کیے جاتے ہیں، جن کی ناول نگاری کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔

نجیب محفوظ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز چھوٹے مضامین اور مقالات سے کیا، انھوں نے طالب علمی کے زمانے سے ہی فلسفیانہ موضوعات پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے بیشتر مضامین سلامہ موسیٰ کے ادبی میگزین 'المجلۃ الجدیدۃ' میں شائع ہوتے رہے، چوں کہ فلسفے سے انھیں بے حد لگاؤ تھا، لہٰذا ان کے ابتدائی مضامین میں فلسفے کا عنصر غالب دکھائی دیتا ہے، مگر یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک برقرار نہ رہا اور جلد ہی انھوں نے اپنا ذہن عربی افسانے اور ناول نگاری کی طرف منتقل کر لیا، جس نے نجیب محفوظ کو شہرت کی تمام بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ناول نگاری کا فن جدید عربی ادب میں شارٹ اسٹوریز یا افسانہ نگاری سے شروع ہوا ہے، یوں تو عربی ادب میں وقائع نگاری کا فن قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے، 'الف لیلہ و لیلہ' اس کی بہترین مثال ہے۔ پھر مقامات ہمدانی و مقامات حریری نے اسے جلا بخشی اور کلاسیکی عربی ادب میں روح پھونک دی، مگر انیسویں صدی کے نصف تک جدید عربی ادب افسانہ نگاری و ناول نگاری کے اسلوب سے نا آشنا تھا، نپولین بوناپارٹ کے حملے نے مصر کی سیاسی، سماجی و ثقافتی زندگی کو یکسر بدل کر رکھ دیا، جس نے عالم عرب میں انقلاب برپا کر دیا، قدیم تہذیب و ثقافت کی کایا پلٹ دی اور مصری ادب کو نئے علوم و فنون سے روشناس کیا۔

1911 میں پیدا ہونے والے نجیب محفوظ کو پوری عرب دنیا کا بہترین ادیب اور دانشور سمجھا جاتا ہے، ناولوں، افسانوی مجموعوں، ڈراموں، اخباری کالموں، سفرناموں، یادداشتوں اور سیاسی تجزیوں سمیت ان کی پچاس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ بیسویں صدی کے ہنگامہ خیز ادوار کے دوران مصر کی سماجی تاریخ کی عکاسی کرنے والی یہ کتابیں دنیا کی دو درجن سے زائد زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ نجیب محفوظ کو ان کی ادبی خدمات کی بنیاد پر 1988 میں ادب کے نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ اچھا ناول نگار سیاسی اور سماجی طور پر باشعور ہوتا ہے۔ اس کی نظر سماج، معاشرے اور سیاست پر جمی رہتی ہے۔ وہ یہ دیکھتا رہتا ہے کہ معاشرے میں کیا تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ نجیب محفوظ نے سترہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا، لیکن جب ان کی پہلی تصنیف شائع ہوئی تو اس وقت ان کی عمر 38 سال تھی۔ انھیں 1988 میں نوبل انعام کے لیے منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر دیے گئے ایک انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ "مجھے یہ تو یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن عربی کے کسی ادیب کو نوبل انعام ضرور دیا جائے، لیکن مجھے دیا جائے گا، اس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔"

50 کے عہد میں نجیب محفوظ کا نام مقبول ادیب کے طور پر معروف ہو چکا تھا۔ ان کے ناول 'اولاد حارتنا' (ہمارے محلے کے لڑکے) کی اشاعت پر شدید مذہبی اعتراضات کیے گئے اور اس کے بعد نجیب محفوظ پر حملہ بھی کیا گیا۔ اس ناول کی اشاعت کے بعد انھوں نے پانچ سال تک کچھ نہیں لکھا اور جب ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا "اب وہ دنیا ہی ختم ہو چکی ہے جسے میں لکھتا تھا۔" اسے انقلاب مخالف بھی تصور کیا گیا۔ لیکن شاید ایسا نہیں تھا، کیونکہ جب الاہرام میں ان کا ناول 'اولاد حارتنا' شائع کرنا شروع کیا تو

شدید تنازعات پیدا ہو گئے۔

نجیب محفوظ کے یہاں مصر اور مصری دونوں کی ایسی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اصل میں یہی نجیب محفوظ کی حقیقت نگاری ہے۔ وہ جس چیز کو بیان کرتے ہیں اسے روز کا دیکھنے والا بھی اپنے آپ سے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے "میں نے یوں کیوں محسوس نہیں کیا۔" انھوں نے کم از کم پچاس کے قریب ناول لکھے اور سیکڑوں کہانیاں۔ اس کے علاوہ دو سو سے زیادہ مضامین لکھے ہیں، لیکن ان ناولوں اور مضامین کی تفصیل کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے۔ نجیب محفوظ نے 40 کی دہائی میں ناول نگاری طرف اپنی توجہ مبذول کی، چناں چہ 1939 سے لے کر 1949 تک ان کے کئی ناول منظر عام پر آئے، جنھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، ان میں سے زیادہ تر فرعونی تہذیب کی تاریخ سے وابستہ ہیں، چوں کہ ان کی والدہ اکثر انھیں اپنے ساتھ مصری میوزیم 'اہرام مصر' ابوالھول اور دیگر تاریخی مقامات دکھانے لے جایا کرتی تھیں، ان مقامات کے نقوش نجیب محفوظ کے ذہن و دماغ میں رچ بس گئے تھے، لہٰذا ان کا ذہن فرعونی تاریخ کی طرف ہی راغب ہوا اور انھوں نے اپنے ناول کا رخ اسی طرف موڑ دیا اور اس موضوع پر یکے بعد دیگرے تین اہم شاہکار ناول وجود میں آئے 'عبث القدار' (1939)، 'رادوبیس' (1942)، اور 'کفاح طیبۃ' (1944) ان ناولوں میں نجیب محفوظ نے مصری فرعونی تاریخ کو موضوع بحث بنا کر مصری عوام کو ان کی عظمت رفتہ کی یاد دلائی ہے۔

تاریخی ناولوں میں نجیب محفوظ نے اپنی پوری توجہ سماجی ومعاشرتی اور حقیقت پسند ناولوں پر مرکوز کردی۔ غایت درجہ حقیقت پسندی کے ساتھ مصری سماج ومعاشرے کا بہت ہی باریکی سے جائزہ لینا شروع کیا۔ مصری عوام کے روزمرہ کے مسائل، بچوں، نوجوانوں، مرد وعورتوں کے تعلقات اور خانگی زندگی کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کئی ناول سلسلہ وار منظر عام پر آئے۔ جن میں 'القاہرۃ الجدیدۃ' (1945)، 'خان الخلیلی' (1945)، 'زقاق المدق' (1947)، 'السراب' 1948) اور 'بدایۃ ونہایۃ' (1949) اہمیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان ناولوں میں نجیب محفوظ نے قاہرہ کے متوسط گھرانوں اور محنت کش طبقات کی زندگی کو بہ حسن وخوبی ادبی جامہ پہنایا ہے۔ 'القاہر الجدیدۃ' میں نجیب محفوظ نے یونیورسٹی کے طلبہ کے احساسات وجذبات کی بہترین ترجمانی کی ہے، ان کے آپسی تعلقات کی پرکیف مکالمات کے ذریعے منظر کشی کی ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ نئی تہذیب اور ماڈرن زمانے میں لوگوں کے

1911 میں پیدا ہونے والے نجیب محفوظ کو پوری عرب دنیا کا بہترین ادیب اور دانشور سمجھا جاتا ہے، ناولوں، افسانوی مجموعوں، ڈراموں، اخباری کالموں، سفرناموں، یادداشتوں اور سیاسی تجزیوں سمیت ان کی پچاس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

خیالات ونظریات میں کس طرح تبدیلی آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے مشرقی اقدار کے حاملین کیسے مغربی اقدار کے دلدادہ ہو جاتے ہیں۔

نجیب محفوظ اپنے استاد سلامہ موسیٰ (1558-1587) کے افکار سے حد درجہ متاثر رہے ہیں۔ سلامہ موسیٰ کی شہرت عربوں سے اور عروبیت (عربوں کی ٹھیٹ اسلامی ثقافت) سے نفرت کے حوالے سے جانی جاتی ہے۔ عربی میں اس کے لیے 'شعوبیۃ' کی اصطلاح رائج ہے۔ سلامہ موسیٰ مغرب سے نسبت جوڑنے میں اور مصر میں مغربی تہذیب کا بیج بونے میں سب سے نمایاں نام ہے جبکہ نجیب محفوظ اس سے ایک قدم آگے مصر کا رشتہ عربوں اور اسلام سے توڑتے ہوئے فرعونی تہذیب سے جوڑنے میں سب سے بڑا نام ہے۔ جس وقت نجیب محفوظ کو ادب کے نوبل پرائز کے لیے منتخب کیا گیا تھا اس وقت فرعونی تہذیب کے احیاء میں سب سے اونچی آواز نجیب محفوظ کی ہوا کرتی تھی۔ نوبل پرائز کے انتخاب تک نجیب محفوظ کا تخلیقی کام مصر اور عربی اخلاقیات کی قدر وقیمت گھٹانے تک محدود تھا۔ نجیب محفوظ اس بات کا داعی تھا کہ انسان پر 'اخلاقیات' کی پابندیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ نجیب محفوظ کے الفاظ میں:

"إنّه ليس من مصلحة الانسان أن يعيش في قفص من الواجبات الاخلاقية" (یہ بات انسان کی بھلائی میں نہیں ہے کہ وہ اخلاقی اقدار کی بہت سی پابندیوں کے قید خانے میں دب کر زندگی گزارے)۔

عالم اسلام کا عموماً اور اہل اسلام کا خصوصاً اسرائیل سے جو تنازع ہے اس سے ہر کوئی آگاہ ہے۔ نجیب محفوظ کی ادبی خدمات میں مسئلہ فلسطین کے لیے کوئی خاطر خواہ کام دیکھنے کو نہیں ملتا بلکہ نجیب محفوظ کی آرا سے مسئلہ فلسطین کو نقصان ضرور ہوا ہے۔ نجیب محفوظ نے بارہا اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ وہ اسرائیل سے معاہدہ کرنے کا انور سادات سے پہلے مؤید رہا ہے۔ انور سادات سے پہلے جمال عبدالناصر نے جنگ بندی سے پہلے اپنے بیان میں کہا تھا کہ "مصر طویل جنگ کے لیے تیار ہے۔" صحافتی اصطلاح میں اس کے لیے 'حزب الاستنزاف' (War of Attrition) کی اصطلاح مستعمل ہے۔ نجیب محفوظ جمال عبدالناصر کے اس قسم کے بیانات کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ نجیب محفوظ کے بقول اسرائیل کے ساتھ مصر کی طویل جنگ سے ملک کا ہی نقصان ہونا ہے۔ ترقی کا عمل رک جائے گا اور مصر تہذیب وتمدن اور ٹیکنالوجی کے لحاظ سے بہت پیچھے رہ جائے گا۔ جنگ کر کے ہم نے دیکھ لیا، امن معاہدے کو آزمانے میں کوئی مضائقہ نہیں اور کیا بعید کہ یہودی ہمارے ساتھ 'صالح' پڑوسی کی طرح رہیں!

مصر اسرائیل معاہدہ طے پانے میں نجیب محفوظ کے بیانات بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ نجیب محفوظ اور اس کے ہم خیال طبقے نے اپنے بیانات سے امت پر سارے دروازے بند کر کے صرف ایک راستہ کھلا رکھا تھا اور وہ تھا مصر اسرائیل امن معاہدہ اور وہ بھی اسرائیل کی شروط پر!

ادب کے نوبل پرائز کے لیے نجیب محفوظ کی دوسری تخلیقات کے علاوہ ناول 'اولاد حارتنا' (ہمارے محلے کے بچے) کو بھی منتخب کیا گیا تھا۔ اس ناول میں انبیاء کرام کی جو کردار کشی کی گئی ہے اس نے نجیب محفوظ کی شخصیت پر بہت سارے سوالات چھوڑے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر ناول میں ایک کردار 'جبلاوی' کا ہے۔ نقاد کا خیال ہے کہ 'جبلاوی' کا اشتقاق 'جَبَل' بمعنی خَلَقَ سے کیا گیا ہے۔ یہ کردار ایک رمزیہ کردار ہے جس کی شخصیت میں خالقیت پائی جاتی ہے۔ نقاد کے نزدیک یہ رمز دراصل ادیب کی اپنی شخصیت کی ہے۔ انبیاء کرام کی کردار کشی اور صاحب تحریر میں 'خالقیت' کا وصف ہونے کی وجہ سے تادم تحریر یہ ناول بیروت میں تو فروخت ہوتا ہے، لیکن مصر میں اس کی اشاعت اور خرید وفروخت ممنوع ہے۔ نجیب محفوظ کے سارے کام میں یہودیوں پر کوئی تنقید نہیں ملتی ہے۔ جہاں تک یہودیوں کی تعریف کا تعلق ہے تو وہ واضح طور پر 'خان خلیلی' 'زقاق المدق' اور 'الحب تحت المطر' جیسے ناولوں میں موجود ہے۔ مصر سے نجیب محفوظ کی کلیات پانچ جلدوں میں شائع ہوئی ہے جو تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ ہمارے ہاں کچھ لوگ ان کا موازنہ پریم چند سے بھی کرتے ہیں جو محض اس بنا پر ہوسکتا ہے کہ ان کے موضوعات میں بھی افلاس کی مخالفت شامل ہے۔

■

Md Jasimuddin, Ph.D Scholar Department of Arabic University of Delhi, Delhi-110007
Residence: L-30C, 633Street No.9,Zakir Nagar, New Delhi-110025

نجیب محفوظ — مترجم: ظفر امام

نجیب محفوظ کے ناول 'شوگر اسٹریٹ' کا ستائیسواں باب

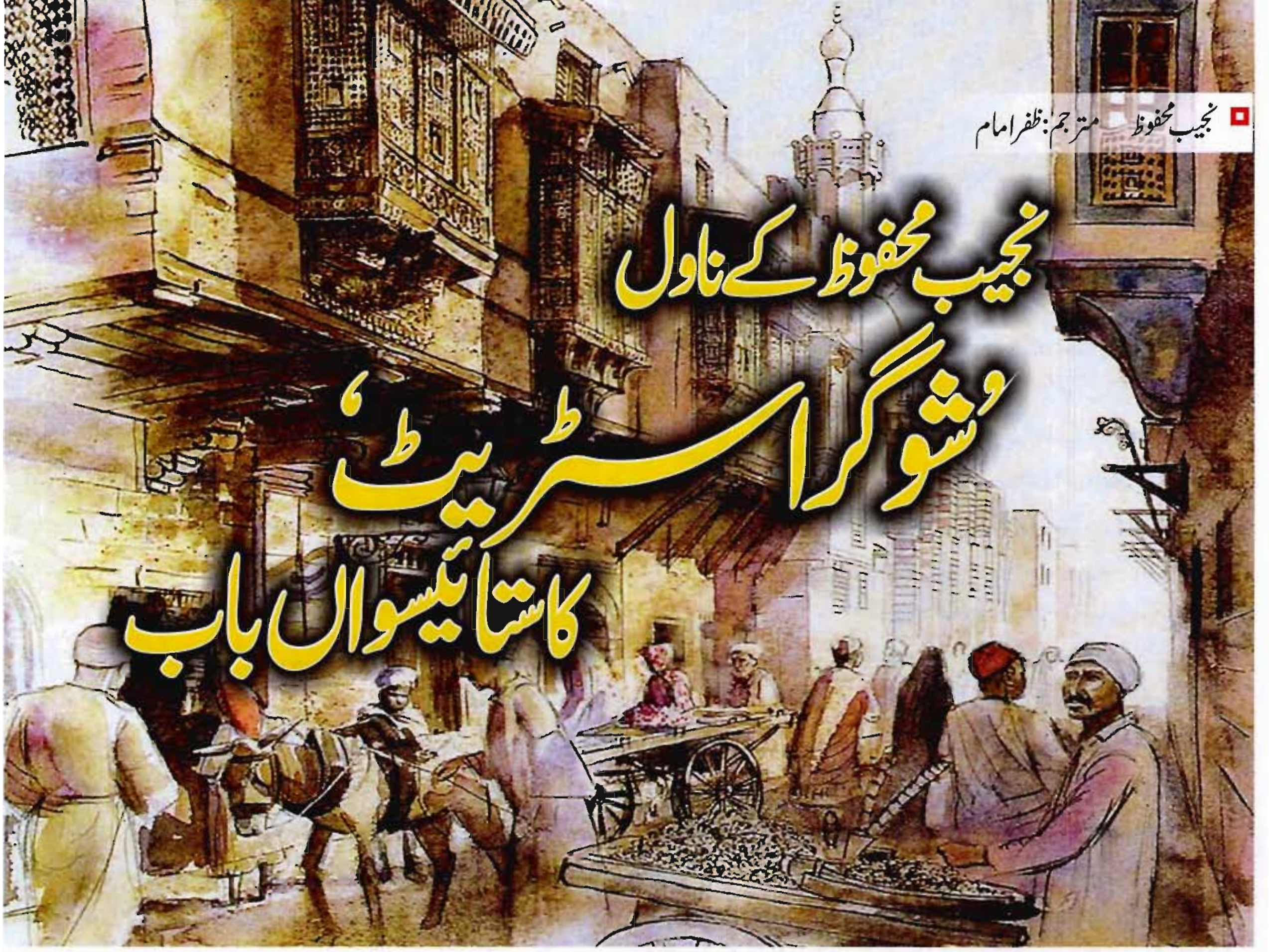

پھولوں کی بیل والی بالکونی میں ایک بڑی کرسی پر بیٹھ کر ال سید احمد عبدالجواد بار بار اسٹریٹ کو دیکھتا اور پھر الاحرام اخبار کو جو اس کے گودی پر پھیلا ہوا تھا۔ لت کے گچھوں سے نکلتی ہوئی روشنی کی شعائیں اس کے بڑے عبا اور ٹوپی پر پڑتی تھی۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا کہ بیٹھنے کے کمرے سے ریڈیو کی آواز سن سکے۔ وہ مضبوط لیکن ضائع سا لگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں بے جانی تھی جو اُسے غمگین بنا رہی تھی۔ اپنی بالکونی میں بیٹھ کر اسے ایسا لگتا تھا کہ وہ اسٹریٹ کو پہلی بار جان رہا ہے۔ ماضی میں اس نے اس زاویے سے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ماضی میں جب بھی گھر میں ہوتا وہ سوتا تھا۔ ان دنوں ریڈیو کے علاوہ یہ ہی اس کا سب سے پسندیدہ مشغلہ رہ گیا تھا بالکونی میں بیٹھا کٹی ہوئی دیوار سے شمال اور جنوب کی طرف دیکھتا۔ یہ اچھا، خوبصورت اور دلکش اسٹریٹ تھا۔ مزید یہ کہ اس کی ایک خاص خصوصیت ال۔ نہاس سے الگ کرتی تھی جسے وہ تقریباً پچاس سال سے اس دوکان سے دیکھتا تھا جو اس کی ملکیت تھی۔ یہاں نائی حسنین کی دوکان، درویش، سیم کے بیج فروخت کرنے والا، الفلی، دودھ والا، باأوھی شربت والا اور ابوساری جو ہلکا ناشتہ بھونتا، سب تھے۔ اس اسٹریٹ پر ان سب دوکانوں کا واقع ہونا زبان زد عام تھا اور اسی خصوصیت سے وہ 'پیلس واک' کے نام سے جانا جاتا تھا۔

''کیسے اچھے ساتھی اور ہمسائے ہیں۔ پتہ نہیں ان لوگوں کی کیا عمر ہے، حسنین جو نائی ہے۔ اس کا اچھا تن و توش ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس سے آدمی کی عمر کا پتہ چلتا ہے۔ تقریباً اس میں کچھ تبدیلی نہیں ہے۔ سوائے اس کے بال کے، لیکن وہ ضرور پچاس سے زیادہ کا ہوگا اور درویش کا کیا کہنا۔ وہ ہمیشہ گنجا تھا لیکن وہ ساٹھ کی دہائی میں ہے۔ کیا مضبوط اس کا جسم ہے۔ میں اسی طرح کا تھا جب میں ساٹھ کا تھا، لیکن میں سرسٹھ برس کا ہوں۔ میرے کمرے میں جو میری فوٹو لٹکی ہے، اسے جب دیکھتا ہوں تو یقین نہیں ہوتا میں وہی آدمی ہوں لیکن مجبور اندھا الفلی درویش سے عمر میں کم لیکن کوئی مدد کے بغیر اپنی چیزیں بیچنے کے لیے نہیں چل سکتا ہے۔ ابوساری بوڑھا آدمی ہے۔ لیکن وہ اب بھی کام کر رہا ہے۔ کسی نے اپنی دوکان نہیں چھوڑی ہے۔ یہ ہلا دینے والا تجربہ کسی آدمی کے لیے اپنا اسٹور چھوڑنا ہے۔ ان سب کے بعد آپ کے پاس کیا رہتا ہے، رات دن اپنے گھر میں بیٹھے رہنا۔ اگر میں اپنے گھر سے نکل سکوں محض ایک گھنٹے کے لیے بھی تو اچھا لگے گا۔ مجھے جمعہ کا انتظار کرنا ہوگا، تب مجھے ضرورت ہوگی اپنی چھڑی کی اور کمال کی جو میری مدد کرتا ہے۔ باأومی جو سب سے عمر میں کم ہے اس کا بڑھنا ماریام کی ماں کی وجہ سے ہوا اور میرا اس کا ساتھ ختم ہوا۔ آج وہ اس علاقے میں سب سے اچھی بلڈنگس کا مالک ہے۔ یہ ہی حشر ہوا مسٹر محمد رضوان کے گھر کا۔ آج وہ گھر کہاں ہے؟ بانیان نے اس جگہ جہاں الکٹرک بلب جلتے ہیں ایک اچھی دوکان بنائی ہے۔ ایک آدمی کی قسمت عورت کی دغابازی کے ساتھ چمکتی ہے۔ خدا کی شان ہے اور اس کی تعریف کی جائے۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ چیزیں بدل رہی ہیں۔ سڑکیں پکی ہوگئی ہیں اور بجلی کی روشنی ان پر ہوتی ہے۔ یاد ہے وہ اندھیرے میں گھر آنا۔ اب ہر دوکان میں بجلی ہے۔ ہر چیز بدل رہی ہے۔ سوائے سرسٹھ برس کے بوڑھے کے جو ہفتہ میں صرف ایک بار گھر چھوڑ سکتا ہے۔ پھر بھی میری سانس کم آتی ہے۔ میرا دل! یہ سب ہمارے دل کا قصور ہے۔ جو محبت کرتا، ہنستا اور خوش ہوتا اور سالوں سال گاتا تھا۔ آج اس کا حکم ہے کہ خاموش رہو اور اس کا حکم نہیں ٹالا جا سکتا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ دوا کھاؤ جو میں تجویز کرتا ہوں، اور اس طرح کی خوراک — میں نے اس سے کہا ٹھیک ہے لیکن کیا یہ مجھے تندرست و توانا پھر کر سکتے ہیں یا کم سے کم کچھ طاقت، اس نے جواب دیا۔

''کچھ اور مشکل نہ ہو، اس سے زیادہ ہم امید نہیں کر سکتے۔ کوئی تکلیف و حرکت میں خطرہ ہے۔'' وہ مزید ہنسا اور جاننا چاہتا تھا کہ تم اپنی طاقت واپس کیوں لانا چاہتے ہو۔''

پھر بھی سید احمد نے جواب دیا تھا۔ ''میں آنا جانا چاہتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے تبصرہ کیا۔ ''ہر حالت کی اپنی خاص خوشی ہوتی ہے۔ جیسے کہ خامشی سے بیٹھنا اور اخبار پڑھنا، ریڈیو سننا، خاندان کے ساتھ رہنا اور جمعہ کو مسجد جانا۔ یہ تمھارے لیے کافی ہے۔''

''اللہ کے ہاتھ میں ہے۔'' اس نے سوچا۔ ''مٹھتولی

عبدالصمد ابھی تک اسٹریٹ میں گر پڑ کر چلتے ہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ خاندان کی صحبت سے خوش رہو۔ امینہ اب گھر میں نہیں رہتی ہے۔ ہمارے رول ادل بدل گئے ہیں۔ میں اب بیل والی بالکونی تک رہتا ہوں اور امینہ قاہرہ کا چکر لگاتی ہے، ایک مسجد سے نکل کر دوسری مسجد۔ کمال میرے ساتھ چند لمحے بیٹھتا ہے۔ جیسے وہ مہمان ہے۔ عائشہ کیا وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے؟ اور پھر وہ چاہتے ہیں کہ میرا دل روبہ صحت ہو جائے اور اطمینان ہو۔"

اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا کہ اُم حنفی ایک چھوٹا ٹرے لیے ہوئے ہے جس پر ایک بوتل، دوا، ایک خالی پیالی کافی اور ایک آدھا گلاس پانی۔

"آپ کی دوا مالک۔" اس عورت کے کالے لباس سے باورچی خانے کی مہک آ رہی تھی، وہ عورت جو وقت کے ساتھ خاندان کا فرد ہو چکی تھی۔ گلاس اٹھاتے ہوئے اس نے کپ میں آدھی کافی ڈالی۔ پھر دوا کی بوتل کی ٹھپی نکال کر چار قطرے کپ میں ڈالے۔ خراب مزے کی دوا سے اس نے منہ بنایا اور پھر پی گیا۔

"خدا کرے یہ آپ کی تندرسی لائے مالک۔"

"شکریہ...! عائشہ کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں۔ خدا اس کو صبر دے۔ ام حنفی اسے بلاؤ۔"

اپنے کمرے میں یا چھت پر، کیا فرق پڑتا ہے۔ اس نے سوچا۔

ریڈیو سے نکلتے اچھے اور خوشی بھرے گانے اس گھر کے خاموش اور سوگوار ماحول سے بالکل مختلف تھے۔ ال سید احمد اپنے گھر کے حد تک پچھلے دو مہینے سے رہتا تھا۔ ایک سال چار مہینہ نعیمہ کی موت کے گزر چکے تھے۔ جب اس نے عائشہ کو کہا کہ ریڈیو سنا کرو۔ دل بہلے گا۔ عائشہ نے جواب دیا ضرور پاپا۔ خدا آپ کو گھر میں اسی طرح رہنے کی عادت دلا دے۔

کپڑے کی سرسراہٹ سن کر اس نے دیکھا کہ عائشہ کالا لباس پہنے اس کی طرف آ رہی ہے۔ موسم گرما تھا مگر کالے رومال سے اس کا سر ڈھکا تھا۔ تب اس نے نرمی سے کہا "ایک کرسی لے آؤ اور میرے پاس کچھ دیر بیٹھو۔" لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔

اس کے چہرے پر بے کیفی تھی اور سفید چہرہ ایک عجیب نیلے رنگ کا تھا۔ نامساعد حالات نے اسے سکھا دیا تھا کہ عائشہ کو بدلنے کی کوشش نہ کی جائے۔ "تم کیا کر رہی تھی؟ اس نے پوچھا" "کچھ نہیں پاپا۔" جواب ملا۔

"تم اپنی ماں کے ساتھ باہر کیوں نہیں جاتی اور پاک روضے پر کیوں نہیں جاتی۔"

"میں روضہ کیوں جاؤں۔"

"تم کو خدا سے صبر کی دعائیں مانگنی چاہیے۔ خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ہمارے گھر میں۔"

"بے شک میرا کہنا تھا کہ تم کو اتنا وقت تنہا نہیں گزارنا چاہیے۔ اپنی بہن کے یہاں جاؤ، پڑوسیوں سے ملو، اپنے لیے کچھ دل جوئی کا سامان نکالو۔"

"میں شوگر اسٹریٹ دیکھنا نہیں چاہتی ہوں۔ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں اب کسی کو نہیں جانتی ہوں۔ مجھے لوگوں سے ملنا برداشت نہیں ہوتا ہے۔"

اپنا منہ ہٹاتے ہوئے اس نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ تم دل جمعی سے رہو اور اپنی صحت کا خیال رکھو۔"

"میری صحت" وہ تقریباً حیرانی سے بول اٹھی۔ "میری صحت" — ہاں غم کا کیا مطلب ہے۔" اس نے اصرار کیا۔

اپنی بے اطمینان کیفیت کے باوجود اس نے اپنے باپ سے تہذیب سے جواب دیا "زندگی کا کیا حاصل ہے پاپا۔"

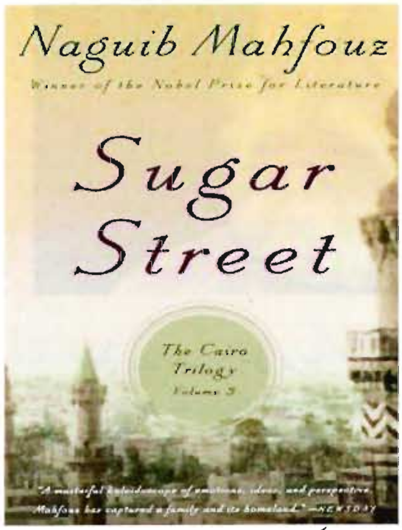

"ایسا نہ کہو، خدا کا انعام تمھارے لیے بڑا ہوگا۔"

اپنا سر جھکا کر عائشہ نے اپنے آنسوؤں کو چھپایا اور جواب دیا۔ "میں خدا کے پاس جانا چاہتی ہوں، اپنا انعام لینے۔ میں اس دنیا میں نہیں رہنا چاہتی ہوں پاپا۔" وہ خاموشی سے پیچھے ہٹنے لگی۔ لیکن بالکونی سے نکلنے کے پہلے وہ ایک لمحے کے لیے رُکی جیسے اسے کچھ یاد آیا اور پوچھا۔ "آپ کی صحت آج کیسی ہے۔"

وہ مسکرایا اور جواب۔ "عمدہ.. اللہ کا شکر ہے لیکن جو اہم ہے وہ تمھاری صحت عائشہ۔" پھر وہ چلی گئی۔

اس گھر میں وہ کس طرح آرام کر سکتا ہے۔ اس نے نیچے اسٹریٹ پر پھر نظریں دوڑائیں اور آخر میں اس کی آنکھیں امینہ پر آ کر رکیں جو اپنے روزانہ کے چکر سے واپس آ رہی تھی۔ معمولی لباس کوٹ کے نیچے پہنے اور ایک سفید رومال باندھے وہ آہستہ چل رہی تھی۔ کس قدر اس کی عمر بڑھ گئی ہے۔ چونکہ اس کو یاد آیا کہ اس کی ماں بہت بوڑھی ہو کر مری۔

اس کو امینہ کی صحت کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ لیکن وہ باسٹھ میں ہی کم از کم دس برس زیادہ کی لگ رہی تھی۔

کافی دیر کے بعد وہ پہنچی اور اس نے پوچھا۔ "آپ کیسے ہیں، آقا۔" اپنی آواز کو کافی اونچا کیا تاکہ سختی نہ ہو۔ وہ بولا۔ "تم کیسی ہو؟ خدا کی مرضی! تم صبح سویرے سے نکلی ہوئی ہو محترمہ۔"

وہ مسکرائی اور جواب دیا۔ "میں سیدہ زینب اور حسین کے روضوں پر گئی۔ تمھارے لیے اور سب کے لیے دعا مانگی۔"

اب جبکہ وہ گھر میں تھی، اس کا چین اور اطمینان جیسے واپس آ گیا ہو کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ وہ بلا تامل جو چیز چاہے مانگ سکتا ہے۔ "کیا یہ درست ہے تمھارے لیے کہ تم مجھے تنہا چھوڑ دو، اتنے عرصے کے لیے؟"

"آپ نے مجھے اجازت دی تھی۔ بہت دیر کے لیے میں نہیں گئی تھی۔ آقا ہم لوگوں کو دعاؤں کی سخت ضرورت ہے۔"

اس نے ایک کرسی لی اور بیٹھ گئی پھر اس نے پوچھا "کیا آپ نے اپنی دوا کھائی۔"

"آقا میں نے ام حنفی کو ہدایت دے دی تھی۔"

"میری خواہش ہے کہ تم نے اسے زیادہ بہتر کرنے کو کہا ہوتا۔"

"یہ آپ کی بہتر صحت کے لیے ہے۔ آقا! مسجد میں میں نے شیخ عبدالرحمن کی بہت اچھی تقریر سنی کہ گناہ اور نازیبا حرکتوں کی پاداش کیسے کی جا سکتی ہے۔ آقا۔ امید تھی کہ میں اس طرح یاد کر سکتی جیسے پہلے۔"

"تمھارا چہرہ چلنے سے پیلا پڑ گیا ہے۔ تم جلد ہی لگتا ہے کہ ڈاکٹر کی باقاعدہ مریض ہوگی۔"

"میں باہر جاتی ہوں۔ رسول کے رشتہ داروں کے روضوں پر ہم لوگوں کو یہ کیسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ آقا میں تقریباً بھول گئی۔ میں نے سنا کہ ہٹلر نے حملہ کر دیا ہے۔"

اس نے دلچسپی سے جواب دیا۔ "عوام کو اس کا خطرہ بہت دنوں سے تھا۔ خدا کی مرضی ہوگی تو ہم لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ کیا لوگ صرف ہٹلر کا نام لے رہے تھے، مسولنی کا نہیں۔"

صرف ہٹلر کا نام — کیا اس کا اثر ہم لوگوں پر ہوگا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا "کیا معلوم!... اگر تم کسی کو سنو کہ البلاغ یا المقیم اخباروں کا فروخت کر رہا ہے تو ایک خرید لیتا۔"

"قیصر ویلیم اور زیلپن کے دنوں کی یاد دلاتی ہے آپ کو یاد ہے۔ آقا۔ خدا کی شان ہو، وہ خدا جو ہمیشہ ہمارے ساتھ ہے اور زندہ جاوید ہے۔" ■

ماخذ: شوگر اسٹریٹ (ناول)، **مصنف**: نجیب محفوظ، **مترجم**: ظفر امام، **سنہ اشاعت**: 2011، **ناشر**: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

حنیف نقوی

غالب اور عیوبِ قوافی

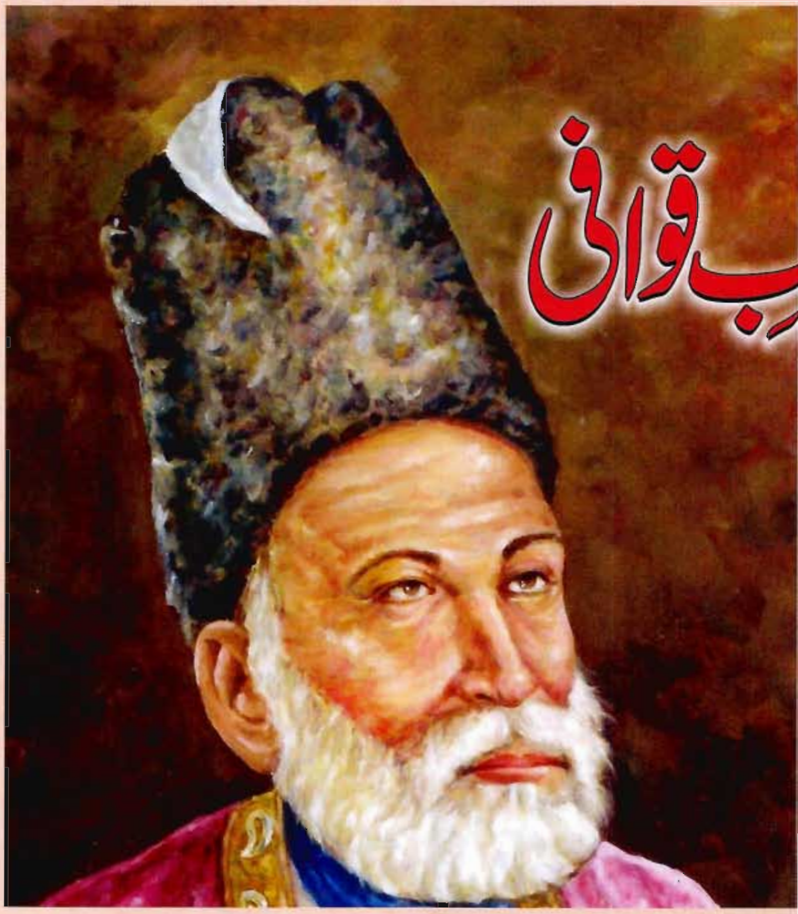

مندرجہ بالا عنوان کے تحت جناب منصور عمر (استاد شعبۂ اردو، سی ایم کالج، دربھنگا) کا ایک مختصر مضمون ہفت روزہ 'ہماری زبان' کے 15 نومبر 1988 کے شمارے میں شائع ہوا تھا، جس میں 'غالب کے قارئین، ناقدین اور ماہرینِ عروض و بلاغت' سے یہ استفسار کیا گیا تھا کہ ''غالب کی مشہور غزل 'دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا' میں 'تسلی' اور 'راضی' کا قافیہ 'تقویٰ' اور 'عیسیٰ' کہاں تک درست ہے؟'' جیسا کہ اس سوال سے از خود واضح ہے، مضمون نگار کا موقف یہ تھا کہ غالب نے متذکرہ غزل میں یہ دونوں قافیے نظم کر کے غلطی کی ہے۔ بعد کے شماروں میں ان کے اس خیال کی تردید اور غالب کے موقف کی حمایت میں کئی مراسلے شائع ہوئے لیکن وہ منصور عمر صاحب کو مطمئن نہیں کر سکے۔ حق یہ ہے کہ ان مراسلات میں صحیح علمی تناظر میں اصل مسئلے کے تجزیے اور تفہیم سے زیادہ غالب کی طرف داری کا پہلو نمایاں تھا اور فاضل مضمون نگار نے اپنے جوابی مراسلوں میں ان کی خامیوں اور کمزوریوں کی جو گرفت کی ہے، وہ بڑی حد تک درست ہے۔ چنانچہ کئی ماہ تک چلنے والے اس طویل مباحثے کے باوجود یہ سوال کہ 'تقویٰ' اور 'عیسیٰ' کو 'تسلی' اور 'راضی' کا قافیہ بنایا جاسکتا ہے یا نہیں، اپنی جگہ برقرار ہے۔

ہمارے خیال میں یہاں متذکرہ بالا تمام جوابی تحریروں کو موضوعِ بحث بنانے اور ان میں پیش کردہ دعووں اور دلیلوں پر گفتگو کرنے کی بجائے یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ براہِ راست اصل سوال پر غور کیا جائے کہ اصولی اور روایتی طور پر 'تسلی' اور 'راضی' وغیرہ کے ساتھ 'تقویٰ' اور 'عیسیٰ' کو بہ طورِ قافیہ نظم کرنا جائز ہے یا نہیں؟ غالب نے یہ قافیے ایک ہی غزل کے جن اشعار میں استعمال کیے ہیں، وہ درجِ ذیل ہیں:

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا
ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی
گر نفس جادۂ سر منزلِ تقویٰ نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں
وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

موضوع کی مناسبت سے یہاں اسی سلسلے کے ایک اور لفظ 'لیلیٰ' کو بھی شاملِ بحث کر لینا بے محل نہ ہوگا۔ غالب نے اپنی ایک اور غزل میں اسے 'تسلی' اور 'شادی' وغیرہ کے ساتھ بہ طور قافیہ نظم کیا ہے۔ اس غزل کا مطلع اور وہ شعر جس میں 'لیلیٰ' بہ طورِ قافیہ آیا ہے، درجِ ذیل ہے:

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحان اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

امرِ واقعہ یہ ہے کہ 'تقویٰ' اور 'عیسیٰ' اور اس قبیل کے ان تمام الفاظ کو جو 'ی' کے ساتھ لکھے اور 'الف' کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں، یائے معروف کے ساتھ پڑھنا اور نظم کرنا از روے لغت بھی جائز ہے اور روایتاً بھی درست سمجھا جاتا رہا ہے۔ لفظ 'تقویٰ' کے بارے میں صاحبِ 'غیاث اللغات' کا بیان ہے:

''بہ فتحِ اول و فتحِ واوَ۔ در استعمالِ فارسیاں گاہے بہ کسرِ واوَ نیز مستعمل''

مراد یہ ہے کہ اس لفظ کا اصل تلفظ اگرچہ 'تقویٰ' ہے لیکن فارسی والے کبھی کبھی واوَ کے کسرے کے ساتھ یعنی 'تقوِی' بھی لکھتے رہے ہیں۔

'عیسیٰ' اور 'موسیٰ' کا حوالہ اسی لغت میں حرف 'الف' کی تفصیلات کے تحت موجود ہے۔ مولّف نے 'الف' کی چوبیس قسمیں بتائی ہیں۔ ان میں بائیسویں قسم 'الفِ مجہول الاصل' کی ہے۔ اس کے متعلق انھوں نے لکھا ہے کہ ''ایں را بہ یا نویسند گاہے فارسیاں ایں الف را بہ اعتبارِ صورتِ کتابت یا خوانند، چوں موسی و عیسی''، یعنی اس الف کو 'ی' کی صورت میں لکھا جاتا ہے لیکن فارسی والے کبھی کبھی کتابت کا لحاظ کرتے ہوئے اسے 'ی' کے طور پر بھی پڑھتے ہیں مثلاً موسی و عیسی۔

فارسی کے مستند اور ممتاز شعرا اس قسم کے تمام الفاظ کو جن کا اوپر کی مثالوں میں ذکر کیا گیا ہے، اپنی ضرورت یا صواب دید کے مطابق بلا تکلف یائے معروف کے ساتھ پڑھتے اور لکھتے رہے ہیں اور ان پر اس سلسلے میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے، کبھی کوئی اعتراض وارد نہیں کیا گیا۔ بہ طورِ مثال عہدِ شاہ جہانی کے ملک الشعرا ابوطالب کلیم کاشانی کی ایک غزل کے یہ اشعار پیش کیے جاسکتے ہیں:

بدل کر دم بہ مستی عاقبت زہدِ ریائی را
رسانیدم بہ آب از یمنِ مے بنیادِ تقویٰ را
ز سینہ ایں دلِ بے معرفت رامی کنم بیروں
چرا بے ہودہ گیرم در بغل مینائے خالی را
گذشتن از جہاں ناید بہ پائے ہمتِ ہرکس

نباشد ہیچ معجز بہتر از تجرید عیسی را
بود آرائشِ معشوق حالِ درہمِ عاشق
سیہ روزیِ مجنوں سرمہ باشد چشمِ لیلی را
دو مصرع در سبک روحی کلیم آں طور می باید
کہ در پروازِ شہرت بال باشد مرغِ معنی را

اسی زمین میں مرزا صائب اصفہانی نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ان کی غزل کے چند اشعار درجِ ذیل ہیں:

صفاے ساعدت نیلی شمارد دستِ موسی را
بنا گوشِ تو سازد تازہ ایمانِ تجلی را
ندارد شکرے در چاشنی گردونِ مینائی
بہ حرف و صوت می دارد نگہ آئینہ طوطی را
بہ چندیں سوزنِ الماس حیرانست مژگانش
کہ از پاے کہ بیروں آورد خارِ تمنی را
بحمداللہ نہ مردم آں قدر کز گردشِ دوراں
قدح در دست، مینا در بغل دیدیم تقوی را
دوراں کشور کہ گردد گوہر افشاں خامۂ صائب
رگِ ابرِ بہاراں طے کند طومارِ دعوی را

بحر کی تبدیلی کے ساتھ انھی قوافی اور اسی ردیف میں صائب کے یہ اشعار بھی ملاحظہ طلب ہیں:

لب مے گونِ تو خمار کند تقوی را
چشمِ بیمارِ تو آرد بہ زمیں عیسی را
سرو بسیار بہ رعنائی خود می نازد
جلوۂ سرکن و کوتاہ کن ایں دعوی را
حرف و صوتیست ہمیں حاصلِ اربابِ سخن
ہیچ کس سبز نسازد سخنِ طوطی را
نقشِ معنی ننشیند اگر از قحطِ تمیز
نتواں کرد ملامت. قلمِ مانی را
عجبے نیست دلِ صائب اگر رامِ تو شد
دانۂ خالِ تو در دام کشد وحشی را

شوکت بخاری کا دیوان فی الوقت ہماری دسترس میں نہیں، اس لیے ایک ثانوی ماخذ کے حوالے سے اس بحث کے ضمن میں اس کے یہ دو شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

نگاہِ غیر از نظارۂ خطّش تسلی شد
زمرد مرہمِ زنگارِ زخمِ چشمِ افعی شد
ہنرمندانہ از قیدِ تعلق پاک کن خود را
کہ سوزن جوہر آئینۂ تجریدِ عیسی شد

ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں فیضی کا جو مرتبہ ہے، اس سے اہلِ علم بہ خوبی واقف ہیں۔اس کی مثنوی 'مرکز ادوار' کی یہ بیت بھی فارسی کی اس عام روایت کی جس کے حوالے سطورِ بالا میں پیش کیے گئے ہیں، تائید کرتی ہے:

بستہ درِ گنج بہ مہرِ خفی
دادہ کلیدش بہ کفِ مصطفی

روایتی طور پر شعراے فارسی کے معمولات و مختارات اردو والوں کے لیے سند کا درجہ رکھتے ہیں، اس لیے اگر غالب نے اپنی محولہ بالا غزلوں میں ان پر عمل کیا تو کسی قاعدے کی خلاف ورزی نہیں کی۔اس کے علاوہ اس معاملے میں وہ یکہ و تنہا بھی نہیں۔ان کے پیش رو اردو کے بزرگ شعرا میں مصحفی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اردو اور فارسی کی طرح عربی زبان پر بھی پوری قدرت رکھتے تھے اور اس میں طبع آزمائی بھی کرتے تھے۔ ہماری محدود معلومات کے مطابق اگرچہ انھوں نے اپنے کسی شعر میں (غزلیات کی حد تک) 'تقویٰ' یا 'عیسیٰ' کو 'ساقی' اور 'راضی' وغیرہ کا قافیہ نہیں بنایا ہے تاہم ان کے ہاں اس زمرے کے کئی الفاظ کے یاے معروف کے ساتھ استعمال کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً مندرجہ ذیل اشعار میں 'موسیٰ' کی بجاے 'لیلیٰ' کا استعمال 'عیسی' کے جواز کے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔اس سے بھی اہم تر مثال 'تمنّا' کی بجاے 'تمنّی' کے استعمال کی ہے جس کی موجودگی میں 'تقوی' کی صحت پر اعتراض کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

اشعار یہ ہیں:

جو رنگ بدلے ٹک اس چرخِ آبنوسی کا
یہ رنگ کیوں ہو مرے اشکِ سندروسی کا
میں وہ نہیں ہوں کہ سر بر ہو مجھ سے خصمِ رکیک
کہ خامہ ہاتھ میں میرے عصا ہے موسی کا

(دیوانِ اوّل)

میں ہجر میں کب خونِ جگر پی نہیں رہتا
کیا ،، کہ تجھ بن تو مرا جی نہیں رہتا
فریاد کناں آئے ہے مجنوں پسِ محمل
افتاد سے پر ناقۂ لیلی نہیں رہتا
کھولے ہے جہاں اپنا وہ مہ چاکِ گریباں
واں دل کوئی بے داغِ تمنّی نہیں رہتا

(دیوانِ چہارم)

'عیسی' اور 'موسیٰ' کی صحت کے ثبوت میں یہ دلیل بھی دی جاسکتی ہے کہ مرکّبات کی صورت میں جب بھی یہ الفاظ بہ طورِ مضاف استعمال ہوتے ہیں تو ان پر الف پر ختم ہونے والے الفاظ کے قاعدۂ اضافت کا اطلاق نہیں ہوتا۔یعنی انھیں بہ طورِ مثال یاے اضافت کے اضافے کے ساتھ 'عیساے مریم' یا 'موساے عمراں' نہیں لکھا جاتا، حرفِ آخر کو مکسور کر کے ع 'عیسیِ مریم' یا 'موسیِ عمراں' لکھا جاتا ہے۔'ہفت بندِ کاشی' کی یہ بیت اس سلسلے میں سند کی حیثیت رکھتی ہے:

حاجب دیوانِ امرت موسیِ دریا شگاف
پردہ دارِ بامِ قصرت عیسیِ گردوں نشیں

اس قبیل کے الفاظ میں 'لیلیٰ' فارسی و اردو میں یاے معروف کے ساتھ نظم ہونے والا غالباً سب سے کثیر الاستعمال لفظ ہے۔ انعام اللہ خاں یقین نے جو مرزا مظہر جانِ جاناں کے شاگرد تھے، اپنی ایک غزل میں اسے 'تسلی' اور 'جدائی' وغیرہ کا قافیہ بنایا ہے۔ اس غزل کے دو شعر یہ ہیں:

مارے ہی جاتے ہیں آخر کوہکن سے سر چڑھے
خسروِ بے چارہ اور شیریں بچاری کیا کرے
چاہنے والے کے مرنے کو کوئی چاہے ہے کب
عشق ہی دشمن ہو مجنوں کا تو لیلی کیا کرے

انشا نے اپنی ایک ریختی کے مندرجہ ذیل مطلع میں اسے 'کچیلی' کے قافیے کے طور پر نظم کیا ہے:

ہم نے یہ دیکھا ہے اک میلی کچیلی کا دماغ
ایڑیاں رگڑے جہاں مجنوں کی لیلی کا دماغ

اسی طرح شوق لکھنوی نے مثنوی 'زہرِ عشق' کی مندرجہ ذیل بیت میں اسے 'پھیلی' کے ساتھ ہم قافیہ کیا ہے:

بوے الفت تمام پھیلی ہے
گو کہ اب قیس ہے نہ لیلی ہے

بہ طور مضاف اس کے استعمال کی مثال مرزا دبیر کے ایک مرثیے کے مندرجہ ذیل بند کے تیسرے مصرعے میں دیکھی جاسکتی ہے:

پیدا شعاعِ مہر کی مقراض جب ہوئی
پنہاں درازیِ پرِ طاؤسِ شب ہوئی
اور قطع زلفِ لیلیِ زہرہ لقب ہوئی
مجنوں صفت قباے سحر چاک سب ہوئی
فکرِ رفو تھی چرخِ ہنرمند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لیے

ترکیبِ اضافی کی یہی صورت جوش کے مندرجہ ذیل شعر میں بھی پائی جاتی ہے:

لیلیِ آفاق الٹتی ہی رخ سے نقاب
اور یاں عورت، مناظر، عشق، صہبا، انقلاب

سطورِ بالا میں پیش کردہ دلائل اور مثالوں سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ غالب نے 'تسلّی' اور 'راضی' کے ساتھ 'تقوی' اور 'عیسی' یا 'لیلیٰ' کو بہ طورِ قوافی نظم کر کے لغت کی شہادت اور روایت کے تسلسل پر اعتبار کرتے ہوئے تلفظ کی ایک رعایت سے فائدہ اٹھانے کے علاوہ کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ ذاتی پسند و ناپسند کی بنا پر ان کے اس عمل سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اصولی طور پر اسے قابلِ اعتراض نہیں کہا جاسکتا۔

(منصور عمر صاحب نے اپنے مضمون میں قافیے کے صرف ایک عیب سے بحث کی ہے۔اس اعتبار سے اس کا عنوان 'غالب اور قوافی کا ایک عیب' یا 'غالب اور قافیے کا ایک عیب' ہونا چاہیے تھا۔ راقم نے اس احساس کے باوجود 'ہماری زبان' میں شائع شدہ اس سلسلے کی تحریروں سے اپنے ان معروضات کا ربط قائم رکھنے کی غرض سے اصل عنوان کو علیٰ حالہٖ برقرار رکھا ہے۔) ■

ماخذ: تحقیق و تعارف، مصنف: حنیف نقوی، سنہ اشاعت: 2013، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پروفیسر خالد حسین خاں

ڈاکٹر مطیع اللہ خاں درّانی، حسرت کمالی

(شخصیت، شاعری اور فن)

حسرت کمالی، مارچ 2013، اپنی بساطِ زندگی موڑ کر سدا کے لیے اٹھ گئے اور ہوگئی بزمِ میکدہ خاموش! یعنی موت سے کس کو مفر ہے! سیلِ فنا کے سامنے دم مارنے کی مجال کسی ذی روح کو نہیں!!

اس انجمن میں عزیزو یہ عین ممکن ہے
ہمارے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہے

شاہجہاں پور کی تاریخی، تہذیبی اور سیاسی حیثیت سے قطع نظر، ہماری ادبی، لسانی اور انقلابی روایت سے بھی اس شہرِ نگاراں کا براہِ راست تعلق رہا ہے۔ اشفاق اللہ خاں حسرت وارثی اور رام پرشاد بسمل جیسے حریت پسندوں کا تعلق اسی شہر سے ہے، دل شاہجہاں پوری، عابد مینائی جیسے متعدد شعرا اسی سرزمین سے اٹھے۔ نثری میدان میں بھی یہاں کے قلمکاروں اور فنکاروں نے اپنے فکر وفن سے ہندوستان گیر شہرت پائی! غالباً اسی کی برکت ورحمت ہے کہ شاہجہاں پور میں ادب کا ماحول کبھی بے رونق نہیں ہوا۔ شاعروں کی گھریلو نشستوں، انجمنوں اور بے تکلف صحبتوں میں وہاں شعروشاعری کا چرچا آج بھی عام طور پر نظر آتا ہے۔ حسرت کمالی اسی روایتِ دیرینہ کو سینے سے لگائے رہے اور اسے مسلسل آگے بڑھاتے رہے۔ کلاسیکی ادب کے رموز ونکات سے وہ پوری طرح آشنا تھے، رسمی مضامین بھی بے تکلفی کے ساتھ باندھتے تھے۔

کلکتہ میں 1964 کے بدترین فرقہ وارانہ فساد کے بعد، والد مرحوم ہم لوگوں کو کلکتہ سے وطنِ مالوف، شاہجہاں پور لے آئے۔ 1965 میں اسلامیہ ہائی اسکول (اب انٹر کالج) شاہجہاں پور میں درجہ ہشتم میں داخلہ لینے کے بعد، دیگر اساتذہ کے باوصف، مطیع اللہ خاں، حسرت کمالی کو پہلی بار وہاں دیکھا، خوبصورت باریش چہرہ، سفید وقدرے سرخ رنگ، عمدہ بے شکن شیروانی، کراری ٹوپی، مناسب قد، نہ طویل اور نہ ہی مختصر۔ آواز میں متانت، لہجے میں سلاست اور گفتگو میں صباحت، انداز میں ایک مخصوص تکلف... تصنع کی حد تک! حدِ ادب کے سبب، بے تکلفی میں وقت لگا۔ رفتہ رفتہ، کمالی مرحوم کے کمال و جمال اور اکثر جلال و ملال کی عیاں ونہاں خوبیاں بھی وا ہوتی گئیں۔ حسرت کمالی، دین ودنیا دونوں کے راہی تھے، حافظِ قرآن، صاحبِ ایمان، فنِ تجوید کے شناسا، اسلامی علوم اور مذہبی رسوم کے پروردہ ہونے کے علاوہ، جماعتِ اسلامی سے گہری وابستگی اور شوق وشغف کے سبب، ان کو اپنے ہم عصروں میں نمایاں حیثیت حاصل تھی، ریاضی

کے استاد تھے، اسلامیات، مذہبیات، شکاریات ان کا محبوب ومرغوب مشغلہ تھا، گزشتہ چند برسوں سے وہ ہومیوپیتھی میں بھی رغبت ودلچسپی لینے لگے تھے اور یوں وہ اپنے نام سے پہلے 'ڈاکٹر' کا لاحقہ بھی لگانے لگے تھے۔

بہرکیف! ایک مکمل تہذیب، مستند استاد، بے باک انسان، عارف تہذیب وثقافت، خوش بیاں مقرر، خوش الحان قاری، مدبر، مفسر، مبلغ، شاعر، نثر نگار کا نام حسرت کمالی ہے۔ کمالی مرحوم، دنیا کی تاریخ ساز شخصیتوں کی طرح متنازع شخصیت اور متضاد خوبیوں کے حامل یعنی حسرت کمالی، دوست دشمن کا اشتہار واعلان، علی الاعلان کرتے تھے۔ للو پچو کرنے والے اور بیمار رشتوں پر مرحوم کبھی یقین نہیں رکھتے تھے، انھیں میری طرح منافقانہ اور ریاکارانہ طرز بالکل پسند نہ تھا۔ ان کے ہاں رشید حسن خاں کی طرح درّانی ہونے کے باوجود، کھُرا کھردرا پن نہیں تھا البتہ رعایت کا خانہ ان کے یہاں بھی نہ تھا۔ اسی لیے اکثر لوگوں نے انھیں ضدی، اکھڑ اور 'ایرانی ذوق' سے 'شوق' اور نہ جانے کن کن القاب سے موسوم کر رکھا تھا۔ لطف یہ کہ حسرت کمالی مرحوم کو یہ بے نامی نام اور الزام پسند تھے، ان کے خیال میں، فنکار اور قلم کار کو میر کی طرح 'ابنارمل' ہونا اور 'عطار کے لونڈے' سے دوا لینے میں کوئی عار یا قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے علم ہے کہ حسرت کمالی نے اکثر نادار طلبا کی معاونت ومدد بھی کی ہے جو شخص ظاہری طور پر سخت، کھردرا اور لیے دیے ہو، اس کے باطن میں محبت، مروت، خلوص اور ہمدری کا جھرنا بھی بہتا تھا، یہ رمز وراز وہ لوگ خوب جانتے ہیں جو ان سے قریب رہے ہیں۔

درس وتدریس کے علاوہ، کمالی مرحوم کا وطیرہ تھا کہ وہ روزانہ چار گھنٹہ مطالعہ، تحریر وتصنیف اور شاعری کی نوک پلک سنوارنے میں گزارتے تھے، ان کا یہ معمول ادبی زندگی کی ابتدا سے تادم آخر قائم رہا گویا پڑھنا لکھنا ان کی زندگی کا دوسرا نام تھا، تیسرا شغل، ان کا شکاریات سے والہانہ لگاؤ تھا۔ میں جب میرٹھ سے وطن جاتا اور ان کو میری آمد کا علم ہوتا تو مرحوم، اکثر لذتِ کام و دہن سے تواضع کرتے، تیتر، بٹیر اور ہرن کے گوشت کے مختلف لوازمات سے دعوت کا اہتمام کرتے تھے۔

حسرت کمالی کو شعر گوئی ورثے میں نہیں ملی، یہ ان کا ذاتی رجحان اور طبعی میلان تھا، اسی لیے ان کا شعری اسلوب پدری نہیں، فطری ہے۔ مرحوم کی رنگارنگ طبیعت اور مختلف ومتضاد مشاغل ومعاملات حیران کن ہیں یعنی حسرت کمالی، پُرگو شاعر تھے، شکاری تھے، عابدوزاہد تھے، ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر تھے، پیش امام تھے، ریاضی کے استاد تھے، خانگی معاملات میں بھی طاق تھے۔ خطیب تھے، مفسر قرآن تھے، جماعتِ اسلامی کے فعال رکن تھے اور احباب کے لیے خوشگوار تفریحِ طبع کا مینار بھی تھے۔ ایسی ہمہ جہت اور ہمہ صفت شخصیت کے بارے میں آخر اس کے علاوہ اور کیا کہا جائے: ''یہ اُس کی دین ہے جسے پروردگار دے''

حسرت کمالی کا انفراد یہ بھی ہے کہ وہ شعری سلسلے کے اکابر واسلاف کے پس خوردہ پر مکمل طور سے قناعت نہیں کرتے بلکہ تجربات، تحفظات اور لفظیات کے لیے نئے نئے جہانوں کی سیر بھی کرتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ کمالی کے یہاں ندرتِ اظہار بھی ہے، جدتِ افکار بھی ہے اور ثروتِ اشعار بھی ہے۔ بہ طور نمونہ، متفرق مجموعوں کے یہ اشعار:

شبِ وصال بھی اندیشۂ طلوع سحر
خوشی بھی ہم کو میسر نہیں خوشی کی طرح
تو حسیں کوئی تجھ سے زیادہ حسیں
شوق بڑھتا ہے رعنائیاں دیکھ کر
مری میت پہ بھولے پن سے بولے
بڑے آرام کی نیند آگئی ہے
یہ نظام میکدہ میں جو عجب سی بے کلی ہے
کوئی گفتگو ہوئی ہے کہیں شیخ و برہمن میں
نہ گداز سے مرصع نہ عروض میں مکمل
ہے ابھی کلام حسرت ہمیں آپ کے سخن میں
نہ ہو اعتماد کامل جسے اپنے فکر وفن میں
تو وہ کیوں زبان کھولے کسی محفلِ سخن میں
جسموں کی قیمتوں کا بھروسہ نہ کیجیے

حسرت کمالی کو شعر گوئی ورثے میں نہیں ملی، یہ ان کا ذاتی رجحان اور طبعی میلان تھا، اسی لیے ان کا شعری اسلوب پدری نہیں، فطری ہے۔ مرحوم کی رنگارنگ طبیعت اور مختلف و متضاد مشاغل و معاملات حیران کن ہیں یعنی حسرت کمالی، پُر گو شاعر تھے، شکاری تھے، عابد و زاہد تھے، ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر تھے، پیش امام تھے

اپنے دل و دماغ کا سودا نہ کیجیے
ہونٹوں پہ جو آجائے تو پھر راز نہ سمجھو
سن لینے کو دیوار کے بھی کان بہت ہیں
بستر بندھا ہوا ہے، ارادہ سفر کا ہے
اب صرف انتظار ترے نامہ بر کا ہے
ڈھلنے لگی ہے رات مرے یار شب بخیر
رقصاں ہے کائنات مرے یار شب بخیر
عجب دل میں خلش ابھری ہے اس پیرانہ سالی میں
بہلتا ہی نہیں اب جلوۂ حسنِ نگاراں سے
پہلے بُت، پھر وہ صنم، پھر وہ خدا ہی بن گیا
ہاں وہی پتھر جو کل تک پنجۂ آزر میں تھا
چھیڑو نہ ابھی ان کو وہ نادان بہت ہیں
طفلی ہے ابھی جذبہ و ارمان بہت ہیں
تصنع میں ہزار آرائشیں ہوں
حقیقت سادگی ہی میں نہاں ہے
کون مفلس ہے وہ مزدور کہ بچے بھوکے
یا وہ زردار کہ سب کچھ تو ہے اولاد نہیں

مسجد سے تعلق ہے نہ مندر سے سروکار
کچھ ایسی زمانے کی ہوا دیکھ رہا ہوں
لہجے میں رہے نرمی گفتار شگفتہ ہو
کیوں بارِ سماعت ہو تہدید کا آوازہ
لمبی چوڑی امن کی باتیں
چھوٹے کھوٹے تنگ دماغ

حسرت کمالی، اسلامیہ انٹر کالج شاہجہاں پور سے سبکدوشی کے بعد، غزل کی زلفِ گرہ گیر کے ایسے عاشق و شائق ہوئے کہ روز و شب اسی کے فراق میں مگن ہو گئے، نتیجتاً، چار شعری مجموعوں کے خالق بن گئے۔ پانچواں مجموعہ زیرِ ترتیب تھا کہ وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور ان کا یہ خواب ان کی حیاتِ مستعار میں شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ان کی ادبی جہات کئی حصوں میں بٹی ہوئی ہے لیکن ان کی پہچان، غزل گو کی حیثیت میں نمایاں ہے۔ غزلوں میں ان کی آبداری اور تازہ کاری کی چمک و دمک دور سے دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔ تنوع، شیوگی، شیفتگی اور رنگارنگ عشوہ زہی نیز رعنائی سے وہ ذات و کائنات کی آشنائی تک پہنچتے ہیں اور اپنے شعروں کے حوالے سے جمالیاتی قوس قزح کی رنگینی بکھیرتے ہیں۔ مذکورہ متفرق اشعار اس کے عادلِ شاہد ہیں:

چونکہ حسرت کمالی کا میدانِ کارزار، درس و دریس تھا، اسی لیے ان کے یہاں مطالعے کی وسعت، مشاہدے کی قوت اور تجربے کی ثروت کی تثلیث کے سبب، ان کے فکر وفن اور شعر و سخن میں تنوع اور ترفع پیدا ہوتا گیا، فکر کی جدت اور تخلیق کی ندرت بھی نکھرتی چلی گئی۔ میرے خیال میں، وہ پورے طور پر نہ روایت پرست ہیں اور نہ ہی ترقی پسند، اسی طرح نہ وہ جدیدی ہیں نہ ہی رجعت پرست، بلکہ انھوں نے ہر استادِ فن سے بقدرِ ذوق وظرف فیض و فیضان ضرور اٹھایا ہے، وہ اپنی شاعری اور اپنے بارے میں یوں لب کشا ہیں:

میں خود اپنی نظر میں کچھ نہیں ہوں
مرے بارے میں اندازے بہت ہیں
گزرے ہیں شاعری کے کئی دور آج تک
حسرت کا رنگ پہلے جو تھا آج بھی اچھا لگا
شاعری آپ کے بس کی نہیں حسرت صاحب
پیچ در پیچ یہ تخئیل یہ الفاظ ادق!

گزشتہ دو عشروں سے تادم مرگ ان کی غزل اپنے مخصوص مہذب لہجے میں ہجر و وصال کی کیفیات، واردات اور احساسات کے ساتھ، عصری مسائل کو بھی وہ غزل کے پورے آداب کے ساتھ سمونے میں مصروف رہے، وقت

کے ساتھ ساتھ ان کے فن میں اس طرح پختگی، گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی گئی کہ وہ عصری مسائل کو اسی آہستگی، نرمی اور لطافت و نفاست سے یوں بیان کرجاتے ہیں جیسے کوئی اپنے گھر میں اپنے محبوب سے دنیا کے مسائل کو چھپا چھپا کر اشارہ کررہا ہو۔ اس خلوص اور اپنائیت نے ان کے مزاج کو غم سہنے کا حوصلہ اور شعور بھی بخشا ہے۔

دراصل، غزل کی آواز ہماری داخلی، روحانی اور تہذیبی آواز کا شاعرانہ نام ہے اور آج 2013 میں بھی غزل کی لفظیات، منظرنامے، استعارات اور تشبیہات میں انقلاب آفریں تازگی کے باوصف، اس کی روح اور اس کی آتما وہی ہے، جسے ہم 'تغزل' کہتے ہیں اس تناظر میں، حسرت کمالی کی شاعری، داستانِ شاہجہاں پور کی نمائندہ شاعری کہی جاسکتی ہے۔ یہ ایک افسوس ناک، عمومی مشاہدہ ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ لوگ اپنے مرحومین کو بھلا بیٹھتے ہیں جب کہ ہم ان کی یادوں، باتوں، ملاقاتوں، کاموں اور کارناموں کو از سرنو تازہ کرکے نہ صرف ان کی روحوں کو خوش کرسکتے ہیں بلکہ خود بھی ذہنی اور روحانی سکون حاصل کرسکتے ہیں، ضرورت ہے کہ حسرت کمالی کے کلام و کمال کو یکجا کرکے ان کے وارث یا دبستانِ شاہجہانپور کے باشعور قلمکار، کتابی صورت میں زیور طباعت سے آراستہ کرکے فرض کفایہ ادا کریں، یہی سچا خراج اور یہی سچی عقیدت حسرت کمالی کے تئیں ہوسکتی ہے۔

حسرت کمالی کا تازہ کار مجموعۂ شاعری 'ریاض سخن' مطبوعہ 2011، جو ان کی زندگی کا آخری کارنامہ ہے، اس کے مطالعے سے راقم سطور کو اندازہ و احساس ہوتا ہے کہ ان کے شعری عطر مجموعہ' ریاض سخن میں، بوئے بہار بھی ہے، بوئے غبار بھی ہے، بوئے انا بھی ہے، بوئے وفا بھی ہے، بوئے فنا بھی ہے، بوئے جفا بھی ہے، بوئے نکتہ دانی بھی ہے، بوئے بے زبانی بھی اور بوئے لن ترانی بھی ہے۔ غرضیکہ حسرت کمالی نے اپنے 'ریاضِ سخن' کو خوشبوؤں سے غسل دے کر، کشتِ غزل کی تمام کثافتوں کو دور کرنے کی بھرپور کاوش کی ہے اور یوں قاری اس کی ترتیل سے جسمانی، روحانی اور قلبی و ذہنی طور پر مکمل و مجسم، 'مجموعہ عطریات' کی خوشبوؤں سے معطر، معنبر اور منزہ ہوجاتا ہے۔

حسرت کمالی کے زیر ترتیب غزلیات میں سے، درج ذیل مختصر بحر کی غزل کے چند اشعار مزید رقم کیے جاتے ہیں، دیکھیے:

بند نفرت کا باب کرلینا
حرکتِ باصواب کرلینا
نیک ارادہ جو ذہن میں آئے
عمل اس پر شتاب کرلینا
آج کل دوستی جو کرنی ہو
پہلے ہی طے نصاب کرلینا
یہ ہے کردار کی بڑی تعمیر
اپنا خود احتساب کرلینا
دردِ پیری اگر بڑھے حسرت
ذکرِ دورِ شباب کرلینا

بحیثیت مجموعی، دبستانِ شاہجہانپور کے ادبی حلقے اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اردو شعر و ادب میں حسرت کمالی کا ایک اہم مقام ہے، وہ پختہ کلام ہیں، شعر کہنا ان کے بائیں ہاتھ کے کھیل جیسا مشغلہ تھا۔ اس تعلق کے باوجود وہ دائیں ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ان کا ہر شعر فنی لحاظ سے مکمل۔ بات تجربے کی ہوتی ہے، نظریے کا عکس ہوتا ہے، حق و حقانیت کا ذکر ہوتا ہے، دوسروں کا درد یوں پیش کرتے ہیں کہ سننے اور پڑھنے والا شاعر کو اپنا ہمدم و ہم غم سمجھنے لگتا ہے، مرحوم کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ آفاقی نظریات کو بھی شیریں بولوں میں، تو کبھی نوکیلی اور نویلی ترکیبوں سے ذہن میں اتار کر عمل و انصاف کے طلب گار ہوتے ہیں جیسے سیاست کی نہیں، سیانے پن کی بات کررہے ہیں، شعر ہی تو کہہ رہے ہیں۔ ایک عمدہ غزل، ایک اچھی نظم، ایک خوبصورت قطعہ اور اچھے شعر کی اعلیٰ صفت یہی ہوتی ہے کہ گداز ہو، دلفریب ہو، جاذب ہو، پرکشش ہو اور متاثر کرتا ہو۔ حسرت کمالی کا کمال یہ ہے کہ ان کے اشعار اس معیار و میزان پر کھرے اترتے ہیں۔

لطف یہ کہ حسرت کمالی مرحوم کو یہ بے نامی نام اور الزام پسند تھے، ان کے خیال میں، فنکار اور قلم کار کو میر کی طرح 'ابنارمل' ہونا اور 'عطار کے لونڈے' سے دوا لینے میں کوئی عار یا قباحت نہیں ہونی چاہیے۔ مجھے علم ہے کہ حسرت کمالی نے اکثر نادار طلبا کی معاونت و مدد بھی کی ہے جو شخص ظاہری طور پر سخت، کھردرا اور لیے دیے ہو، اس کے باطن میں محبت، مروت، خلوص اور ہمدردی کا جھرنا بھی بہتا تھا، یہ رمز و راز وہ لوگ خوب جانتے ہیں جو ان سے قریب رہے ہیں۔

انھوں نے لکھا، شب و روز لکھا لیکن جو کچھ لکھا، زندگی سے ہم آغوش ہوکر لکھا۔ ان کی تحریریں، ان کی تقریریں، ان کی تقریظیں، ان کی حکایتیں، ان کی اشارتیں اور ان کے افکار، زندگی آمیز بھی ہیں اور زندگی افروز بھی۔

حسرت کمالی کے قلم و قدم میں غضب کا جادو تھا، الفاظ جبین نازخم کیے ان کے حضور وارد ہوتے تھے اور خیالات کا پُرشور دریا خود بہہ کر ان کے پاس حاضری دیتا تھا۔ اردو شاعری اور نثر نگاری کی دنیا میں اپنے معتدل رویے و رجحان کے سبب، حسرت کمالی مشہور بھی ہوئے اور کسی حد تک اپنی حقیقی شہرت و ناموری سے محروم بھی رہے! اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ شاہجہانپور کی 'ادبی سیاست' اور 'منافقانہ ذہنیت' نے مرحوم کو وہ مقام و مرتبہ حاصل نہ ہونے دیا، جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ شاعری کی بیشتر اصناف پر حسرت کمالی کو عبور حاصل تھا، حمد، نعت، منقبت، نظم، غزل، قطعہ، رباعی اور دوہے، ان کی دسترس میں تھے۔ انھوں نے ان سب میں طبع آزمائی کی ہے، افسوس صد افسوس، وہ پیکرِ علم و ہنر، ماہرِ شعر و سخن سدا کے لیے روپوش ہوگیا جو ابر نیساں بن کر تقریباً نصف صدی تک علم و عرفان کے موتی لٹاتا رہا۔ طب و حکمت، انسانیت و حقانیت، آگہی و حسیّت کا وہ مردِ حق آگاہ، دنیا سے رخصت ہوگیا جو مشرق کے علمی میخانوں سے بھی سرشار و شرابور تھا اور مغرب کے میکدۂ سائنس و حکمت اور رموز فیاضی سے بھی مخمور تھا۔ آج وہ ہستی نہیں رہی جس کو کمال کا سکہ وطنِ عزیز شاہجہانپور میں چل رہا تھا۔ حیف صد حیف! اس شاعر ذیشان کا خاتمہ ہوگیا، جس کا دماغ معلومات کا خزینہ، سینہ، علوم اسلامی کا سفینہ اور جس کا شعور و شعار شاعری کا دفینہ تھا۔ جس کا قدم اور قلم نفرتوں، منافقتوں اور لامذہبوں کی عیاریوں کو بے نقاب کرتا تھا۔ اسلام اور اسلامی تعلیمات کی صداقتوں کو آشکار کرتا تھا۔

الغرض، حسرت کمالی مرحوم، انسانیت کے علمبردار، ترویج ادب کے جاں نثار، دبستانِ شاہجہاں پور کے افتخار اور شرافت کے معیار تھے۔ اردو شاعری، اپنے ایک بے لوث و بے ریا، سچے و اچھے خادم اردو اور عاشق اردو سے سدا کے لیے محروم ہوگئی:

سبزۂ نورستہ اِس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

Prof Khalid Husain Khan, 27/10, Shastri Nagar, Meerut - 250003 (UP)

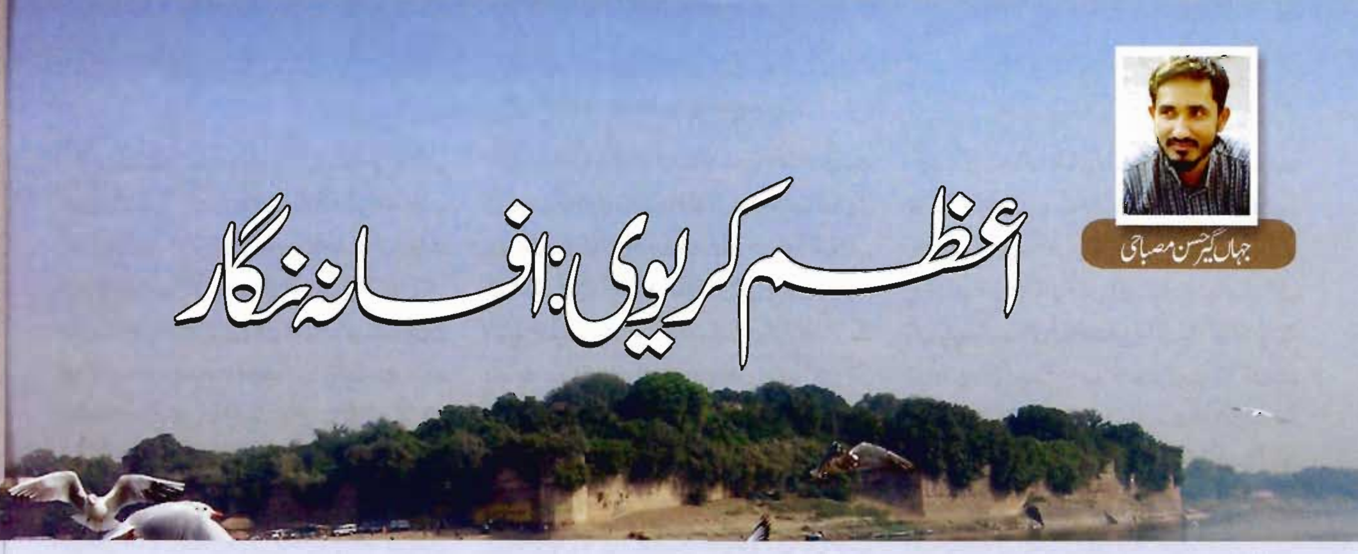

جہاں گیر حسن مصباحی

اعظم کریوی: افسانہ نگار

اعظم کریوی ہندوستانی زبان کے اہم افسانہ نگاروں میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جن کا شمار اردو افسانے کی تشکیلی روایت میں بنیادی کردار ادا کرنے والے افسانہ نگاروں کی صف میں ہوتا ہے۔ کچھ محققین نے ان کا نام 'اعظم حسین' گمان کیا ہے جو درست نہیں، بلکہ اعظم کریوی کا اصل نام انصار احمد ہے۔ وہ ہندوستان کے مشہور شہر الہ آباد، پرگنہ چائل، بمقام موضع کرئی 1899 میں پیدا ہوئے جو اُن کا آبائی گھر تھا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلے گئے جہاں 1955 میں ایک وحشت ناک حملے میں ان کی وفات ہوگئی۔

ان کے والد فیاض احمد علاقے کے رئیس اور زمیندار تھے، چوں کہ گھرانہ خوشحال تھا، اس لیے ان کا بچپن نہایت بے فکری اور آسودگی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم گاؤں ہی میں حاصل کی، پھر الہ آباد گئے، وہاں سے میٹرک وغیرہ پاس کیا اور تعلیم سے فراغت کے بعد فوج میں ملازمت اختیار کرلی۔

اعظم کریوی کی ادبی زندگی کا آغاز ان کی اوائل عمر ہی میں شعر گوئی سے ہو چکا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی حکیم اسرار احمد کریوی کے مطابق: اسکول میں ایک استاذ تھے جو پنڈت جی مشہور تھے، ان سے اعظم کریوی کی بڑی ناراضگی رہتی تھی، چنانچہ ان کے خلاف دو چار اشعار کہہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیا کرتے تھے، اس طرح ان کی تخلیقی صلاحیت پہلے پہل شعر گوئی کے روپ میں ظاہر ہوئی۔

ایک روایت کے مطابق 1916 سے 1920 تک ملازمت کے سلسلے میں میرٹھ میں قیام پذیر رہے اور یہیں سے ان کے نثری ادب کی ابتدا ہوئی کہ انھوں نے چند رومانی خطوط کا ایک مجموعہ تیار کیا 'پریم پتر' کے نام 1919 عیسوی میں میرٹھ سے شائع بھی کرایا، پھر جب 1921 میں اپنے استاذ نوح ناروی کی سرپرستی میں الہ آباد سے ماہنامہ 'طوفان' نکالا تو باضابطہ طور پر انھوں نے افسانہ نگاری شروع کی اور پہلا افسانہ 'پریم کی انگوٹھی' اپنے ہی ماہنامہ 'طوفان' میں شائع کرایا جو نہ صرف بہت پسند کیا گیا بلکہ ہندی اور گجراتی زبان میں اس کا ترجمہ بھی شائع کیا گیا۔

اعظم کریوی نے اپنی زندگی میں شاعری بھی کی، مضامین بھی لکھے اور رسائل کی ادارت بھی کی، لیکن ان کا خاص میدان افسانہ نویسی ہی رہا۔ ان کے طبع زاد اور غیر طبع زاد مطبوعہ افسانوں کی مجموعی تعداد تکرار اشاعت کے ساتھ کل 264 تک پہنچتی ہے، لیکن تحقیق وتحیص کے بعد ان کے افسانوں کی حتمی تعداد 130 ٹھہرتی ہے، ان میں سے کل 90 افسانے ہی اب تک مدون ہوسکے ہیں۔

اعظم کریوی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'شیخ وبرہمن' ہے جو 1942 میں طبع ہوا تھا اور آخری افسانوی مجموعہ 'روپ سنگار' ہے جو 1945 میں اشاعت پذیر ہوا۔ ان کے مطبوعہ افسانوی مجموعے سات ہیں۔

(1) شیخ وبرہمن (2) پریم کی چوڑیاں (3) دکھ سکھ، (4) کنول (5) انقلاب (6) ہندوستانی افسانے، (7) روپ سنگھار

موضوعات کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انھوں نے اپنے افسانوں میں برصغیر کے معاشرتی اور سماجی مسائل کو زیادہ نمایاں کیا ہے، بالخصوص دیہاتی زندگی، وطن پرستی، سماجی وسیاسی مسائل، مختلف تحریکات عصریہ، مشرق ومغرب کی کشمکش، برصغیر میں خواتین کی کسمپرسی، پولیس کا منفی کردار، عوام کی جہالت، توہم پرستی وضعیف الاعتقادی، فطری مناظر، مذہبی رہنماؤں کی منافقت، بااثر افراد اور زمینداروں کے مظالم، انگریزی حکومت کی خود غرض پالیسیاں، غربا کی بے کسی اور ساہوکاروں کی زرکشی جیسے موضوعات ان کے افسانوں کے غالب موضوعات ہیں۔

اعظم کریوی کے افسانوں میں انیسویں صدی کے دور اول کی معاشرت، سیاست اور اخلاق ومذہب کی ایک واضح تصویر ابھرتی دکھائی دیتی ہے جو اپنی تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اپنی تہذیبی روایات کی پاسداری بھی ہے۔

اعظم کریوی کے افسانوں کی بنیاد کیا ہے، اس پر وہ خود روشنی ڈالتے ہیں کہ: ''جب دل پر چوٹ لگتی ہے یا دل کسی نظارہ سے متاثر ہوتا ہے تو میں افسانہ لکھنے بیٹھ جاتا ہوں۔ جس گاؤں یا شہر کے متعلق افسانے لکھتا ہوں، میری انتہائی کوشش ہوتی ہے کہ ان مقامات کی مخصوص فطرتیں جھلکتی ہوئی نظر آئیں تاکہ پڑھنے والا اس مقام کی مخصوص فضا کا لطف حاصل کرسکے۔ عربی یا فارسی کے شیریں الفاظ کے ساتھ ساتھ بھاشا کے میٹھے شبد اور آسان سے آسان زبان میں سبق آموز افسانے لکھنا میری افسانہ نگاری کا مقصد ہے۔'' (میں افسانہ کیوں کر لکھتا ہوں، 1934)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں چار چیزوں کا عمل دخل کچھ زیادہ ہے۔

(1) ان کے افسانے ان کے دل کی آواز ہیں اور یہ طے شدہ حقیقت ہے کہ:

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں، طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

(2) جس جگہ یا جس مقام کو وہ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں اسے فطری بنانے پر زور دیتے ہیں، تاکہ کسی تصنع کا احساس نہ ہو اور پڑھنے والوں کو ایسا محسوس ہو کہ وہ اس کے دل کا ترجمان ہے۔

(3) ایسی زبان استعمال کرتے ہیں جو ہر کوئی آسانی سے سمجھ سکے، بہ الفاظ دیگر وہ اپنے افسانوں میں ہندوستانی زبان کا استعمال کرتے ہیں۔

(4) وہ اپنے افسانوں کو سبق آموز بنانے پر زور دیتے ہیں، کیوں کہ ان کا مقصود سماج کی اصلاح ہے۔

اگر سچ کہا جائے تو پریم چند کی اصلاح پسندی، حقیقت بیانی اور دیہات نگاری کے فن کو جس خوبی اور ہنرمندی سے

اعظم کریوی نے برتا ہے وہ شاید ہی کسی نے سوچا ہو، بقول مجنوں گورکھپوری: ''اگر کوئی پریم چند کے اثر کو اپنے اندر جذب کر سکا ہے تو وہ اعظم کریوی ہیں، ان کے افسانے بھی دیہات کی عام زندگی سے متعلق ہوتے ہیں اور وہ اپنے افسانوں میں مقامی رنگ کافی بھر دیتے ہیں، ان کا دل حساس ہے اور ان کی نگاہ تیز اور رسا ہے، وہ واقعات کے نازک سے نازک امکانات اور جذبات کے لطیف سے لطیف میلانات کو محسوس کر کے بیان کر سکتے ہیں۔'' (افسانہ،ص:30-219)

اس کے باوجود پریم چند اور اعظم کریوی کے افسانوں میں واضح فرق نظر آتا ہے، اول تو یہ کہ پریم چند کی حقیقت پسندی میں اعظم کریوی نے رقت پسندی کا زاویہ شامل کیا، نیز پریم چند کے کردار قوتِ عمل سے معمور اور بے حد فعال ہیں جب کہ اعظم کریوی کے کردار قسمت پر حد درجہ صابر وشاکر ہیں۔

دوم یہ کہ جو رومانی مستی و رنگینی ہے اعظم کریوی کے افسانوں میں پائی جاتی ہے وہ پریم چند کے افسانوں میں نہیں، پریم چند کے افسانوں میں سب کچھ ہونے کے باوجود شاعرانہ مستی وجوش نہیں، جب کہ اعظم کریوی کی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی 'شعریت' سے خالی نہیں ہے۔

یہ اس لیے بھی ممکن ہے کہ اعظم کریوی مزاجاً رومان پسند تھے، وہ ابتدائی زندگی ہی سے علاقے کی سحر انگیزیوں میں کھوئے کھوئے سے رہتے، ان کا آبائی گھر گنگا کے کنارے پر واقع تھا، جہاں سے وہ روز گنگا کے جل ترنگ کو دیکھا کرتے، بلکہ اکثر و بیشتر کشتی پر بیٹھ کر دور تک نکل جاتے، مناظر فطرت کا نظارہ کرتے اور پھر اسی کی مدد سے اپنے افسانوں کی عمارت کا تانا بنتے تھے۔

جہاں تک حقیقت بیانی اور دیہات نگاری کی بات ہے تو پریم چند کے علاوہ معاصرین میں سدرشن اور علی عباس حسینی نے بھی اس دشت کی سیاحی کی ہے لیکن ان میں اعظم کریوی پریم چند سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں، بلکہ حق تو یہ ہے کہ اعظم کریوی نے اپنے افسانوں میں پریم چند کے فن خاص کو بڑی مہارت کے ساتھ سمو لیا ہے۔ بنا بریں احمد صدیق مجنوں گورکھپوری نے اعظم کریوی کو پریم چند کا سچا شاگرد قرار دیا ہے کہ: ''اعظم کریوی پریم چند کے سچے شاگرد ہیں۔ وہ بے لاگ اور غیر شخصی خارجیت جو پریم چند کا خاص فن ہے، اعظم کریوی میں کافی پائی جاتی ہے۔''

(ادب و زندگی،ص:160 تا 161)

حالانکہ اعظم کریوی نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ شہر میں گزارا ہے، اس کے باوجود اُن کے افسانے خالص دیہات کے نمائندے ہیں، ان کا ایک افسانہ 'انقلاب' ہے جسے دیہی زندگی کا بہترین عکاس کہا جا سکتا ہے۔ اس افسانے میں اعظم کریوی نے ایک طرف 'امریاپور' گاؤں میں بسنے والوں کی سادہ لوحی، بھائی چارگی اور مروت و ہمدردی کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے تو دوسری جانب ساہوکاروں اور عہدے داروں کی بے ایمانی و مکاری کی پردہ دری کی ہے کہ ''امریاپور'' میں جب سے کارخانے بننے شروع ہوئے تو گاؤں میں لہلہاتے سبزہ زار، اونچے اونچے درخت سب ختم ہو گئے، اب نہ ڈھور ڈنگر کے لیے چارے کا ذریعہ رہا اور نہ وہ چھاؤں جہاں محفلیں جمتی تھیں۔ شراب تاڑی کے طوفان نے گاؤں کا سکون درہم برہم کر دیا :اور جو کسان ومزدور کبھی بڑے آرام سے زندگی بسر کر رہے تھے، ان کا استحصال ہونے لگا، یہاں تک کہ گاؤں کی بہو-بیٹیاں جو کبھی بے روک ٹوک آیا جایا کرتی تھیں مگر اب ان بہو-بیٹیوں کا گھر سے نکلنا دوبھر ہو گیا۔

ایک وقت تھا کہ راجہ رام موہن رائے، ایشور چند ودیا ساگر اور دیگر اصلاح پسندوں نے ہندوستان سے 'ستی' جیسی سماج دشمن رسم کو ختم کرانے میں اچھی بھلی کامیابی حاصل کر لی تھی اور کافی حد تک بیوہ کی دوسری شادی کے راستے ہموار بھی کر دیے تھے مگر ابھی بھی سماج میں کچھ ایسے ناخلف لوگ موجود تھے جو اس مسئلے کو روکنے میں کوئی تعاون نہیں دے رہے تھے، ایسے میں بیوہ کو کن پرسوز حالات سے گزرنا پڑ رہا تھا اور آس پاس رہنے والے لٹیروں سے وہ کس طرح مزاحم تھی، ان تلخ حقائق کو اعظم کریوی نے بڑی خوبیوں سے پیش کیا ہے اور اس رسم ورواج کے انسانیت سوز نتائج کی نشاندہی کرتے ہوئے اس سے باز رکھنے کی اچھی کوشش بھی کی ہے۔ افسانہ 'بایا' اس کی بہترین مثال ہے۔

ان کا ایک شاہکار افسانہ 'قربانی' ہے جس میں انھوں نے ان مفاد پرستوں کی قلعی کھولی ہے جو مذہب کے پس پردہ اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔

اعظم کریوی نے سماج میں موجود غربت وافلاس اور خواتین کی بے بسی کے ساتھ، بلکہ ان خواتین کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے جو سماج کی ناانصافیوں کے خلاف لڑنے کا حوصلہ اور قوت فیصلہ کا جذبہ رکھتی ہیں۔ 'کنول' ایک ایسی ہی صنف نازک کی زندگی پر مبنی ہے جو جبری شادی کو نہیں مانتی ہے اور جب انسانی کھول میں چھپے درندے اس کی عفت و پاکدامنی پہ ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہیں تو اس سماج کو یہ کہتے ہوئے ٹھوکر مار دیتی ہے کہ: ''میں نے اب تک سماج کا خیال رکھا۔ میری جانب سے کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے کسی کو شکایت کا موقع ملے یا سماج کی بدنامی ہو، مگر وہی سماج میری عزت کا طلبگار ہے۔ بس اب میرے لیے ایک ہی راہ رہ گئی ہے کہ میں سماج کو چھوڑ دوں۔''

اعظم کریوی کا خاص مقصد سبق آموزی تو ہے لیکن وہ ناصح، مشفق اور واعظ نہیں بنتے بلکہ وہ صرف اپنے مشاہدات کو سلیقے سے پیش کرنے پر زور دیتے ہیں، اس کے باوجود اُن کے پلاٹ نہایت واضح اور سیدھے سادے ہوتے ہیں اور کردار بھی اس قدر فطری ہوتے ہیں کہ ان میں زندگی کا پورا پورا رنگ وآہنگ موجود ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ زبان کی چاشنی، مکالمے کا فطری انداز، جملوں کی شیرینی اور گھلاوٹ بھی ایک دلنشیں گداز کی کیفیت پیدا کر دیتی ہے، بقول برج موہن دتاتریہ کیفی: سلاست جو مثنوی کی طرح افسانچہ کی شرط اول ہے، اس میں برابر موجود ہے۔ نہ پلاٹ میں الجھاؤ ہے، نہ اسلوب اور مناظر نگاری میں تصنع اور تکلف۔ ہر افسانہ رواں دواں اور نتیجہ خیز ہے۔

اعظم کریوی کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں میں ہندو معاشرت کی جو جادوئی عکاسی کی ہے وہ شاید ہی کسی اور مسلم افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہو۔ ایک ہندو افسانہ نگار کے لیے ہندو معاشرت اور اس کے رسم و رواج کی تصویر کشی کرنا تو فطری بات ہے لیکن ایک مسلم افسانہ نگار کے لیے ہندو سماج کی صحیح اور سچی مصوری کرنا محال نہیں تو آسان بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود اعظم کریوی نے جس صحت مند ہندو معاشرت کے صحیح نظارے پیش کیے اور احساسات وجذبات کی جو عمدہ مصوری کی ہے اس سے بڑھ کر کسی مسلمان کیا ہندو کی کوششیں بھی مشکور نہیں ہو سکتیں۔

غرض کہ اعظم کریوی کے افسانوں میں انیسویں صدی کے دور اول کی معاشرت، سیاست اور اخلاق ومذہب کی ایک واضح تصویر ابھرتی دکھائی دیتی ہے جو اپنی تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہے اور اپنی تہذیبی روایات کی پاسدار بھی ہے۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ایک نمائندہ افسانہ نگار کی جو خصوصیات ہوتی ہیں قریباً وہ سبھی اعظم کریوی میں موجود ہیں۔ ■

Md. Jahangir Hasan, Research Scholar, Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

پاکستانی افسانے پر ہندوستانی تہذیب کے اثرات

(ممتاز مفتی بطورِ مثال)

پاکستانی تہذیب، پاکستانی ثقافت، پاکستانی کلچر!
پاکستان میں اب یہ شعور تھم گیا ہے مگر ایک زمانہ تھا جب احمد ندیم قاسمی سے حسن عسکری تک پاکستان کے بیشتر مقتدر ادبا وشعرا اسی آہنگ کے ہم نوا تھے اور احمد ندیم قاسمی صاحب کا رسالہ 'فنون' ایسے دعاوی کا مرکز۔

مگر سچ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ انھی کے رسالے میں 'انڈالوجی' کے عنوان سے قسط وار رشید ملک کی جو تحریریں چھپتی رہیں اُن میں فنونِ لطیفہ پر ہندوستانی تہذیب، ہی نہیں رگ وید اور سام وید کے اثرات بھی تلاش کیے جاتے رہے۔

(بحوالہ فنون جون جولائی 1989)

اور فنون اپریل مئی 1976 کے چند افسانوں میں:

(1) پاکستانی عورت کے کانوں میں بڑی بڑی بڑی بالیاں نظر آتی ہیں۔
(2) پاکستانی کردار ہیگل کا سیکڑوں بار سنا گانا سنتا ہے ... دن سونا سورج بنا اور چندرا بن رین
(3) میوزک کی دھما دھم پر اسے تان سین یاد آتا ہے
(4) اس کی محبوب برہا کا گیت سن کر رونے لگتی ہے
(5) وہ فون پر ایسے ہیلو ہیلو کرتا ہے جیسے پپیہا 'پی کہاں پی کہاں' پکار رہا ہو۔
(6) نوشاہ کے سر سہرا بندھتا ہے تو سہرا بندھائی کے لیے لے دے ہوتی ہے، پھر جوتا بھی چھپایا جاتا ہے۔
(7) کھیتوں میں گندم اور مکئی کے پودے اُگ رہے ہیں، راہوں میں آم، امرود، اور جامن کے درخت ملتے ہیں۔
(8) ریلوے اسٹیشن پر ٹکٹ کلکٹر مسافروں کو بیوقوف بنا کر پیسہ ہتھیا تا ہے اور گوالا دودھ میں پانی ملاتا ہے۔

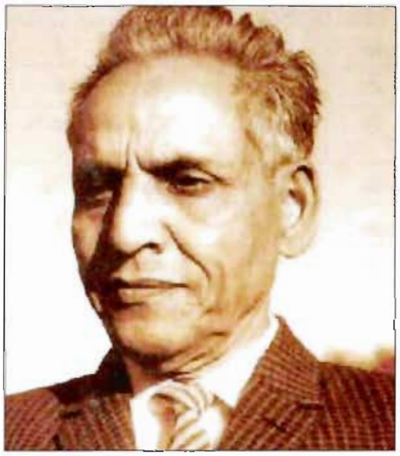

شرط انصاف ہے، یہ سارا کس ڈھب سے صرف اور خالص پاکستانی ہے اور ہندوستانی نہیں ہیں؟

سچ یہ ہے کہ سارا کچھ برِصغیر کی اُس مشترکہ ثقافت کا بہت چھوٹا سا نمونہ ہے جو ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش تینوں کے لیے مشترکہ طور پر Source of inspiration ہے۔

اور اسی پس منظر نے مجھے مجبور کیا کہ میں پاکستانی فکشن میں ہندوستانی یا مشترکہ وراثت کو تلاش کروں تاکہ اس وہم، الیوژن اور خود فریبی کا پردہ چاک ہو سکے جیسے سیاسی ضرورتوں کے تحت جب نہ تب تاننے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس موضوع پر پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

میں نے مثالاً صرف ایک پاکستانی افسانہ نگار ممتاز مفتی کا انتخاب کیا ہے۔

ممتاز مفتی اِس لحاظ سے بھی اہم اور نا قابلِ فراموش ہیں کہ اول تو وہ پورے پاکستانی ہیں یعنی مہاجر نہیں ہیں اور دوئم یہ کہ منٹو کے بعد ممتاز مفتی سے زیادہ، کسی اور افسانہ نگار نے طوائف کو اپنی کہانیوں کا موضوع نہیں بنایا ہے۔ مگر منٹو اور ممتاز مفتی میں ایک بڑا افراق یہ ہے کہ منٹو نے طوائف کے ذریعے انسانی جبلت تلاش کی، جبکہ ممتاز مفتی نے جبلت کے برعکس شخصیت کے پوشیدہ پہلوؤں پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی۔ جبلت اور شخصیت سے میری مراد جوہر اور شخصیت ہے، یعنی جبلت تو دراصل انسانی وجود کے وہ خصائص ہیں جن کے پیدا ہونے یا ابھرنے میں انسان کا اپنا زور نہیں چلتا مثلاً بھوک، جنس، غصہ اور خوف، کہ یہ چاروں صفات یا خصوصیات انسان چاہے یا نہ چاہے اُس کے وجود کا حصہ ہیں اور یہی جبلت ہے۔ مگر جب آدمی اِس جبلت پر تہذیب کا بند باندھتا ہے، بھوک اور جنسی خواہش کی تکمیل یا غصے کے اظہار کے مسئلے پر ایک مہذب آدمی کی طرح اپنا تفاعل پیش کرتا ہے تو گویا جبلی انسان کے اندر سے ایک نئی شخصیت ابھرتی ہے، یہ جبلت پر شخصیت کی فتح کی مثال ہے۔ منٹو اِس فتح کو اہمیت نہیں دیتے جبکہ ممتاز مفتی طوائف کے یہاں بھی یہ خواہش تلاش کرتے ہیں۔

ممتاز مفتی کے یہاں طوائف کے علاوہ دوسرا غالب پہلو جو بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ وہ ہے عشق!

ممتاز مفتی کے یہاں عشق طرح طرح سے جلوہ فرمائی کرتا ہے۔ وہ کبھی 'ایک ہاتھ کی تالی' کی صورت میں عاشق اور اس کی معشوقہ دونوں کو 'بلا امید تو جہ' عشق کیے جانے پر مجبور کرتا ہے، اور کبھی 'سے کا بندھن' میں یہی عشق مادہ یا جسم سے اوپر اٹھ کر، زمان ومکان سے ماورا ہو کر وجود پر ایک ایسے تعلق اور بندھن کے حاوی ہو جانے کا استعارہ بن جاتا ہے جو آج موجودہ تجزیہ و توجیہ (Rea Soning and Analysis) کی دنیا میں مجرد خیال (Abstract idea) کے ذیل میں آتا ہے اور تجسیمیت

کا عادی معاشرہ فی زمانہ اس تجرید سے اوب چکا ہے مگر ممتاز مفتی جدید وقدیم کی بحث سے اوپر اٹھ کر اور بے پرواہو کر اس ازلی اور ابدی جذبے کے عکاس ہیں جس کی اہمیت ہر صوفی اور ادیب تسلیم کرتا ہے۔

'سمے کا بندھن' ایک ایسی کہانی ہے جس کا انگ انگ اور جوڑ جوڑ مشترکہ ہندوستانی ثقافت کے رنگ میں رنگا ہوا ہے، قصہ، پلاٹ، ماحول، ماجرا، جزئیات، لفظیات اور اسلوب جس پہلو سے بھی اس کہانی کا جائزہ لیا جائے گا، ہر طرح سے یہ کہانی مشترکہ ہندوستانی ثقافت کی بہترین وارث اور نمائندہ نظر آئے گی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کہانی کا بنیادی خیال وقت ہے اور وقت ایک ایسا عنصر ہے جو بطور خاص ہندوستان میں اور عمومی لحاظ سے دیکھیے تو پورے آریائی پس منظر میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ جب کہ]اگر اسلامی پس منظر اور اس پر طویل گفتگو کو کنارے رکھ دیا جائے تب بھی] عربی پس منظر میں وقت کی کوئی خاص اہمیت نہیں بیان کی جاسکتی کیوں کہ عربوں کے یہاں جو تعلیم بالعموم مقبول رہی ہے اس میں 'ہر وقت خدا کا وقت' کا تصور بطور خاص قابل ذکر ہے، اور اسی لیے وہاں نجومیوں کے سعد، نحس کا تصور بھی کچھ خاص طور پر نہیں پنپ سکا۔ یہ صحیح ہے کہ نماز کے اوقات، زوال کے اوقات، فجر کی دعاؤں اور رات کے آخری حصے میں عبادتوں کا تصور کسی نہ کسی حد تک کسی خاص وقت کے اہم اور کچھ اوقات کے غیر اہم ہونے کے تصور کو تقویت بخشتا ہے مگر اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ایسے تمام تصورات کی حیثیت ضمنی ہے اور یقین واعتماد اور اعتقاد کے طور پر اسی بنیادی تصور کو فوقیت حاصل ہے کہ 'ہر وقت خدا کا وقت ہے۔"

جبکہ ہندوستان میں معاملہ مختلف ہے۔ یہاں واضح طور پر اوقات و ایام کے سعد یا نحس ہونے کا تصور عام اور مقبول ہے۔ پرانی کتابوں میں سعد و نحس پر خوب گفتگو ملتی ہے بلکہ شعرانے منظوم انداز میں بھی اس سمت رہنمائی کی ہے مثلاً :

(1)

ہفت روزے نحس باشد ہر مہے
زو حذر کن تا نہ یابی ہیچ رنج
سہ و پنج و سیزدہ یا شانزدہ
بست و یک یا بست و چار و بست پنج

[3-5-13-16-21-24-25 تاریخیں ہر حال میں نحس ہیں]

(2)

عقرب اندر ہر مہے دو نیم آرد گراں
ہر کہ کارے نوکند بیند در و خطر و زیاں

یازدہ اندر اساڑھ و ہشت اندر ساون است
شش بہ بھادوں، سہ ماہ آسن، یک بکاتک امتحاں
وہشت آمد بہ اگھن، بست وشش آمد بہ پوس
بست وسہ در ماگھ آمد، بست و یک پھاگن بداں

ہژدہ اندر چیت، بشمر شا نزدہ بیساکھ گیر
سیزدہ در جیٹھ گیر، ایں نمی دانی، بداں
یہ توبات منظومات کی ہوئی۔ اردو فارسی کی نثری کتابوں میں موسموں اور ایام کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے باضابطہ جدول بھی

ہفت ستارہ

(واثراتِ آں سیارگان کہ بشب و یوم تعلق دارند)

ساعت اور دن ↓	اتوار (نحس)	سمبار (سعد)	منگل (نحس)	بدھ (سعد)	جمعرات (سعد)	جمعہ (سعد)	سنیچر (نحس)
7	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل
8	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری
9	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ
10	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس
11	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ
12	مشتری	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد
1	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس	قمر
2	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل
3	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری
4	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ
5	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس
6	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ
ساعت شب ↓	اتوار	سمبار	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	سنیچر
7	عطارد	مریخ	عطارد	مشتری	شمس	قمر	مریخ
8	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس
9	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ
10	مشتری	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد
11	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس	قمر
12	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل
1	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری
2	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ
3	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ	زحل	شمس
4	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد	مشتری	زہرہ
5	مشتری	زہرہ	زحل	شمس	قمر	مریخ	عطارد

مذکورہ بالا جدول کے پس منظر میں قبولیتِ دعا کے اوقات کا تذکرہ بھی کیا جاسکتا ہے]جس کی غالباً عربوں کے یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے]

اوقاتِ قبولیتِ دعا

(1) سنیچر1 : صبح صادق
(2) اتوار : عصر
(3) سمبار : ظہر
(4) منگل : دن کا آخری حصہ
(5) بدھ : ظہر
(6) جمعرات : وقتِ سحر
(7) جمعہ : درمیانِ ظہر وعصر

تیار کیا جاتا تھا جس میں سعد اور نحس اوقات کی نشان دہی کی جاتی تھی۔ جدول ملاحظہ ہو:

قصہ مختصر یہ کہ آریائی اقوام میں وقت کا ایک بہت ہی منضبط، منظّم اور حساس تصور ہے، جبکہ اسلام یا عربوں کے یہاں اوقات کے مذکورہ بالا جدول کی طرح وقت اپنی مختلف ساعتوں میں اِس طرح وضاحت اور صراحت کے ساتھ سعد اور نحس کے خانوں میں منقسم اور فعال نہیں ہے، لہٰذا اس کہانی میں وقت کے عنصر پر جو زور دیا گیا ہے، یہ اصرار اِسے ہندوستانی اور آریائی ثقافت کا ترجمان اور وارث بناتا ہے۔

کہانی سے کچھ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

(1) آپی کہا کرتی تھی: سنہرے! سمے سمے کی بات ہوتی ہے۔ ہر سمے کا اپنا رنگ ہوتا ہے، اپنا اثر ہوتا ہے، اپنا سمے پہچان۔ سنہرے، اپنے سمے سے باہر نہ نکل، جو نکلی تو بھٹک جائے گی۔

(2) سمے دیکھ سنہرے، ابھی تو شام ہے، یہ سمے تو اداسی کا سمے ہے، دکھ کا سمے، شام بھئی گھنشام نہ آئے، آپی گنگنانے لگتی۔ یاد ہے نا یہ بول؟ شام تو نہ آنے کا سمے ہے، تیرا آنے کا سمے ہے۔ پگلی ذرا رُک جا۔ اندھیرا گاڑھا ہونے دے، پھر تیرا ہی سمے ہوگا، پچھلے پہر تک۔

(3) جب تک جھاگ اُڑتا رہے، ہمرا سمے، جب دو جا شانت ہوجائے سمجھ لے ہمارا سمے بیت گیا اور جب سمے بیت جائے تو دھیرج پاؤں دھرنا، ٹھمک کا سمے گیا، چمک نہ مارنا چمک کا سمے گیا۔

(4) سمے بیتا جا رہا تھا۔ سمے کی شد بد نہ رہی تھی، کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، سمے جیون سے نکل جاتا ہے کہ کون ہیں کیا کر رہے ہیں کسی بات کی شد بد نہیں رہتی، اس روز وہ سمے ایسا ہی سمے تھا۔

(5) دفعتاً گھڑی نے تین بجائے، آپی ہاتھ جوڑے اُٹھ بیٹھی، بولی: چھما کرو ٹھاکر جی، معافی مانگتی ہوں، ہمارا سمے بیت گیا، اب بیٹھک ختم کرو۔

(6) ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا، نہ آپی، وہ بولا، ابھی تو رات بھیگی ہے، آپی بولی، ٹھاکر! ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہیں، جب رات بھیگتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔

(7) محفل ٹوٹ گئی تو ہم تینوں آپی کے گرد ہوگئیں۔ ’’آپی! یہ سمے کا گورکھ دھندا کیا ہے؟‘‘

آپی بولی: ’’لڑکیو! سمے بڑی چیز ہے، ہر کام کا الگ سمے بنا ہے، رات کو گاؤ بجاؤ، پیو پلاؤ، ملو ملاؤ، موج اڑاؤ، بس تین

بجے تک، پھر سمے اُس کا سمے ہے... یہ دھندا جو ہمارا ہے اُس کے سمے میں نہیں چل سکتا، اس کے سمے میں پاؤں نہ دھرنا، اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی، جو وہ راضی ہوگیا تو بھی ماری جاؤ گی اور دیکھو اُس کے سمے کے نیڑے نیڑے بھی ایسا گیت نہ گانا جو اُسے پکارے، بھجن نہ چھیڑنا، ڈرو، وہ کہیں تمھاری پکار سن کر ہُنکارا نہ بھر دے۔‘‘

(8) پھر وہ دن آگیا جب میں نے انجانے میں سمے کا بندھن توڑ دیا... رات پھر وہاں (ٹھاکر کی حویلی میں خواجہ کی محفل لگی... آدھی رات کے سمے محفل اتنی بھیگی کہ سب کی آنکھیں بھر آئیں... پھر خواجہ کے گیت چلے تو میں بھیگ گئی... پر میں بھیگ بھیگ کر گاتی گئی، سمے بیت گیا اور مجھے دھیان ہی نہ آیا کہ میں اُس کے سمے میں پاؤں دھر چکی ہوں۔

(9) بس پتُّر! تیرا اِس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ دانہ پانی کھتم ہوگیا، تو نے اس کے سمے میں پاؤں دھر دیا۔ اُس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اِس دھندے جوگی نہیں رہی۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے جو خاص نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ صرف اور صرف یہی ہے کہ اِس کائنات میں کائنات کے بنانے والے نے ہر کام کا الگ الگ وقت مقرر کیا ہے۔ اگر عبادت کے وقت میں ناچ رنگ لیا جائے گا تو یہ گویا اس کے سمے میں کھنڈت ڈالنے کا عمل ہوگا۔ گویا وقت پر ارتکاز کر رہی ہے اور چونکہ وقت کو ہر کام کی بنیاد بنانے کا عمل خود ہی آریائی اور ہندوستانی عمل ہے اِس لیے یہ نتیجہ نکالنا غالباً صائب ہوگا کہ اِس کہانی کا بنیادی خیال بھی آریائی اور ہندوستانی ذہن و ثقافت کا وارث اور امین ہے، اور اِسی بنیادی خیال (وقت) کو ممتاز مفتی نے ’سمے کا بندھن‘ میں خوب صورت تخلیقی لباس عطا کر دیا ہے۔

بنیادی خیال کے بعد دوسری منزل ہے قصہ کی۔ اِس پہلو سے اگر جائزہ لیا جائے تب بھی ہندوستانی تہذیب کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ سنہری نام کی ایک طوائف ایک ٹھاکر کے گھر گانے جاتی ہے۔ ٹھاکر کے گھر پر گانے کا یہ انتظام خواجہ غریب نواز کی یاد میں کیا گیا ہے۔ اِس محفل میں صرف خواجہ کی شان میں گانے اور پوری رنگ میں منقبتیں گائی جاتی ہیں۔ مگر اس محفل کا اثر سُنہری پر یہ ہوا کہ ٹھاکر کے گھر سے لوٹ کر سنہری اپنی شد بد کھو بیٹھی۔ اُسے بات بات پر رونا آتا، رِقت طاری ہوجاتی اور وہ ’حال‘ کھیلنے لگتی۔ سنہری طوائف جس نائکہ (آپی) کی نگرانی میں تھی وہ ایک مشفق و مہربان اور جہاں دیدہ خاتون تھی اور اپنے ’کوٹھے‘ پر سنہری، روپا اور پیلی نام کی تین طوائفوں کے ساتھ ماں جیسا سلوک کرتی نظر آتی ہے۔ اُس نے سنہری کا یہ حال دیکھا تو بولی: ’’بس پتر تیرا اِس بیٹھک سے بندھن ٹوٹ گیا۔ تو نے اس کے سمے میں پاؤں دھر دیا، اس نے تجھے رنگ دیا۔ اب تو اِس دھندے جوگی نہیں رہی۔‘‘

پھر سنہری پر ایک نئی کیفیت طاری ہوئی، بقول افسانہ نگار: ’’رقت ختم ہوگئی، اک جنون اٹھا کہ کسی کی ہوجاؤں۔‘‘ ایک دن آپی نے پوچھا: ’’اب کیا حال ہے دھیئے؟‘‘ تو سنہری نے رو رو کر بتایا: ’’کہتے ہیں کسی ایک کی ہو جا۔‘‘ اور پھر قصہ آگے یوں بڑھتا ہے کہ ایک ادھیڑ عمر کا زمیندار سنہری کو مانگ لے جاتا ہے۔ اگلے دن اُس کا نکاح ہوگیا مگر نکاح کے کچھ ہی دنوں بعد زمیندار ختم ہوگیا۔ سنہری زمیندار کی حویلی میں اپنی سوت کے ساتھ رہتی ہے۔ سنہری چھوٹی چودھرانی کہی جاتی ہے اور پہلی بیوی کو گھر کے باہر کے لوگ بڑی چودھرانی کہتے ہیں۔ سنہری کو کھانے پینے پہننے رہنے کی کوئی تکلیف نہیں ہے۔ اُس کے شوہر کے گھر کے سبھی لوگ اُس کا خیال رکھتے ہیں مگر وہ تنہا ہے اور اُداس ہے، بقول افسانہ نگار:

’’چودھری کو مرے ہوئے تین مہینے ہوگئے تھے جب وہ یونہی حواس گم قیاس گم بیٹھی رہتی اور پھر ٹوٹتی رات سمے اُس کے کمرے سے گنگانے کی آواز آتی: خواجہ پیا موری لیجو خبریا۔‘‘

سنہری کی یہ کیفیت جاری ہی تھی کہ اُسے خبر ملی، گاؤں میں کچھ درویش آئے ہیں۔ پہلے تو اُس نے درویشوں کی آمد میں کچھ خاص دلچسپی نہیں لی مگر پٹواری سلام کر کے جانے لگا تو پتہ نہیں کیوں اُس نے سرسری طور پر پوچھا:

’’کہاں سے آئے ہیں؟‘‘

پٹواری بولا: ’’اجمیر شریف سے آئے ہیں، خواجہ غریب نواز کے فقیر ہیں۔‘‘

اتنا سنتے ہی سنہری کی جو کیفیت ہوئی وہ ممتاز مفتی کے الفاظ میں یوں ہے کہ: ’’ایک دھمکا ہوا، چھوٹی چودھرانی کی بوٹیاں ہوا میں ’اُچھلیں۔‘‘ اور پھر سنہری نہ جانے کس ناقابلِ

بیان کیفیت کے زیر اثر بعد مغرب چادر لپیٹ کر درویشوں کی قیام گاہ پر پہنچ گئی۔ درویشوں کے سفید ریش بوڑھے خادم نے بتایا کہ ''سائیں بادشاہ مغرب بعد کسی سے نہیں ملتے چھوٹی چودھرانی کہتی ہے: ''ہم سائیں بادشاہ سے ملنے نہیں آئے۔''

''تو پھر؟'' سفید ریش گھبرا گیا۔

''ایک سوال پوچھنا ہے۔'' چودھرانی نے کہا۔

''سائیں بابا! اِس سے سوال کا جواب نہیں دیں گے۔''

''سائیں بابا کو جواب نہیں دینا ہے، انھیں پوچھنا ہے۔''

''کس سے پوچھنا ہے؟''

''اس سے پوچھنا ہے جس کے وہ بالک ہیں... اُن سے پوچھو! ایک عورت تیرے دوار پر کھڑی پوچھ رہی ہے۔ ''غریب نواز بتا! میرا جیون کس کام آیا؟''

''تیرا جیون کس کام آیا ہے؟ تو پوچھتی ہے تیرا جیون کس کام آیا؟'' سفید ریش خادم کے ہونٹ لرزنے لگے... پھر ذرا رک کر بولا۔ ''میری طرف دیکھ سنہری بائی، میری طرف دیکھ کہ میرا جیون کس کام آیا، مجھے نہیں پہچانتی؟ میں تیرا سارنگی نواز تھا۔ دیکھ، میں کیا تھا کیا ہو گیا۔''

چھوٹی چودھرانی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ عین اُسی وقت ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک بھاری بھر کم نورانی چہرہ برآمد ہوا۔

''سنہری بی بی! وہ بولا، مجھ سے پوچھ تیرا جیون کس کام آیا''

چھوٹی چودھرانی نے مڑ کر دیکھا... ''ٹھاکر؟'' وہ چلائی۔

ٹھاکر بولا: ''اب ہمیں پتہ چلا کہ سرکار نے ہمیں ادھر آنے کا حکم کیوں دیا تھا۔''

ٹھاکر نے سنہری بی بی کے سامنے اپنا سر جھکا دیا: ''بی بی! ہمیں آشیرواد دے!''

اِس طرح یہ قصہ ایک طوائف کے کوائف بیان کرنے کے باوجود اپنی بُنت میں روحانی نظام کی اُس طاقت ور گرفت کا اشارہ یہ ہے جو اشخاص کو ان کی اپنی مرضی کے بغیر ایک صورتِ حال سے دوسری صورتِ حال میں کھینچ لے جاتی ہے۔ یہ جبریت دراصل وحدت الوجود کی عطا ہے جسے فی نفسہٖ نہیں بھی تو اُس کے مکمل عضویاتی نظام کے پس منظر میں '' مشترکہ ہندوستانی تصور'' ہی کہنا صائب ہے۔ وحدت الوجود کے مطابق ہمہ اوست۔ ہر جگہ وہ ہے۔ ذرے ذرے میں خدا ہے۔ جسم اور روح کثرت میں وحدت اور اُس وجود کی وحدت کے آئینہ دار ہیں۔ شیش محل میں ایک ہی قمقمہ روشن ہے مگر شیش محل کے ہر شیشے میں وہ روشن قمقمہ نظر آتا ہے، یوں کہ پھر پتہ ہی نہیں چلتا کہ نور کون ہے اور منور کون۔ لکڑی کو جلاؤ تو اُس میں سے شعلہ، دھواں، اور انگارہ تینوں عناصر نمایاں ہوں گے۔ لکڑی شعلہ نہیں ہے، شعلہ دھواں نہیں ہے، دھواں انگارہ نہیں ہے مگر تینوں آگ ہی کی تین شکلیں ہیں اور یہ آگ لکڑی میں سے نکلی ہے مگر آگ لکڑی نہیں ہے اور لکڑی آگ نہیں ہے، پھر بھی آگ اور لکڑی دونوں ایک دوسرے کا تتمہ ہیں۔ خواجہ غریب نواز یا دیگر اولیا خدا نہیں ہیں مگر ان کے وجود کی لکڑی میں الوہیت کی چنگاری کچھ یوں بھبھکی کہ وہ ایک چنگاری ولی کے پورے وجود کو روشن کر دیتی ہے۔ یہ تعمیرِ ذات کا سفر ہے جس میں ماڈل انگیز کرنے کا کام کرتا ہے۔ ٹھاکر کے من میں جو آگ لگی وہ ایسی تیز اور طاقت ور تھی کہ اُس نے ٹھاکر کو بھی جلایا اور سنہری کو بھی۔ یہ عشق کی ایک انوکھی اور نادر مثال ہے جس میں ٹھاکر خود بھی جلتا ہے اور سنہری کو بھی جلاتا ہے مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ٹھاکر سنہری کے لیے جلا، یا سنہری ٹھاکر کے لیے جلی۔ یہ دونوں دراصل ایک ہی معشوق

ممتاز مفتی کے الفاظ میں: ''آپی کی بیٹھک عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا منہ اٹھایا اور چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ھی ھے، وہ تو چلے گا ھی ھر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولتیے آتے تھے پر ایسے بد مزا ھو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے۔

(خواجہ) کی مرضی کے تحت صرف آلہ کار کا کام کر رہے ہیں۔ معشوقِ ذات کی ایک صورتِ حال کو دوسری صورتِ حال میں بدل دیتا ہے۔ یہ سارا زمزمہ عشق کا ہے اور یہ خالص ہندوستانی یا آریائی وراثت وثقافت کا حصہ ہے۔

پلاٹ کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ کہانی کا سارا فنی تانابانا اِسی مخصوص پس منظر کا آئینہ دار ہے۔ یہ پوری کہانی ایک طوائف سنہری کے گرد گھومتی ہے۔

سنہری آپی کے رشتے سے جانی جانے والی ایک نائکہ کے کوٹھے پر رہنے والی تین طوائفوں میں سے ایک طوائف ہے۔ یہ تینوں صرف ناچنے والی طوائفیں ہیں اور انھوں نے گانے بجانے کی باضابطہ تربیت حاصل کی ہے۔ کوٹھے پر گانا سننے اور رقص دیکھنے والے لوگ آیا ہی کرتے ہیں مگر اس کہانی کے پلاٹ میں اِس بات کا خاص دھیان رکھا گیا ہے کہ آپی کی بیٹھک عام طوائفوں کی بیٹھک نہ بن جائے۔ ممتاز مفتی کے الفاظ میں: ''آپی کی بیٹھک عام بیٹھک نہ تھی کہ جس کا جی چاہا منہ اٹھایا اور چلا آیا۔ بیٹھک پر دھن دولت کا زور تو چلتا ہی ہے، وہ تو چلے گا ہی ہر بیٹھک پر۔ پر آپی نے برتاؤ کا ایسا رنگ چلا رکھا تھا کہ خالی دھن دولت کا زور نہ چلتا تھا۔ نو دولتیے آتے تھے پر ایسے بدمزا ہو کر جاتے کہ پھر رخ نہ کرتے۔ آپی کی بیٹھک میں نگاہیں نہ چلتی تھیں۔ اُس نے ہمیں سمجھا رکھا تھا کہ ''لوگ نگاہوں پر اچھالیں گے تو پڑے اُچھالیں لڑکیو! تم نہ اچھلنا۔ جو نگاہوں پر اُچھل جاتی ہیں وہ منہ کے بل گرتی ہیں، اور جو گر گئی وہ سمجھو نظروں سے گر گئی۔'' آپی کی بیٹھک میں نظریں نہیں چلتی تھیں۔ کان لگے رہتے تھے، دل دھڑکتے تھے، وہاں ملاپ کا رنگ نہ ہوتا تھا، برہا کا ہوتا۔ رنگ رلیاں نہیں ہوتی تھیں۔ نہ وہاں تماشہ ہوتا تھا نہ تماش بین!''

اس بیٹھک میں ایک ٹھاکر آتا تھا۔ اوپر سے دیکھو تو ریچھ، طاقت سے بھرا اندر جھانکو تو بچہ، نرم نرم گرم گرم، ویسے تھا آن بھرا مان بھرا، سنگیت کا رسیا، یوں لگتا تھا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو، دھونی رمی ہو، آرتی سجی ہو۔ مگر اُس ٹھاکر کی بھی آپی کی بیٹھک میں نہ چلتی تھی۔ آپی سے کی ایسی پارکھ اور قائل تھی کہ ٹھاکر کی بنتی کا بھی اُس پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔

ممتاز مفتی ایک منظر دکھاتے ہیں:

''دفعتاً گھڑی نے تین بجائے۔ آپی ہاتھ جوڑے اٹھ بیٹھی، بولی، چھما کرو ٹھاکر جی، معافی مانگتی ہوں، ہمارا سمے بیت گیا، اب ختم کرو۔''

ٹھاکر پہلے تو چونکا پھر مسکایا: ''نہ آپی'' وہ بولا: ''ابھی تو رات بھیگی ہے۔''

آپی بولی: ''ٹھاکر ہم سوکھے پروں والے پنچھی ہیں۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو ہمارا سمے بیت جاتا ہے۔''

یہی ٹھاکر ایک دن آپی کے پاس آیا بولا: بائی کل خواجہ کا دن ہے، خواجہ کی نیاز سارے گاؤں کو کھلاؤں گا۔ آج رات خواجہ کی محفل ہوگی، اُدھر حویلی میں۔ صرف اپنے ہوں گے، گھر کے لوگ، تجھے لینے آیا ہوں۔'' شروع میں تو آپی راضی نہیں ہوتی، پھر ٹھاکر کی بنتی کے آگے نرم پڑ جاتی ہے۔ ساتھ میں سنہری بھی ہے، وہاں سے لوٹ کر سنہری کے اندر ٹوٹ پھوٹ مچی، اس کی تالیفِ قلب ہوگئی۔ وہ کسی بھی ایک کی ہونے کے لیے بے چین ہے۔ اِدھر غیب سے ایک ادھیڑ عمر کا چودھری بائی سے اُسے مانگنے آجاتا ہے۔ سنہری اُس سے نکاح

کرلیتی ہے اور پھر کچھ ہی دنوں بعد بیوہ ہوجاتی ہے۔ بیوہ ہونے کے کچھ دنوں بعد چودھری کے گاؤں میں اجمیر شریف سے کچھ درویش آتے ہیں، جو سنہری کے اِس سوال پر کہ ''میرا جیون کس کام آیا؟'' جب خود کو ظاہر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اُن میں ایک بائی کے کوٹھے کا سارنگی نواز ہے اور دوسرا وہی ٹھاکر، جس کے بارے میں افسانہ نگار نے شروع ہی میں بتایا تھا کہ ''یوں لگتا تھا جیسے بھیتر کوئی لگن لگی ہو، دھونی رمی ہو، آرتی سجی ہو۔''

پورا پلاٹ اِس بنیادی مرکزے پر ٹکا ہوا ہے کہ ہم سب کسی اَن دیکھی طاقت کے حصار میں ہیں۔ یہ ان دیکھی یا غیبی طاقت اپنے جوہر کے طور پر تو خدا یا وقت ہے مگر جب یہ جوہر مادے میں اپنا اظہار کرتا ہے تو ان برگزیدہ انسانوں کی روحانی طاقت کا استعارہ بن جاتا ہے۔ جو بظاہر ختم ہو چکے ہیں مگر اس پلاٹ کے مذکورہ بالا بنیادی مرکزے کی سب سے طاقت ور فریکوئنسی عشق ہے جو اِس پوری کہانی میں سارے کا سارا اس رچتی ہے۔ حالانکہ کہانی ایک بائی کی شخصی انا سے اپنا سفر شروع کرتی ہے جو اپنے کوٹھے پر رہنے والی طوائفوں کو جب نہ تب سبق پڑھاتی رہتی ہے:

(الف) تیرا کام دیکھنا نہیں دِکھنا ہے۔ تو نظر نہ بن منظر بن۔

(ب) ہمارا سمے وہ ہے جب جھاگ اُٹھے۔ ہم میں نہیں، دوجے میں جھاگ اٹھانا، یہی ہمارا کام ہے، خود شانت، دوجا بلبلہ ہی بلبلہ۔

(ج) آپی کی بیٹھک میں نظریں نہیں چلتی تھیں، کان لگے رہتے تھے، دل دھڑکتے تھے۔

(د) یہ جو دھندا ہمارا ہے، اُس (رب) کے سمے میں نہیں چل سکتا۔ اُس کے سمے میں پاؤں نہ دھرنا، اس نے برا مانا تو ماری جاؤ گی، جو وہ راضی ہوا تو بھی ماری جاؤ گی، اور دیکھو اس کے سمے کے نیڑے نیڑے (آس پاس) بھی ایسا گیت نہ گانا جو اُسے پکارے۔ بھجن نہ چھیڑنا، کہیں وہ تمھاری پکار سن کر ہنکارا نہ بھر دے۔

مذکورہ بالا اقتباسات جہاں بائی کے اَنا پسند ہونے کے گواہ ہیں، وہیں اس کے 'عشق آگاہ' ہونے کی چغلی بھی کھا رہے ہیں اور باوجودیکہ بائی کے ذکر میں ممتاز مفتی نے اختصار کو راہ دی ہے پھر بھی کہانی میں بائی عشق سے خوف زدہ نظر آتی ہے اور کوئے ملامت سے بار بار کنّی کاٹ جاتی ہے مگر وہ خود بھی چوٹ کھائی ہوئی ہرنی ہے اِس کا اندازہ تو سنہری کے ساتھ اس کے سلوک سے ہی ہوجاتا ہے۔

بہر حال اِس کہانی کے پلاٹ میں عشق تیار ملبوس میں موجود دھاگے کی طرح بنت کا رگ و ریشہ قرار دیا جاسکتا ہے مگر دلچسپ پہلو اس کہانی کا یہ ہے کہ یہ عشق مادی ہوکر بھی غیر مادی ہے کیوں کہ یہاں محسوس و موجود کا عشق ناموجود ہے اور اِس عشق بلاخیز کے سیل میں مرد عورت سبھی بہے جاتے ہیں۔

ماحول کا معاملہ بھی تقریباً حسبِ سابق ہے۔ ماحول کے ذکر میں جو چیز سب سے پہلے متوجہ کرتی ہے وہ بائی کا کوٹھا ہے۔ ظاہر ہے کہ طوائف ہو یا اُس کا کوٹھا، اِس کا کوئی تعلق ممتاز مفتی کے وطن مملکتِ خداداد پاکستان سے نہیں جوڑا جاسکتا کیونکہ اسلام میں نہ تو طوائف کی کوئی گنجائش ہے نہ نرتکی کا کوئی تصور ہے اور نہ ہی ناچ کی کوئی اجازت ہے۔ پاکستان جس نظریے کی بنیاد پر وجود میں آیا ہے اس کے مطابق یہ پورا ادارہ گناہ کا آتش فشاں ہے۔ یہ خالص ہندوستانی یا قدرے مخصوص انداز میں کہا جائے تو غیر اسلامی ردیہ ہے۔ ناچ کا کوئی جواز کم از کم اسلام میں نہیں ہے، اور گانا بھی منع ہے۔ اگر خوش الحانی کی اجازت کی انگلی پکڑ کر بغیر مزامیر کے حمدیہ اور نعتیہ کلام کے بہانے صوفیانہ کلام کے مباح ہونے کی بات کہی گئی اور اِس پر کچھ علما خموش رہے] حالاں کہ بہتوں نے اِس کے خلاف بھی فتویٰ دیا] تو بھی گانے کی مذکورہ صورت کے مباح ہونے کا یہ مطلب قطعی نہیں کہ بائی کے کوٹھے پر گانے کی کوئی گنجائش کہیں بھی موجود ہے۔ اسلامی تعلیمات سے اوسط درجے کی واقفیت رکھنے والا یہ بھی مطلب نکالنے کے لیے تیار نہیں ہوگا کہ خواجہ کے دن پر گھروں میں طوائفیں گانا گائیں۔ لہٰذا طوائف اور گانا، اِس کہانی کے دو عناصر اپنے پس منظر میں خالص ہندوستانی ہیں۔

کرداروں کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ ہے، بائی روپا، پیلی، سنہری، ٹھاکر، چودھری بڑی چودھرانی، چھوٹی چودھرانی، ہر کردار اپنے نام ہی سے اپنی ہندوستانیت کی تصدیق کراتا نظر آتا ہے۔

لفظیات و جزئیات کا حال بھی یکساں ہے۔ سمے سمے کی بات، پنڈے کی جھال، رس، کھٹالی، بالپن، سرتال بھری بیٹھک، پالنا، دھیے، جس کا کام اُسی کو ساجھے، گھونگٹ، گھنشیام، جھاگ، شانت، دھیرج، ٹھمک، جھنکار، پایل، بیرن، بھیتر، جگ بیتی، چھلنی، آن، مان، چھب، سندرتا، ٹھیار رسد، مورتی سمان، سرہی سر، شُدھ سر، سرتیاں، سمرتیاں، جوگ، جوگی، برہا، ملاپ، سنگیت کا رسیا، دھونی رمی، آرتی سجی، بھیتر کا پٹ کھولنا، من کا جھولنا، سدھ بدھ، جیون، گانٹھری میں کون جتن کر کھولوں، مورے پیا کے جیا میں پڑی رہی، شما، پنچھی، اڈاری، گورکھ دھندا، بھجن، ہنکاری، خواجہ کا دن، خواجہ کی نیاز، خواجہ کی محفل، خواجہ کی بات، منڈی، مکھ، ٹولی، بھجن منڈی، خواجہ میں تو آن کھڑی تورے دوار، غریب نواز، منگتا، دیالو، نیڑے، خواجہ پیا موری رنگ دے چنریا، ایسی بھی رنگ دے رنگ نہ چھوٹے، دھوبیان دھوئے جائے ساری عمریا، رنگ پچکاری، رنگ گھاٹ، چت نہ لگنا، طبلہ، گھنگھرو، جھومر، ناچ، حال کھیلنا، پتّر، بندھن، دے، الاپ، گھاٹ، حقہ، حقے کا سوٹا، خواجہ پیا موری لیجیو خبریا، سارنگی نواز، چرن چھونا، اشیرواد، اشیرواد مانگنا وغیرہ وغیرہ۔

پوری کہانی گنگا جمنی تہذیب کی مشترکہ وراثت کی وارث نظر آتی ہے، ہندوستانی لفظیات و جزئیات سے اٹی پڑی، کہانی پڑھتے ہوئے ایک منٹ کے لیے بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ کہانی کسی پاکستانی افسانہ نگار نے لکھی ہے۔ اس کہانی کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنی بُنت میں سیاست کے فرضی، گندے اور بھیانک بٹوارے کی نفی کرتی ہے۔

اور ممتاز مفتی کی اِس ایک کہانی پر بات ختم نہیں ہے۔ اُن کی متعدد دوسری کہانیاں مثلاً 'اپسرا حویلی'، 'روغنی پتلے'، 'گڑیا گھر'، 'شام نواس'، 'آپا'، 'حادثہ'، 'ان کہی' وغیرہ مفتی کے درجنوں افسانے پڑھ جایئے، آپ کا یہ احساس قوی ہوتا جائے گا کہ ممتاز مفتی بنیادی طور پر اسی ہندوستانی تہذیب کے نمائندے ہیں جو 1947 سے پہلے اور آج کے پاکستان اور بنگلہ دیش کی بنیادی تہذیب ہے۔ وقت کے سیلاب نے چاہے اُس کے خزانے بہا دیے ہوں مگر سیاسی پیوندکاری کے باوجود تہذیبی ہمہ گیری کا محمل آج بھی جاری ہے—!!

■

Hussain Ul Haque, Sir Syed Colony,
New Karimganj, Gaya - 823001 (Bihar)

شمیم ارشاد اعظمی

منفعت سے بھرپور پھلوں اور سبزیوں کے رنگ

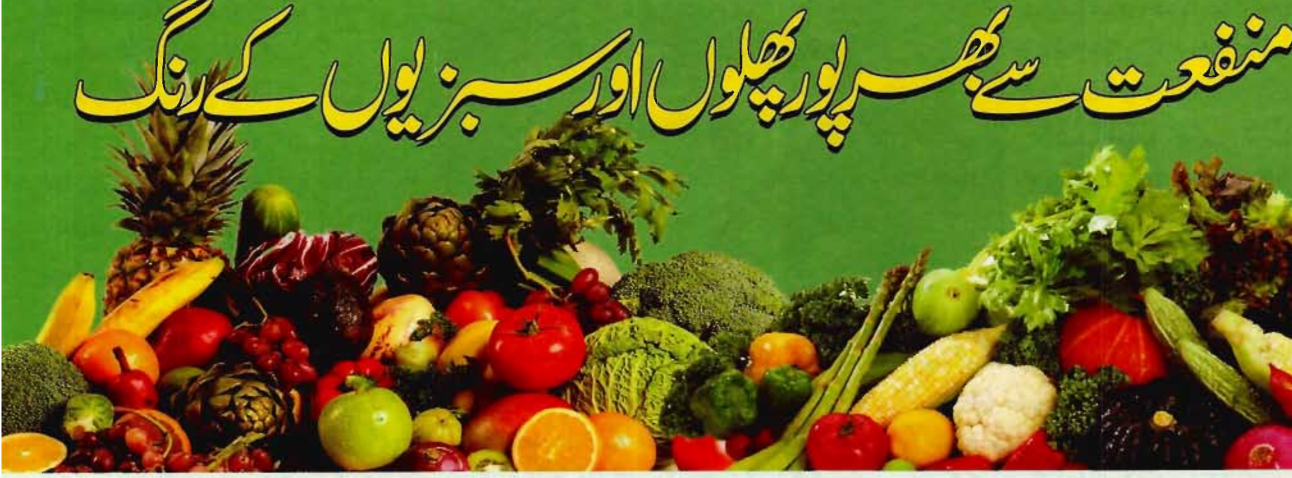

ظاہری دنیا میں خوشنما اور دلکش رنگوں کی اہمیت وافادیت ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ یہ سرسبز وشاداب وادیاں، تالاب میں خوبصورت نیلوفر کا وجود، کھیتوں میں نیلے، پیلے اور لال رنگوں کا لامتناہی سلسلہ، گلستان میں عطر بیزی کرتے رنگ برنگے خوشنما پھول جہاں ایک طرف مشام جاں کو معطر کرکے فرحت وانبساط کا ساماں پیدا کرتے ہیں وہیں یہ گل خوش رنگ ہماری آنکھوں کو جلا بخشتے ہیں۔ اسی طرح ہماری روزمرہ کی غذاؤں میں استعمال ہونے والی سبزیاں اور مختلف رنگوں کے شیریں ولذیذ پھل بھی اپنے رنگارنگ فوائد کے اعتبار سے کافی اہم ہیں۔ ہری بھری تازہ سبزیاں اور خوش ذائقہ اثمار جہاں اپنے متنوع رنگ کی وجہ سے ہمارے لیے باعث کشش ہیں وہیں ان میں موجود اجزائے لونیہ (color pigment)، معدنیات ودیگر صحت بخش اجزا نہ یہ کہ صرف ہماری اچھی صحت کے ضامن ہیں بلکہ یہ ہمارے بدن میں قوت ومناعت کا اضافہ کرکے بیماری کے ازالے کا سبب بھی ہوتے ہیں۔ ان سبزیوں اور پھلوں میں کچھ ایسے خاص اور موثر اجزا پائے جاتے ہیں جس میں غذائیت کے ساتھ ساتھ مرض سے مقابلے کی بھرپور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔ ذیل کی سطروں میں انہی موثر اجزا کی طبی اہمیت وافادیت کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

غذائی نباتات کے رنگین سالمات میں 2ہزار سے زائد پگمنٹ پائے جاتے ہیں جن میں سرخ، سبز، سیاہ، سفید، زرد، آسمانی، نارنجی، کتھئی، ارغوانی (purple) اور خاکی قابل ذکر ہیں۔ مختلف رنگوں کی حامل سبزیوں اور پھلوں میں مختلف قسم کے اجزائے موثرہ active chemical constituent پائے جاتے ہیں، جو مغذی اور مانع تکسید (Antioxidant) ہونے کے ساتھ ساتھ تریاقی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔ مجموعی طور سے ان میں درج ذیل افعال وخواص موجود ہوتے ہیں۔

- یہ امراض قلب اور سرطان سے تحفظ فراہم کرتے ہیں۔
- عمر طویل کرتے ہیں یعنی یہ Antiaging ہوتے ہیں۔
- دماغ اور مناعتی نظام کو قوی بناتے ہیں۔
- ضغط الدم قوی، امراض ریوی جیسے دمہ وغیرہ کو کم کرتے ہیں۔
- فالج، موتیابند، قبض، امراض نظام بول (Urinary Tract Infection)، ذیابیطس، عطفیت (Diverticulation)، موٹاپا، اور جلدی شکن کے خطرات کو کم کرتے ہیں۔
- یہ حصاۃ مثانہ کی افزائش کو بھی کم کرتے ہیں۔

سرخ رنگ

سرخ رنگ کی حامل سبزیوں اور پھلوں میں اینٹوسیانن (Antocyanin)، کیروٹینائیڈس (Carotenoids)، لیکوپن (Lycopin)، بیٹا کیروٹین (Beta Carotene)، حیاتین ج (Vit C)، الیجک ایسڈ (Ellagic Acid) جیسے اجزاء موجود ہوتے ہیں جو آلو بخارا، امرود، انار، انگور، بیر، سیب، کشمش، تربوز، فرنگی توت، ٹماٹر، چقندر، حرفہ، سرخ لوبیا، سرخ مکوء، گاجر، سرخ مولی، شلجم، سرخ مرچ اور کرم کلہ وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

کیروٹینائیدس

یہ ہمارے قلب کو صحتمند رکھتا ہے، حافظے کو قوی بناتا ہے اور کینسر کے وقوع کو روکتا ہے۔

بیٹا کیروٹین

یہ ایک طرح کا مانع تکسید (Antioxidant) ہے جو ہماری آنکھوں کی روشنی کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے نیز یہ قلبی عروقی امراض سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

لیکوپن

یہ ایک سرخ رنگ کا پگمنٹ ہے جو ٹماٹر اور اس کے مرکبات، امرود، تربوز اور چکوترے میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک قوی مانع تکسید ہے جو غدہ قدامیہ (Prostate Gland)، قولون اور دیگر سرطان کے خطرات سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کولیسٹرول (LDL) کی سطح کو کم کرتے ہیں اور صالح کولیسٹرول (HDL) کے لیول کو بڑھاتا ہے۔ یہ دمہ اور ایڈز سے بھی ہمیں محفوظ رکھتے ہیں۔ لیکوپن کچے ٹماٹر کی بہ نسبت پکے ہوئے ٹماٹر میں زیادہ مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔

اینتھوسیانن

یہ سرخ سیب کے چھلکوں، سرخ مولی، چیری اور چقندر میں پائے جاتے ہیں۔ یہ امراض قلب کے خطرات سے محفوظ رکھتے ہیں۔ عروق دموی کو لچکدار بنائے رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ہمیں کینسر سے بچاتے ہیں اور امتلائی کیفیت کو کم کرتے ہیں۔

الیجک ایسڈ

یہ بیری اور انار میں پائے جاتے ہیں۔ یہ تمباکونوشی کرنے والوں میں وقوع کینسر کو کم کرتے ہیں اور غذا کے عمل ہاضمہ میں معاون ہوتے ہیں۔

زرد یا نارنگی رنگ

اس طرح کے رنگ قلب، نظر اور مناعتی نظام کے محافظ ہوتے ہیں نیز ان سے کینسر کے خطرات بھی کم پیش آتے ہیں۔ اس گروپ کی سبزیوں اور پھل میں حیاتین ج اور فولک ایسڈ (Folic acid) کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں بھی سرخ رنگوں کی طرح کیروٹینائڈس پائے جاتے ہیں جس کی چھ سو سے زائد اقسام ہیں۔ یہ جلد اور مخاطی جھلی (mucus

(membrane) کو امراض سے محفوظ رکھتے ہیں نیز فالج اور اندھے پن کے خطرات سے بھی ہمیں محفوظ رکھتے ہیں۔مناعتی نظام کو مستحکم بناتے ہیں۔زرد مرچ اور مکئی میں لیوٹن (Lutin) کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔یہ ہماری آنکھ کی روشنی کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔اس کے علاوہ اس گروپ کی سبزیوں اور پھلوں میں حیاتین ج، کیروٹینائیڈس، بایوفلونائیڈس (Bioflavonoids) بیٹا کیروٹین پائے جاتے ہیں جو ہمارے جسم کو مختلف امراض سے تحفظ فراہم کرکے صحت مند رکھتے ہیں۔ان میں موجود وٹامن بی کمپلکس اور کیروٹین ہمارے جسم کے مناعتی نظام کو بڑھاتے ہیں۔نظر کو جلا بخشتے ہیں اور جلد کو ملائم اور شگفتہ رکھتے ہیں۔بیٹا کیروٹین جو ہمارے جسم کو صحتمند بنائے رکھنے میں مدد ومعاون ہیں یہ بالخصوص گاجر، آم، خربوزہ، کدو اور آلو میں پائے جاتے ہیں۔جبکہ Cryptoxanthin سنترہ میں پایا جاتا ہے۔

اس گروپ کی سبزیوں اور پھلوں میں گاجر، پپیتہ، شفتالو، اناناس، آم، سنترہ، لیموں، خوبانی، مکئی، کدو اور چکوترہ قابل ذکر ہیں۔

سبز رنگ

ہری سبزیوں اور پھلوں میں کلوروفل ایک اہم پگمنٹ ہے، جو دراصل بیٹا کیروٹین، فلونائیڈس اور کچھ نباتات کیمیائی (Phytochemicals)، جیسے لیوٹن (Lutein) اور انڈولس (Indoles) کا خزانہ ہے۔ان کے علاوہ ان سبزیوں میں میگنیشیم، پوٹیشیم، آہن، وٹامن سی، اور ربیو فلاوون (Riboflavin) موجود ہوتے ہیں۔

ہری سبزیاں اور پھل کینسر کے خطرات کو کم کرتے ہیں۔اسی طرح یہ قلب کے امراض کو بھی واقع ہونے سے روکتے ہیں۔اس کے علاوہ یہ ہماری آنکھوں کی صحت کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔خلقی نقائص سے محفوظ رکھتے ہیں۔ہڈیوں اور دانتوں کو محفوظ رکھتے ہیں۔

اسی طرح کچھ ذائقے دار سبزیاں جیسے Bokchy, Brussels sprouts,B r c o o l i میں، Sulforaphane,Isothiocyanate اور Indoles جیسے موثر اجزا موجود ہوتے ہیں جن کے اندر امراض سے نبرد آزما ہونے کی بھرپور صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

گلوٹوتھیون

یہ ایک طرح کا اینٹی آکسیڈنٹ ہے جو پالک، مارچوبہ (Asparagus) اور Broccoli میں پایا جاتا ہے۔یہ مناعتی نظام کو مضبوط کرتا ہے۔

فولک ایسڈ

یہ بالعموم گہرے رنگ کی سبزیوں میں پایا جاتا ہے۔یہ قلبی امراض کے وقوع کو کم کرتا ہے اور خلقی نقائص کو مانع ہے۔اسی طرح سبزیوں میں موجود آہن، وٹامن ک، میگنیشیم، کیلشیم،

ہماری ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط کرتے ہیں۔

انڈولس

یہ پستان کے کینسر بالخصوص جو اسٹروجن کے استعمال سے پیدا ہوتے ہیں، کو کم کرتے ہیں۔یہ کچھ ایسے انزائم پیدا کرتے ہیں جو مادہ سرطان کی تعدیل کرتے ہیں۔اس گروپ کی سبزیوں میں سرسوں کا ساگ، بتھوا، ہاتھی چک (Artichokes)، کرم کلہ، یارو (Leeks)، بھنڈی، کاہور، مٹر، پالک، شلجم سلاد آبی (Watercress)، کرفس بستانی، وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

آسمانی

آسمانی رنگ کی سبزیوں اور پھلوں کے ساتھ ساتھ سیاہ اور ارغوانی سبزیوں اور پھلوں کا تذکرہ ایک ساتھ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بلحاظ رنگ یہ ایک دوسرے کے کافی قریب ہیں۔اس گروپ میں بیگن، نیل بیری، شہتوت، آلو بخارا، سیاہ انگور، انجیر ارغوانی، ارغوانی ٹماٹر، بند گوبھی قابل ذکر ہیں۔ان سبزیوں اور پھلوں میں اینتھو سیانن (Anthcyanin) اور کچھ خوشبودار اجزاء موثرہ پائے جاتے ہیں جو ہمارے اندر کینسر کے خطرات کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ ہماری ذہنی قوت کے محافظ ہوتے ہیں نیز عمر کو طویل کرتے ہیں۔

اینتھوسیانن

یہ بائل بیری اور نیل بیری میں زیادہ پایا جاتا ہے۔کچھ ایسے ہی دیگر پگمنٹ پالک اور گہرے رنگ کے پھلوں میں

پائے جاتے ہیں جو عمر کے ساتھ کم ہوتی یادداشت کو برقرار رکھنے میں مدد کرتے ہیں۔اینتھو سیانن بالخصوص محلل اورام (Antiinflamatory) صفت کے حامل ہوتے ہیں نیز یہ کینسر سے ہمارے جسم کو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔یہ عروق دموی کی اندرونی سطح کو صحت مند رکھتے ہیں جس کی وجہ سے یہ مانع امراض قلب ہیں۔

سفید رنگ

اس گروپ میں سفید، کتھئی اور خاکی سبزیاں اور پھل شامل ہیں۔اس میں کچھ خاص قسم کے پگمنٹ پائے جاتے ہیں۔یہ ہمارے قلب کو اصلی حالت میں رکھتے ہیں اور کینسر کے خطرات کو کم کرتے ہیں۔اس گروپ کی سبزیوں اور پھلوں میں کیلا، کھجور، سفید گاجر، جامن، ادرک، لہسن، چنا، مونگ پھلی، گانٹھ گوبھی، شلجم، مکئی، مسور وغیرہ قابل ذکر ہیں جن میں فولک ایسڈ، پوٹیشیم، سلینیم اور وٹامن سی جیسے کارآمد اور نفع بخش اجزا پائے جاتے ہیں۔

سفید گاجر میں پولی اسیٹالن (polyacetalenes) پایا جاتا ہے۔سیب، ناشپاتی اور پیاز میں قوی قسم کے پولی فینولس (polyphenols) پائے جاتے ہیں جس میں قیورسٹن (qurciten) کا پگمنٹ قابل ذکر ہے جو بالخصوص قلبی امراض کے خطرات کو کم کرتا ہے نیز یہ مانع سرطان اوصاف کے حامل ہوتے ہیں۔

الیسن

یہ ادرک اور پیاز کے خاندان (family) کی سبزیوں میں پایا جاتا ہے۔یہ خلیات سرطان کو ختم کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

سیپونن

یہ ادرک اور پیاز میں پایا جاتا ہے، مناعتی نظام کے اندر تحریک پیدا کرتا ہے اور اجزا شحمیہ کو بدن سے کم کرتا ہے۔ناشپاتی اور مشروم میں کچھ اینٹی آکسیڈنٹ پائے جاتے ہیں جو اغشیہ خلیات کی حفاظت کرتے ہیں۔

جینسٹن

یہ سویا کے مرکبات میں موجود ہوتا ہے، جو پستان کے کینسر سے محفوظ رکھتا ہے۔

آئیسوفلیون

یہ خشک بین، مونگ پھلی، مسور اور سویا میں پایا جاتا ہے۔یہ امراض قلب کے خطرات کو کم کرنے کے ساتھ ساتھ قولون، معدہ اور پروسٹیٹ کے کینسر کے خطرات میں تخفیف پیدا کرتا ہے۔

Shamim Irshad Azmi, Lecturer
Dept of Ilmul Advia, National Institute of Unani Medicine, Kottigepalya, Magadi Main Road, Bangalore - 560091 (Karnataka)

بجلی بچانے کے آسان اور مفید طریقے

- بہت زیادہ چمکیلے بلب کی جگہ بجلی بچانے والے CFLs اور LEDs استعمال کریں۔
- ضرورت نہ ہو تو پنکھوں اور لائٹ کو بند کر دیں۔
- سبھی الیکٹرانک سامان جیسے ٹی وی، سیٹ ٹاپ باکس، ڈی وی ڈی پلیر اور مائکروویو اوون کو بند کر دیں، کیونکہ اسٹینڈ بائی موڈ میں بھی کئی واٹ بجلی خرچ ہوتی ہے۔
- استعمال میں نہ ہوں تو کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کو شٹ ڈاؤن کر دیں۔
- اس بات کو یقینی بنائیں کہ ریفریجریٹر کے دروازے کی سیل ائر ٹائٹ ہو۔
- ایئر کنڈیشنر کا درجہ حرارت 25-26°c پر رکھیں۔ ایسے میں ایئر کنڈیشنر کے ساتھ چھت کے پنکھے کا استعمال بہتر ہوگا۔
- ایئر کنڈیشنر کے درجہ حرارت میں فی ڈگری کے اضافے سے 3-5% تک بجلی بچائی جا سکتی ہے۔
- ایئر کنڈیشنر کے فلٹروں کی پابندی سے صفائی کرتے رہیں۔
- صرف BEE معرکہ والی اشیا اور اوزار ہی خریدیں۔

وزارت توانائی
حکومت ہند

ENERGY IS LIFE
BEE
CONSERVE IT

بیورو آف انرجی ایفی سینسی (BEE)
(وزارت توانائی، حکومت ہند)
چوتھی منزل، سیوا بھون، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 11006
Website: www.bee-india.nic.in

davp 34106/13/0011/1415

بجلی بچائیں پیسے بچائیں

تبصرہ و تعارف

تعلیمی تشکیل نو کے مسائل

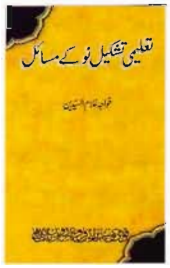

مصنف: خواجہ غلام السیدین
صفحات: 307 قیمت: 105 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر شریف الدین صدر شعبۂ اردو
رتن سین ڈگری کالج، بانسی، گورکھپور یونیورسٹی گورکھپور

خواجہ غلام السیدین کثیر الجہات وجامع شخصیت کے مالک تھے۔

سیدین صاحب کی اہم کتابوں میں ایک مختصر کتاب 'روح تہذیب' ہے جو ایک توسیعی لکچر ہے 'اصول تعلیم' نے بہت شہرت حاصل کی۔ 'آندھی میں چراغ'، 'فکر انسانی کا ارتقا' اہم کتابیں ہیں۔ 'دنیا میرا گاؤں' سفر نامہ ہے 'مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں'، 'افکار سیدین'، 'مضامین سیدین'، 'سخن دلنواز'، خطوط کا مجموعہ 'بزم یاراں' اور (مشاہیر کے خطوط سیدین کے نام) وہ شاہکار و اہم کتابیں ہیں جو ان کے انتقال کے بعد سیدین میموریل ٹرسٹ نے شائع کرائیں۔

زیر تبصرہ کتاب "تعلیمی تشکیل نو کے مسائل' تعلیم سے متعلق مختلف النوع مضامین اور ابواب پر مشتمل ایک حسین گلدستہ ہے اور موضوع کے اعتبار سے اعلیٰ معیار کا عمدہ نمونہ ہونے کے ساتھ ہی ماہر تعلیم، دانشور اور تحقیقی وتنقیدی ذہن رکھنے والے باشعور طلبا، اسکالر اور اساتذہ اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ مصنف نے جو بھی عنوان باندھا ہے۔ اس سے متعلق اپنے فکر ونظر وعمل کو حسین جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ تعلیم کے موضوع پر جامع گفتگو کرتے ہوئے سیدین نے اس کے جملہ متعلقات۔ مجموعی خدوخال اور فکر وفن ومسائل پر ناقدانہ بحث کی ہے۔ 307 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل اکیس ابواب ہیں۔ آخر میں ضمیمہ بھی پیش خدمت ہے۔

مصنف نے جیسا کہ کتاب کے نام سے واضح ہوتا ہے "تعلیمی تشکیل نو کے مسائل' کے فنی وفکری ابعاد کا بے حد خوبصورت، دلچسپ، معلوماتی، سادہ، سلیس، عام فہم، شستہ، بیانیہ، فصیح اور مبسوط ومربوط ومرکوز انداز میں پیش کیا ہے اور طرز ادا واسلوب کی شگفتگی نے کتاب کے وزن و وقار اور معیار میں اضافہ کیا ہے۔

بحیثیت مجموعی سارے ابواب ومضامین ادب کا شہ پارہ محسوس ہوتے ہیں لیکن کچھ ابواب بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جیسے 'اسکول ایک تخلیقی ماحول'، "تعلیم برائے مسرت'، 'بیسک تعلیم کی دین'، 'ثانوی تعلیم کی تشکیل جدید'، 'قومی زندگی میں سماجی تعلیم کا مقام'، سماج میں معلم کی حیثیت' اور "تعلیمی نشاۃ الثانیہ اور معلم کا فرض' وغیرہ معلومات سے پر ہے۔ اور یہ (خ غ سیدین) کے علمی، ادبی، تنقیدی نگارشات، وسیع مطالعے اور گہرے تفکر کا نتیجہ ہے۔ تعلیم کے موضوع پر یہ پہلی باضابطہ کتاب ہے جو نہایت عرق ریزی، جدوجہد اور باریک بینی سے تعلیم کے مختلف النوع زاویے کو اجاگر کرتی ہے۔ یہ کتاب اگرچہ اصلاً معلمین کے لیے لکھی گئی مگر ان تمام لوگوں کے لیے ہے، جو تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ مصنف نے خاصی نظر ثانی کے باوجود "مستقبل کا مدرسہ' کا پہلا حصہ کسی بنیادی تبدیلی کے بغیر باقی رکھا ہے جن کی روشنی میں ہم قومی نصب العین اور ترقی پسندانہ تعلیمی افکار کے مطابق اپنے اسکولوں کی تشکیل کر سکتے ہیں۔ دوسرے حصے میں 'نئے رجحانات اور طرزِ فکر' کے عام عنوان کے تحت پرائمری اور دیہی تعلیم، بیسک تعلیم، ثانوی اور سماجی تعلیم کے مختلف مسائل سے بحث کی ہے۔

مصنف نے معلم کے لیے تین مشکل شرطیں لگائی ہیں کہ معلم کو لازماً بافراست، باضمیر اور اپنے پیشے کی طرف سے مطمئن ہونا چاہیے۔ ابتدائی حصے میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اسکول کے ماحول کی جدید تشکیل کس طرح کی جائے کہ بچوں کی انفرادی خصوصیات کو غذا اور قوت نصیب ہو۔ دوسرے حصے میں اعلیٰ معیاری تعلیم کے مختلف اہم پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے جس میں معلمین کی تربیت وٹریننگ کے بعض مسائل بھی شامل ہیں۔ مصنف نے بچے کی انفرادیت کی تخلیقی تربیت وتعلیم کے مختلف جہات کے سلسلے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

مختصراً یہ کتاب علمی میدان میں نہایت ہی اہم اضافہ ہے اور ادبی حلقوں میں اس کی خوب پزیرائی ہوگی۔ اس کتاب کے ذریعے خ غ سیدین جیسی ممتاز شخصیت کی علمی، ادبی، فکری اور تحقیقی تحریروں سے آشنائی ہوسکے گی۔ کتاب کی جملہ خصوصیات اور اس کے معیار کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ اردو شائقین کے لیے مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ یہ قاری کی معلومات میں نہ صرف اضافہ کرے گی بلکہ تنوع بھی پیدا کرے گی اور باذوق قارئین سے ستائش ومبارکباد حاصل کرنے میں کامیاب رہے گی۔

اردو لسانیات

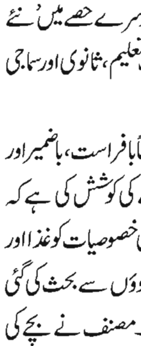

مصنف: علی رفاد فتیحی، سنہ اشاعت: 2013
صفحات: 252، قیمت: 98 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: محمد مقیم، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

علی رفاد فتیحی کی زیر تبصرہ کتاب 'اردو لسانیات' کو مصنف کی جدت طبع نے ماقبل کی تمام کتابوں سے ممتاز اور منفرد معنویت عطا کی ہے۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ پروفیسر علی رفاد فتیحی کی کتاب 'اردو لسانیات' جملہ لسانیاتی مباحث کا اجتماع ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب اجمال کے باوجود تفصیل اور جامعیت سے مزین ہے۔ کتاب میں کل 13 ابواب ہیں۔

علم صوتیات، اصول فونیمیات، اردو فونیمیات، اردو حروف تہجی، اردو صرف، اردو نحو، اردو معنیات، ہندوستان کا لسانی پس منظر، ہندوستان کی لسانی تہذیبیں، ہند آریائی زبان کی لسانی خصوصیات، زبان اردو، اردو کے آغاز وارتقا کے نظریے: ایک تنقیدی جائزہ، دکنی اردو۔ مسائل کو آسانی سے ذہن نشین کرنے کے لیے بالخصوص طلبا کی خاطر مصنف نے اس بات کا خصوصی التزام کیا ہے کہ ہر باب کے آخر میں باب کا خلاصہ بھی پیش کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں مصنف

نے خود لکھا ہے کہ باب ایک سے سات تک اردو زبان اور اس کے صوتی، صرفی، نحوی اور معنیاتی متعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ باب آٹھ سے تیرہ تک اردو زبان کی تاریخ اور اس کے لسانی رشتے کا جائزہ لیا گیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کے ابتدائی تین ابواب انتہائی کارآمد اور مفید ہیں۔ علم صوتیات اور علم فونیمیات (اصوات) میں لفظی مشابہت کے باوجود مصنف نے علم کی ان شاخوں کے درمیان فرق کو بڑی آسانی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

اس فرق سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ صوتیات کا تعلق زبان کی تقریری شکل سے ہے اور اصوات کا تعلق تحریری شکل سے یعنی علم کی اس شاخ کا مقصد کسی مخصوص زبان میں استعمال ہونے والی ایسی امتیازی اصوات کی شناخت کا تعین ہے جن کے استعمال کی وجہ سے معنی میں تغیر پیدا ہوتا ہے۔ پانچویں باب میں ایک ذیلی عنوان ہے 'اردوانے کا عمل' اس عنوان کے تحت دیگر زبانوں کے چند ایسے الفاظ درج کیے گئے ہیں جن کی تارید کی گئی ہے۔ اس کے بعد 'تراکیب لفظی' کا ذیلی عنوان ہے جس کے تحت تراکیب لفظی کی مختلف صورتوں جمع الفاظ، مرکب عطفی، مرکب اضافی، مرکب بالہمزہ، مرکب یائے مہموز، مخلوط اشتقاقی وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 'تراکیب لفظی' اور اس کی مختلف صورتوں کا درج کی گئی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مباحث ماقبل کے عنوان سے پیوست ہیں اور 'اردوانے کا عمل' تراکیب لفظی کی مختلف صورتوں کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ ساتویں باب 'اردو معنیات' میں جنگجو، انتہا پسند، دہشت پسند، عسکریت پسند، مجاہد وغیرہ الفاظ کو انگریزی لفظ Militant کے مترادفات کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

''بہر صورت اس وقت اس زبان کو ہندوی، ہندستانی، ریختہ، دکنی اور گجراتی کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔''

''شہنشاہ شاہ جہاں نے نئی دلی آباد کر کے شاہی قلعے کو 'قلعہ معلیٰ' کے نام سے موسوم کیا تو عربی، فارسی، ہندی وغیرہ سے ملی جلی زبان کو جس کا رواج شاہی لشکر میں ہوگیا تھا، ''اردوے معلیٰ'' کا نام دیا۔''

''یہ لفظ]ریختہ[اردو ادب میں عہد غالب تک استعمال ہوتا رہا ہے لیکن اس کا اطلاق اردو نثر پر کبھی نہیں ہوا۔''

''وہ]روشن علی[اس عہد کے دیگر مرثیہ نگاروں کی طرح اپنی زبان کو ریختہ یا زبان ریختہ نہیں لکھتا۔''

ان بیانات میں کئی باتیں محل نظر ہیں۔ مثلاً اردو کے معنی لشکر یا فوج، زبانِ اردوے معلیٰ سے موجودہ اردو زبان یا ہندی یا ہندوی زبان مراد لینا بالخصوص عہد شاہجہانی و خان آرزو وغیرہ کے عہد میں۔ خان آرزو وغیرہ کے عہد میں زبان اردو سے مراد فارسی زبان تھی۔ اس بات کی وضاحت 'مثمر' میں خان آرزو کے بیانات سے ہوتی ہے۔ خان آرزو اور وارستہ سیالکوٹی نے پہلوی کو بھی زبان اردو کہا ہے۔ لہٰذا اس ضمن میں محتاط رویہ یہی ہے کہ جب ہندوی نے قلعے میں فارسی کی جگہ حاصل کی تو فارسی کے بجائے ہندوی کو زبان اردوے معلیٰ، اردوے معلیٰ اور آخر میں اردو کہا جانے لگا۔ اور ہندوی کو یہ اعتبار کم از کم فرخ سیری عہد تک نہیں حاصل ہوا تھا۔ ابتدا میں لفظ ریختہ کا استعمال بطور زبان شاذ ہی استعمال ہوا ہے، آغاز میں ہندوی زبان میں کہی جانے والی غزلوں کو ریختہ اور ریختہ کے مشاعروں کو مراختہ کہا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو نثر کے لیے اس لفظ کا استعمال کبھی نہیں ہوا۔

علی رفاد فتیحی صاحب کی یہ کتاب اردو لسانیات کے مطالعے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اردو کے قارئین تک اس کتاب کو پہنچانے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان بھی شکریے کی مستحق ہے۔ میں سمجھتا ہوں کو یہ کتاب قارئین کو مستقل فیض پہنچا رہی ہے اور اہلِ علم کے نزدیک مقبولیت کی حامل ہے۔

اٹھارھویں صدی میں ہندستانی معاشرت

مصنف: ڈاکٹر محمد عمر

صفحات: 564 قیمت: 177 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر نوشاد عالم، اکادمی برائے فروغ استعداد اردو میڈیم اردو اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'اٹھارہویں صدی میں ہندستانی معاشرت (میر کا عہد)' ڈاکٹر محمد عمر، شعبۂ تاریخ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی گرانقدر تصنیف ہے۔ کتاب ہذا کے منصۂ شہود پر آنے سے قبل ان کی تصنیفات 'مسلمانوں پر ہندو تہذیب کے اثرات' اور 'ہفت تماشا' کا اردو ترجمہ قارئین سے خراج تحسین وصول کرچکی ہیں۔ اس کتاب میں اٹھارہویں صدی میں ہندستانی سماج کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور ادبی تاریخ، جس میں خدائے سخن میر تقی میر کی حیات اور شاعری کا تحلیلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر کی تصنیفات وسعت مطالعہ، فکری صلابت، مدلل طرز بیان اور سلجھے ہوئے طرز نگارش کا نگارخانہ ہیں۔

کتاب دو حصوں اور نو ابواب میں منقسم ہے۔ حصہ اول میں اس زمانے کا احاطہ کیا گیا ہے جو میر نے نادر شاہی حملے کے بعد سے سفر لکھنؤ تک دہلی میں گزارا تھا۔ حصۂ دوم میں میر کی لکھنؤ آمد کے بعد کے سیاسی، سماجی و معاشرتی، تہذیبی و ادبی اور اقتصادی صورت حال کا بیان ہے۔ آخری باب میر کی آخری زندگی کے ایام پر مشتمل ہے۔ کتاب میں نثار احمد فاروقی کا وقیع اور عالمانہ دیباچہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے میر کی ادبی وسماجی زندگی کے ساتھ اس عہد کی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی وتہذیبی اور مذہبی واخلاقی زندگی کی طرف خصوصاً میر کے مذہبی عقائد کی بابت معنی خیز اشارے کیے ہیں۔

کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی کہ ڈاکٹر محمد عمر نے واقعات کے بیان میں بنیادی ماخذوں کو نظر انداز نہیں کیا۔ آیا وہ بادشاہوں، امرا اور روسا کی زندگیوں کا تذکرہ ہو یا ادبی وتہذیبی زندگی کا بیان یا پھر ملکی وسیاسی حالات کی عکاسی ہر جگہ ان کا استدلالی طرز اظہار بیان کی صداقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے جن بیانات کے دفاع میں کتابوں کے شواہد دستیاب نہیں ہیں ان کا خلا وہ مختلف سیاحوں کی روداد اور سفرناموں کی تفصیلات سے پُر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں مواد کی عدم دستیابی کی صورت میں اس کے متعلق کمالِ دیانت داری سے اعتراف بھی کرتے ہیں۔

خدائے سخن میر تقی میر کے شاعرانہ کمال اور ان کی استادی کا ایک جہان قائل ہے لیکن ان کی زندگی جن مشکلات اور صعوبتوں سے عبارت رہی ہے اس کا اندازہ تاریخ کی ورق گردانی کے بغیر حیطۂ ادراک سے باہر ہے۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سیاسی طوائف الملوکی، سماجی بے چینی اور اقتصادی کساد بازاری کا بیان، مغلیہ دربار کے ایرانی وتورانی دوگروپ کی ریشہ دوانیوں کے بارے میں معلومات، مختلف علاقائی قوتوں، مرہٹوں، جاٹوں، سکھوں اور روہیلوں کی لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے پیدا شدہ بدنظمی، مختلف پیشہ وروں کی زبوں حالی، امرا اور روسا کی فضول خرچی واسراف کا تذکرہ، رسوم ورواج کا بیان، میر نے کن امرا کے یہاں ملازمت کی، ان کے ماموں خان آرزو نے ان کے تئیں کیوں سرد مہرانہ رویہ روا رکھا، میر کے عہد میں ادبی مجالس اور مراختوں کے متعلق معلومات وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جنھیں میر کی زندگی اور شاعری کا مطالعہ کرنے والے کے لیے جاننا ناگزیر ہیں۔ بصورت دیگر قاری میر کی زندگی، ان کی شاعری اور اس داخلی شعری فضا کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا جس کے عناصر سے اس کی تشکیل ہوتی ہے۔

غرض حملۂ نادر شاہ (1739) سے میر کے سفر لکھنؤ (82-1781) تک کی تاریخ کو محیط

حصہ اول میں اہم سیاسی، سماجی، اقتصادی، معاشرتی وتہذیبی اور اخلاقی ادبی اہم رجحانات کی نشاندہی ہوجاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر نے اردو، فارسی اور انگریزی کے ماخذوں کے ساتھ اس عہد کے شعرا کے کلام سے بھی استفادہ کیا ہے تاکہ یہ پس منظر میر تقی میر کی شخصیت، ان کے ذہنی نشو ونما، نیز ان کے فن کی داخلی فضا کی تفہیم میں مدومعاون ہوسکے۔

میر کی زندگی اردو شاعری کے دو دبستانوں کے اردگرد گردش کرتی ہے۔ میر نے قدرے طویل عمر پائی تھی اور حوادثِ زمانہ کے عینی شاہد بھی رہے۔ دہلی کی تباہی وبربادی کے بعد امن کی تلاش میں شعرا نے جب علاقائی حکومتوں کی طرف رخ کیا ان میں خدائے سخن میر بھی ہیں۔ میر کی شاعری کو دل اور دلی کا مرثیہ کا شناس نامہ کہنے کے پس پردہ بھی حالات کی زبوں حالی ہی ہے۔

دوسرا حصہ، حصۂ اول کی طرح سیاسی، اقتصادی، معاشرتی وتہذیبی اور مذہبی واخلاقی ابواب میں منقسم ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے دوسرے حصے یعنی لکھنؤ کے بیان میں عوام وخواص کے آداب خورد ونوش، طرز بود وباش، کھیل تماشے، ادبی محفلوں، جشن اور تہواروں کے علاوہ سیاسی، اقتصادی اور ادبی حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اہل لکھنؤ نے لباس وپوشاک اور کھانے پینے وغیرہ کی اشیا میں خوب خوب جدتیں پیدا کیں جن کا کچھ اندازہ اس کتاب سے بھی ہوتا ہے۔ حصہ دُوم کے مطالعے سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ دہلی کے ناگفتہ بہ حالات سے تنگ آکر صرف شعرا نے مہاجرت نہیں کی بلکہ مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے جیسے نانبائیوں، طوائفوں وغیرہ بھی دہلی سے ہجرت کرکے لکھنؤ میں سکونت پذیر ہوئے۔

نواب سعادت علی خاں، صفدر جنگ، شجاع الدولہ، آصف الدولہ وغیرہ نے لکھنؤ میں ایک ایسی حکومت کی تعمیر کی جہاں امن تھا اور اس فضائے امن نے ادب پروری اور ادب نوازی کے لیے راہ ہموار کردی تھی۔ مرزا سلیمان شکوہ کے دربار سے منسلک انشا وجرأت کے معرکے اور دیگر شعرا وادبا کے ادبی معرکوں سے لکھنؤ میں ادبی فضا کا کچھ اندازہ ضرور ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر محمد عمر نے شعرا کے کلام سے استفادہ کے ذریعے ادبی حوالوں کو بھی بطور سند استعمال کیا ہے۔

قوی توقع ہے کہ ڈاکٹر محمد عمر کی یہ کتاب بھی ان کی سابق کتاب 'مسلمانوں پر ہندو تہذیب کے اثرات' کی طرح اردو حلقے میں ایک ماخذ کی حیثیت سے قبول کی جائے گی۔ اور وہ اس لیے بھی کہ انھوں نے تاریخ کے میدان میں سند کی حیثیت رکھنے والی ہستی پروفیسر خلیق احمد نظامی کے زیر نگرانی اپنا تحقیقی کام کیا ہے اور دوران تحقیق قدم قدم پر اس محترم نسبت کو ملحوظ بھی رکھا ہے۔

تاریخ ایجادات

مصنف: ایگین لارسن، مترجم صالحہ بیگم
صفحات: 399، قیمت 126 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی
مبصر: عبدالصبور G-50 ابوالفضل انکلیو ا-1، جامعہ نگر نئی دہلی

انسان کی ابتدائی زندگی کیسی رہی ہوگی اس کا بس ہم تصور ہی کرسکتے ہیں کیونکہ زمانہ قبل تاریخ کے بارے مستند معلومات کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ جیسے جیسے انسانی دماغ کی نشوونما ہوئی زندگی کی بقا کی خاطر انسان نے خورد ونوش اور اپنی حفاظت کی غرض سے مختلف آلات تلاش کیے اور پھر دھیرے دھیرے زندگی گزارنے کے بہتر امکانی طریقے کے بارے میں سوچا۔ کہا جاتا ہے 'ضرورت ایجاد کی ماں ہے' جن حالات کا سامنا انسان کو کرنا پڑا اسی کی مناسبت سے اس نے آلات واوزار تلاش کیے نیز ایجاد بھی کیا اس طرح یہ کتاب وضع وایجادات یا دوسرے لفظوں میں موجودات کی کہانی بیان کرتی ہے جس سے نہ صرف ان ایجادات کی بلکہ انسانی ارتقا کی داستان ہمارے سامنے آموجود ہوتی ہے۔

اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصہ انسان کی عظمت اور بے پناہ دماغی طاقت کا احساس دلاتا ہے۔ جس کے ذریعے انسان نے نہ صرف نظر آنے والی بلکہ غیر مرئی اشیا پر بھی قابو حاصل کیا اور انھیں اپنے استعمال میں لاکر یہ ثابت کردیا کہ انسان ہی دنیا میں سب سے اعلیٰ وارفع ہے۔

حصہ اول کو 'طاقت' کا عنوان دیا گیا ہے۔ جس کے تحت آندھی، پانی، بھاپ اور صنعت، برق کی کہانی، جوہری توانائی، سورج سے براہ راست توانائی وغیرہ ذیلی عنوانات قائم کرکے ان کے ذریعے انسانی ایجادات اور مصنوعات کی کہانی بیان کی گئی ہے۔

حصہ دوم: نقل وحمل اس حصے میں پہیے سڑکیں، پل، نہریں، ریلیں، پانی کے جہاز، ہوائی پرواز وغیرہ عنوانات سے ذرائع نقل وحمل کے بارے میں تفصیلات مذکور ہیں۔

حصہ سوم کو مراسلات کا عنوان دیا گیا ہے۔ اس حصے کے ذیلی عنوانات اس طرح ہیں۔ مطبوعہ الفاظ، تار پیغامات، ریڈیو محفوظ آوازیں، تصاویر، ٹیلی ویژن، روزمرہ برقی آلات وغیرہ ان کے تحت متعلقہ مصنوعات کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

کتاب کے ہر حصے میں اہم سائنسی ایجادات، ان کی ابتدائی شکلیں اور ارتقا کی کہانی کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ تصاویر بھی دی گئی ہیں جن کی مدد سے ان ایجادات کے قدم بہ قدم ترقی کے سفر کو سمجھنا مزید آسان ہوجاتا ہے۔ مثلاً آج بازار میں ضروریات زندگی سے متعلق مختلف قسم کی مصنوعات بلب، ریڈیو، ٹیلی ویژن، کمپیوٹر یا دوسری چھوٹی بڑی چیزیں قلم وغیرہ سے لے کر بڑی بڑی گاڑیاں یا ذرائع نقل وحمل کی مصنوعات وغیرہ دستیاب ہیں انھیں ہم بآسانی حاصل کرکے اپنے استعمال میں لاتے ہیں لیکن ہمیں شاید ہی یہ احساس ہوتا ہو کہ ان اشیا کی تیاری میں اور انھیں یہ شکل ملنے میں کتنی صدیاں اور کتنے دماغ استعمال ہوئے۔ کتاب میں موجدین کے متعلق بھی ضروری معلومات یکجا کردی گئی ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کو پڑھتے ہوئے حیران کن اور دلچسپ واقعات سامنے آتے ہیں اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آج ہم جن سائنسی ایجادات کو بہت اہم اور زندگی کا لازمہ سمجھتے ہیں ان کے موجدین نے ان کی تیاری میں اپنی عمریں اور زندگی بھر کی جمع پونجی کو خرچ کردیا بلکہ بسا اوقات انھیں ہمت افزائی اور استقبال کے بجائے مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا اور بڑی عسرت کی زندگی گزار کر وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔

یہ کتاب نہ صرف سائنس کے طالب علموں اور سائنس سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے مفید ہے بلکہ عام قارئین کے لیے بھی انتہائی اہم معلومات اور دلچسپی کا سامان رکھتی ہے۔ مصنف نے بہت دلچسپ پیرائے میں سائنسی ایجادات کی کہانی بیان کی ہے۔ ترجمہ سادہ، سلیس اور رواں ہے جو قاری کے لیے مزید دلکشی کا سبب بن جاتا ہے۔ اور ایک نشست میں کتاب کے زیادہ سے زیادہ حصے کو پڑھ لینے پر اکساتا ہے۔ عمدہ کتابت وطباعت اور دلکش سرورق کے باوجود قیمت مناسب ہے۔

کچھ دیکھے کچھ سنے

مصنف: نند کشور وکرم
صفحات: 204، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزر، ایف 14/21، (ڈی)، کرشن نگر دہلی 51
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال
بیت الرضیہ، A/G-5 ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

'عالمی اردو ادب' سے اردو دنیا کا ہر فرد واقف ہے۔ اس رسالے کا نام آتے ہی نند کشور

وکرم اپنی انفرادیت اور فہم وذکا کے ساتھ سامنے آجاتے ہیں۔ یہ وہ حوالہ جاتی رسالہ ہے، جو گزشتہ ربع صدی سے جاری ہے اور اپنے خصوصی شماروں کے باوصف ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس کے خصوصی شمارے احمد ندیم قاسمی، سردار جعفری، گوپی چند نارنگ، کشمیری لال ذاکر اور محمد حسن وغیرہ اپنی افادیت کے پیش نظر مقبول دستاویز شمار کیے گئے ہیں۔

نند کشور وکرم کی نئی کتاب 'کچھ دیکھے- کچھ سنے' جلوہ گر ہوئی ہے۔ اس کتاب میں 'بقلم خود' سمیت 23 مضامین جمع کیے گئے ہیں۔ یوں تو تمام مضامین قابلِ مطالعہ ہیں، لیکن احمد ندیم قاسمی، شورش کاشمیری، سردار جعفری، اسرار الحق مجاز، محمد طفیل اور گوپی چند نارنگ نے خصوصیت کے ساتھ اپنا ایک تاثر چھوڑا ہے۔ یہ مضامین نند کشور وکرم کی یادداشتوں، ملاقاتوں اور ان شخصیتوں کے ساتھ گزارے گئے 'لمحوں' کے حوالے سے دلچسپ اور غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان شخصیتوں کے ساتھ نند کشور وکرم نے جہاں ان کے علم وفن پر گفتگو کی ہے، وہیں اس وقت یا اس دور کے تاریخی واقعات کو بھی ضمناً قلم بند کیا ہے۔ جس سے ان کی افادیت دوچند ہوگئی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کے انتقال پُرملال پر انھوں نے مضمون قلم بند کرتے ہوئے جہاں اس دور کی شاعرانہ فضا پر روشنی ڈالی ہے، وہیں یہ بھی بتایا ہے کہ قاسمی صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے، مگر انھوں نے انتہا پسندی کے بجائے ہمیشہ اعتدال پسندی کا راستہ اختیار کیا۔ احمد ندیم قاسمی ایسے ترقی پسندوں سے اتفاق نہیں رکھتے تھے، جو مذہب خدا کی مخالفت اور دہریت میں ایقان ہی کو ترقی پسندی خیال کرتے ہیں، البتہ وہ مارکس واد سے ضرور متاثر تھے۔ قاسمی صاحب کی کہانیوں میں شاعرانہ حسن وجمال کی انھوں نے ستائش کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ یہ حسن کبھی کرداروں کی صورت میں تو کبھی ماحول کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

بیباک صحافی، شاعر، شعلہ بیان خطیب اور تحریک آزادی کے عظیم مجاہد شورش کاشمیری نے بھی نند کشور وکرم کو اپنے سحر میں گرفتار کیا ہے۔ شورش کاشمیری کے ہفت روزہ 'چٹان' لاہور سے کون واقف نہیں۔ یہ اپنے دور کا مقبول ترین ہفت روزہ تھا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ شورش کے مخالفین بھی بڑے ذوق وشوق اور انہماک سے اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ نند کشور وکرم نے شورش کاشمیری پر گفتگو کرتے ہوئے ان کی بیباکی کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ شورش وطن عزیز کی آزادی اور خوش حالی کے لیے قید وبند کی صعوبتیں اور اذیتیں برداشت کرتے رہے، لیکن جب ملک آزاد ہوا تو ناگفتہ بہ بحرانی صورت حال پیدا ہوگئی۔ اس موقعے پر شورش نے کہا تھا:

ہم نے اس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا　　　جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں
سرفروشوں کے لیے دار ورسن قائم تھے　　　خان زادوں کے لیے مفت کی جاگیریں تھیں
حیف اب وقت کے غدار بھی رستم ٹھہرے　　　اور زندان کے سزاوار فقط ہم ٹھہرے

سردار جعفری پر اپنے مضمون میں نند کشور وکرم نے اس جانب اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے کیا تھا اور ان کی اولین دور کی شاعری میں جوش ملیح آبادی کا رنگ جھلکتا ہے۔ سردار جعفری نے، کلاسیکی مزاج رکھنے کے باوجود، جدت طرازی کی ایسی منفرد چھاپ چھوڑی ہے کہ وہی ان کا امتیازی وصف شمار ہوتا ہے۔

اسرار الحق مجاز پر نند کشور وکرم نے مجاز کی موت یا خودکشی کے عنوان سے اپنے جن تاثراتِ قلبی کو قلم بند کیا ہے، وہ بلاشبہ اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے جہاں ان کی شاعری اور ان کے متوالوں، بلکہ متوالیوں کا تذکرہ کیا ہے، وہیں چار وناچار ان کی ناکامیوں اور محرومیوں کا بھی جائزہ پیش کیا ہے۔ محمد طفیل ایڈیٹر 'نقوش' سے متعلق نند کشور وکرم کے خیالات صدفی صد درست ہیں کہ اردو ادبی صحافت میں جو مقام ومرتبہ علامہ نیاز فتح پوری مدیر 'نگار' اور محمد طفیل ایڈیٹر 'نقوش' کو حاصل ہوا، وہ کسی اور ادبی رسالے کے مدیر کو شاید نہ مل سکا۔ محمد طفیل نے زائد از 34 برس نقوش کی ادارت کی۔ نقوش کے تمام خصوصی نمبر اپنے ضخیم صفحات اور مواد کے اعتبار سے خصوصی اہمیت کے حامل سمجھے گئے ہیں۔ ان خصوصی شماروں کی اہمیت آج بھی اتنی ہی ہے، جتنی ان کے شائع ہونے کے وقت تھی۔ ان ضخیم نمبروں کی ادارت وترتیب اپنے معیارات پر کھری اترتی ہے۔ ان نمبروں میں دیوانگی کی حد تک ان کی محنت وکاوش صفحات پر بکھری نظر آتی ہے۔ خصوصی نمبروں کے سلسلے میں ان کا آخری کارنامہ 'رسول نمبر' ہے، جو تیرہ (13) جلدوں اور 9700 (ستانوے سو) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد وہ قرآن نمبر شائع کرنے والے تھے، لیکن زندگی نے وفا نہ کی۔ ان کے کارناموں سے نند کشور وکرم نے روشناس کرا کر اردو دنیا کی جانب سے بہت بڑا فرض ادا کیا ہے۔

گوپی چند نارنگ ہمارے دور کے وہ ممتاز شخص ونقاد ہیں۔ لسانی میدان ہو تنقیدی، ادبی میدان ہو یا تحقیقی، تخلیقی میدان یا تاریخی ہر میدان میں ان کا قلم جادو رقم اپنے منفرد انداز میں نظر آتا ہے۔ ان کی سوچ وفکر کے ہر گوشے نے اردو ادب کو فیضیاب کیا ہے۔ نند کشور وکرم کا ان پر لکھا گیا مضمون ملاقات وتعلقات پر مبنی ہے۔ ان کی دوسری کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی اردو تاریخ وادب میں ایک اضافہ ہے۔

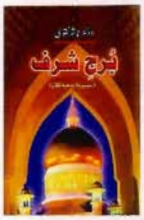

بُرجِ شرف (مدحیہ شاعری کا مجموعہ)

شاعر: ڈاکٹر ناشر نقوی
صفحات: 208، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: تخلیق کار پبلشرز، دہلی
مبصر: پروفیسر عزیز عباس، صدر، شعبۂ فارسی اردو، گورونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر

'بُرجِ شرف' پروفیسر ناشر نقوی کی مدحیہ شاعری کا منتخب مجموعہ ہے جس میں ناشر نقوی کی چالیس برس کے دوران کہی گئی منقبتیں بھی شامل ہیں اور قصائد وسلام بھی۔ اس مجموعے کو تخلیق کار پبلشرز دہلی نے نہایت جاذبِ نظر انداز سے شائع کیا ہے۔

'بُرجِ شرف' مجموعۂ کلام میں ڈاکٹر ناشر نقوی نے ترتیب وتہذیب کی یہ انفرادیت رکھی ہے کہ پہلی نظم حمد باری تعالیٰ ہے، اس کے بعد نو نعتیں ہیں 'نعتوں میں قصیدے' مخمس اور مسدس تینوں کی ہیئت ہے۔ آپ کی کہی گئی نعتوں کا منفرد اسلوب یہ بھی ہے کہ آپ نے حقیقت بیانی پر عقیدت کی فراوانی کے پردے نہیں پڑنے دیے۔ مجموعے کا آغاز مندرجہ ذیل حمد سے ہوتا ہے:

مرے خدا تری ذاتِ عظیم میں گُم ہوں　　　ٹھہر گیا ہوں الف لام میم میں گُم ہوں

الف لام میم کہہ کر ڈاکٹر ناشر نقوی نے اشارہ دیا ہے کہ قرآن کے پہلے پارے کی شروعات ہی الگ الگ حروف سے ہوتی ہے جو مکمل لفظ بھی نہیں ہے۔ ایسے میں شاعر اللہ سے کہتا ہے کہ اے خدا تیرے قرآن کی فہمی ہم کر ہی کیسے سکتے ہیں۔ یہاں صرف بیان عظمتِ عقیدت ہی سے نہیں حقیقت بیانی سے ہوا ہے۔ اسی حمد میں ایک شعر یہ ہے:

جو منکرین ہیں ان کو بھی دی ہے تو نے حیات　　　تری صفاتِ رحیم وکریم میں گُم ہوں

حمد کے بعد مجموعے میں شامل 9 نعتیں صنائع لفظی اور معنوی کی بھی بہترین مثال ہیں۔ ڈاکٹر ناشر نقوی نے علم البیان اور علم الکلام دونوں کی آگہی کے ساتھ مقصدیت سے معمور نعت کے ایسے اشعار 'برجِ شرف' میں شامل کئے گئے ہیں:

حمد خالق کے سبب نام ہُوا ہے احمد　　　سارے اعزاز یہ اللہ سے پائے ہوئے ہیں
ہر اک شاخِ شجر پر مصطفیٰ کا نور رہتا ہے　　　پرندے مطمئن ہیں اپنے اپنے آشیانے میں
ہم جلاتے ہیں زمانے میں محبت کے چراغ　　　روشنی علم کی دیتا ہے مدینہ ہم کو

نعتِ رسول کے بعد ڈاکٹر ناشر نقوی نے مدحِ بتولؑ کرتے ہوئے چار منقبتوں اور چار قصیدوں میں ایسے ایسے اشعار کہے ہیں جن پر بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ قابلِ ذکر

ہے کہ آج قصیدے کی صنف مفقود ہو رہی ہے ایسے میں ایک ہوش مند شاعر کی یہ بھی ذمے داری ہو جاتی ہے کہ وہ اصنافِ ادب کی بھی حفاظت کرے، یہ کام بھی ڈاکٹر ناشر نقوی بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں۔ بی بی فاطمہؓ کی شان میں کہے گئے قصیدے کا انداز ملاحظہ ہو:

امتحانِ زیست سے گزریں گے جب محنت گزار
تیری چکّی کی صدا سے آسرا لے جائیں گے
ملا تطہیر کو زہراؓ کا دامن آ گیا اس میں
معنی کی مناسب جا کر سورہ ڈھونڈ لیتا ہے

رسولِ مقبول اور بتول با اصول کی مدح کے بعد ڈاکٹر ناشر نقوی نے حضرت علیؓ سے حضرت امام مہدیؑ تک بالترتیب 37 منقبتیں ہر امام کی شان میں کہہ کر 'بُرجِ شرف' میں شامل کی ہیں جو اردو شاعری کی مختلف ہیئتوں مثلاً مخمس، مسدس، قصیدہ اور مثلث میں ہیں۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ منقبت اور قصیدے کی زبان میں جو شان وشکوہ ہوتا ہے اُس کا بھی ڈاکٹر ناشر نقوی نے خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ موضوع اور ممدوح کے مطابق موصوف کے ایسے اشعار مدحیہ شاعری میں سنگِ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت علیؓ:

نمازِ حق کے لیے ساعتیں مقرر ہیں — نمازِ عشق میں لمحہ علی علی بولے
جہاں جہاں ہے تصوف وہاں علی مولا — ہر اک فقیر کا تکیہ علی علی بولے

قصیدے کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

کلِ ایماں کا لقب صرف علی نے پایا — حق کے آئینے میں بس ایک ہی چہرہ اُترا

امام حسین:

ترے حسین سے جلوے حُسینؓ چاروں طرف — یہ صبح و شام کا سب انتظام تیرا ہے
اُفق سے تابہ اُفق سرخیوں میں تو ہے حسینؓ — لہو دمکتا ہوا صبح وشام تیرا ہے

امام سجاد:

میں صحتِ افکارِ رسا مانگ رہا ہوں — سجاد کی چوکھٹ پہ دعا مانگ رہا ہوں

امام محمد باقر:

کبھی مدینہ کبھی کربلا کے میدانوں میں — کبھی مُقیّد زندانِ شام ہیں باقرؑ

مذکورہ اشعار 'بُرجِ شرف' سے منتخب نہیں کیے گئے بلکہ جو سامنے آ گئے نقل کر دیے گئے ہر منقبت اور سلام میں اسی طرح کے اشعار ہیں جو ڈاکٹر ناشر نقوی کی بیدار شاعری کا بہترین ثبوت ہیں۔

چودہ معصومین کے علاوہ دوسرے ممدوحین میں حضرت ابو طالب، حضرت خدیجہؓ، حضرت زینبؓ، حضرت عباسؓ، حضرت علی اکبرؓ اور حضرت علی اصغرؓ سے متعلق بھی منقبتیں شامل ہیں۔ نیز سامانہ پنجاب میں مدفون شہزادہ امام حضرت مشہد علی اور امروہہ کے بزرگ صوفی مخدوم سید حسین شرف الدین شاہ ولایتؒ کا منظوم شجرہ بھی 'بُرجِ شرف' کی زینت ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں بڑی تعداد میں ترتیب کے ساتھ ممدوحین کی شان میں لاجواب قطعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ایسی پیشکش کی پذیرائی ہمیشہ ہمیشہ ہوتی رہے گی۔

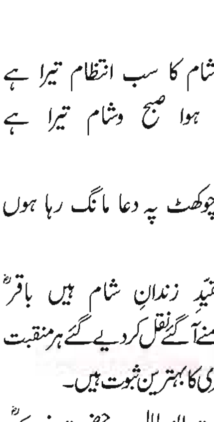

ابن صفی کے 101، اداریے: جائزہ

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

صفحات: 179، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: شاہد اختر انصاری، نور نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی

ابن صفی کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ شاعری، مضمون نگاری، کہانیوں، ناول اور ناولوں پر لکھے گئے اداریے ان کی ادبی تحریروں کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے پیش رس بھی اتنے دل چسپ ہوتے تھے کہ قارئین ان کے ناولوں کی طرح ان کے پیش رس کے بھی منتظر رہا کرتے تھے۔ یہ پیش رس ابن صفی اور قارئین کے درمیان نہ صرف رابطے کا کام دیتے تھے بلکہ ان کے ذریعے قارئین کے خطوط کے جواب، ملکی غیر ملکی مسائل اور دوسرے موضوعات بھی زیر بحث آ جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ابن صفی کے پیش رسوں میں بلا کی جاذبیت پائی جاتی ہے۔ آج ابن صفی پر تحقیق کرنے والوں کے لیے پیش رس ایک مستقل موضوع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب 'ابن صفی کے 101، اداریے: جائزہ' اسی مقصد کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔

ہندوستانی ادیبوں میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ابن صفی کے بڑے مداحوں میں ہیں اور اب تک ان کی تین کتابیں ابن صفی کے تعلق سے منظر عام پر آ چکی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب انھی تین میں سے ایک ہے۔ اس کتاب کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ابن صفی کے جدید قارئین ان پیش رسوں کو براہ راست پڑھ سکیں گے ابن صفی کے پیش رس کے تعلق سے چند تاریخی باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

مارچ 1952 میں ابن صفی نے ادارہ نکہت الہ آباد کے تحت پہلا ناول 'دلیر مجرم' شائع کیا تھا اور اگست 1952 میں کراچی منتقلی تک سات ناول مذکورہ ادارے سے شائع ہو چکے تھے۔ ان ناولوں کا تعارف ابن صفی 'پیش لفظ' کے عنوان سے لکھا کرتے تھے، جس کے آخر میں '1۔ص' لکھا ہوتا تھا۔ کراچی، پاکستان ہجرت کرنے کے بعد ابن صفی کے ناولوں پر ہندوستان میں عباس حسینی 'پیش لفظ/ اداریہ' لکھا کرتے تھے۔ جب کہ پاکستانی میں ابن صفی خود اپنے ناولوں کا تعارف 'پیش رس' کے عنوان سے کراتے رہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں ان پیش رسوں کو شامل کیا گیا ہے جو ابن صفی نے پاکستان میں لکھے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان پیش رسوں کو اداریہ کہا ہے:

''ابن صفی نے اپنے اداریے کا نام 'پیش رس' رکھا تھا۔ لیکن چوں کہ وہ ماہانہ رسالہ کے تحت ناول پیش کیا کرتے تھے اس لیے میں اسے اداریہ مانتا ہوں۔'' (ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی)

مرتب موصوف نے پیش رسوں کو مرتب کرنے میں اپنی سی کوشش کی ہے۔ یہ پیش رس انھوں نے اپنی ذاتی لائبریری اور قسیم اختر کے بھرپور تعاون سے جمع کر کے پیش کیے ہیں۔ 'گفتنی' کے تحت مرتب نے قسیم اختر کا شکریہ بھی ادا کیا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ عمران سیریز کے پیش رسوں کو مرتب نے اولیت دی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مرتب کو عمران، فریدی کے مقابلے زیادہ پسند ہو یا پھر اس لیے کہ مرتب کو عمران سیریز کے پیش رس فریدی سیریز کے پیش رسوں کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں دست یاب ہوئے ہیں۔ ابن صفی اپنے پیش رس کے آخر میں دستخط کرتے تھے اور تاریخ درج کر دیتے تھے۔ لیکن بہت سے پیش رس تاریخ سے محروم ہیں۔ ان پر صرف دستخط ہیں۔ مرتب نے تاریخ درج شدہ پیش رسوں کو تاریخی ترتیب سے پیش کیا ہے پھر ان پیش رسوں کو رکھا ہے جن پر تاریخ درج نہیں ہے۔ دونوں سیریز کے پیش رسوں میں مرتب نے یہی طریقہ اپنایا ہے۔ ہر پیش رس کا عنوان پیش رس ہی رکھا ہے۔ اپنی طرف سے کوئی عنوان مقرر نہیں کیا ہے۔ یہ شاید حد درجہ احتیاط کی وجہ سے کیا ہو۔ لیکن اگر اس بات کی وضاحت کر دی جاتی کہ کون سا پیش رس کس ناول پر لکھا گیا تو کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی کیوں کہ بہت سے پیش رسوں کو مکمل پڑھ لینے کے بعد بھی پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس ناول پر لکھا گیا۔ اس طرح تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے۔

مرتب موصوف نے دونوں سیریز کے پیش رسوں کا الگ الگ جائزہ پیش کیا ہے اور ان

جائزوں کو ہر دو سیریز کے پیش رسوں سے قبل شامل کیا ہے۔ عمران سیریز کے جائزے میں لکھتے ہیں:

''ابن صفی کے ان اداریوں میں جاسوسی ناولوں کی کہانیوں کی باتیں ہیں، قارئین کے تاثرات کے جواب ہیں، عمران، فریدی، حمید، قاسم اور دوسرے کردار کا ذکر ہے، نئے کرداروں کی آمد کی جانکاری ہے، قارئین اخبار اور بعض پبلشرز کے الزامات کے جواب ہیں، لطیفے کی پھلجھڑیاں ہیں اور موسم، ملکی حالات اور کراچی شہر کے مزاج کے بارے میں تفصیل ہے۔''

امید ہے کتاب ابن صفی کی ادبی خدمات کے نئے گوشے کو اجاگر کرنے میں معاون ہوگی اور خاص طور سے ابن صفی کے پرستاروں کو پسند آئے گی۔

بازدید اور تبصرے

مصنف: ڈاکٹر کوثر مظہری

صفحات: 376، قیمت: 300/- روپے، سنہ اشاعت: 2013

رابطہ: مصنف، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر عادل حیات، 37/89، غفار منزل، نئی دہلی

زیر تبصرہ ڈاکٹر کوثر مظہری کی تازہ کتاب 'بازدید اور تبصرے' کے بنیادی تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ مقدمے کا ہے، جو کہ صفحہ 9 سے 28 تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسرا بازدید کا جو 29 سے 278 صفحوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد تبصرے کا حصہ صفحہ 279 سے 376 پر محیط ہے۔

'بازدید اور تبصرے' سے پہلے پروفیسر کلیم الدین احمد، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ظ انصاری اور شمس الرحمن فاروقی وغیرہ نے اپنی کتابوں سے اردو ادب میں تبصرہ نگاری کی روایت کو استحکام بخشا اور مقدمہ و مضامین لکھ کر اس کے خدوخال کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ اسی روایت کو زندہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کوثر مظہری نے اپنی کتاب میں تبصرے کے اغراض و مقاصد اور اس کے اجزائے ترکیبی پر تفصیل کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ تبصرہ دراصل کسی کتاب کو قارئین سے متعارف کرانے کا ایک ذریعہ ہے، جس میں کتاب کی صوری و معنوی خوبیوں پر اجمال کے ساتھ اس طرح روشنی ڈالی جاتی ہے کہ قاری اس کتاب کی قدر و قیمت سے واقف ہوجائے۔ اصل میں دیکھا جائے تو تبصرہ نگار کسی کتاب پر ناقدانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ جس سے اس کی تنقیدی صلاحیت نکھرنے لگتی ہے اور اگر وہ تنقیدی شعور بھی رکھتا ہے تو کچھ عجب نہیں کہ وہ اچھا تنقید نگار بن جائے۔ اردو کے بہت سے معتبر نقادوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز تبصرہ نگاری کے ذریعے ہی کیا تھا، جس نے ان کی تنقیدی صلاحیت کو سجنے سنورنے کا خاطر خواہ موقع دیا۔ بعد ازاں وہ تنقید کے مردِ میدان ثابت ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر کوثر مظہری کا یہ کہنا کہ تبصرہ تنقید کے لیے پہلا زینہ ہے۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے اپنے مقدمے میں مختصراً تبصرہ نگاری کے اجزائے ترکیبی پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے مطابق ایک اچھے تبصرے کے لیے چند چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے۔ تبصرہ نگار کا کتاب کی نوعیت اور نفسِ مضمون سے واقف ہونا، اپنے میدان میں یکتا ہونا، غیر جانب دار ہونا، تحریر میں اعتدال کا ہونا، علمی اور تنقیدی صلاحیت کا ہونا، جن رسائل کے لیے تبصرہ کیا جارہا ہے، ان کی نوعیت اور تحسین و تنقیص کا معیار وغیرہ شامل ہیں۔ یہی عوامل تبصرہ نگار کی تحریر کو بلند مقام عطا کرکے مستقبل کے لیے راہ روشن کرتے ہیں۔

ڈاکٹر کوثر مظہری نے اپنے مقدمے میں تبصرہ نگاری سے متعلق پروفیسر کلیم الدین احمد، ظ انصاری اور شمس الرحمن فاروقی وغیرہ کی رایوں سے استفادہ کرتے ہوئے اس پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ جس سے تبصرہ نگاری کے فن کو سمجھنے میں آسانی ہوجاتی ہے۔ بعد ازاں انھوں نے سر عبدالقادر، مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، وحیدالدین سلیم، سید سلیمان ندوی، محمود شیرانی، نیاز فتح پوری، خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، آل احمد سرور، اسلوب احمد انصاری، کلام حیدری وغیرہ کے تبصروں کی خوبی و خرابی پر بحث کرتے ہوئے تبصرہ نگاری کے فن کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اردو ادب اور اردوئے معلّٰی سے لے کر ایوانِ اردو اور کتاب نما میں چھپے تبصروں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے، جس سے ان کی اس کتاب کی معنویت اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر کوثر مظہری نے کتاب کے دوسرے حصے پر 'بازدید' کا عنوان لگایا ہے۔ بازدید کے لفظی معنی کسی ملاقاتی سے بعد میں خود ملنے جانے کے آتا ہے۔ ادبی اصطلاح میں اس کا مطلب کسی کتاب پر دوبارہ روشنی ڈالنے یا قاری سے متعارف کرانے کے لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ بازدید کے حوالے سے ''بازدید اور تبصرے'' میں شامل تحریروں کو تبصرے کے ذیل میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ تحریریں طویل ہیں اور کتاب کے متن سے مدلل بحث کرتے ہوئے اس کے حسن و قبح کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس باب میں کل چودہ کتابوں کی بازدید کی گئی ہے۔ ان میں روشنائی، اردو تنقید پر ایک نظر، تلاش حق، تذکرہ، مرزا غالب اور ہند مغل جمالیات اور اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب جیسی کتابوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ان عنوانات سے کتابوں کی اہمیت اور ڈاکٹر کوثر مظہری کے ذریعے کی گئی بازدید کی افادیت کو سمجھا جاسکتا ہے۔

تبصرے کے باب میں کل پینتالیس کتب و رسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان چھوٹے بڑے تبصروں کو پڑھ کر ڈاکٹر کوثر مظہری کی تبصرہ نگاری پر دسترس اور اس کی جملہ خصوصیات سے ان کی واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کوثر مظہری نے کتاب کی نوعیت اور نفس مضمون پر اپنی نگاہ مرکوز کرتے ہوئے بغیر کسی جانب داری کے اس کا تعارف اور اس کی تحسین و تنقیص کی ہے۔ ان تبصروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ صاحب کتاب نے کسی دباؤ یا جانب داری کو اوڑھے بغیر اعتدال کے ساتھ کتابوں پر اپنی رائے دی ہے۔ جس سے قاری زیر تبصرہ کتاب کی خوبی و خرابی کا اندازہ بہ آسانی لگا سکتا ہے۔

ڈاکٹر کوثر مظہری نے 'بازدید اور تبصرے' کا انتساب ڈاکٹر مولا بخش کے نام کیا ہے۔ ایک ایسے دور میں جہاں شعرا و ادبا اپنے پیش رو کو بھی اہمیت نہیں دیتے وہاں ڈاکٹر کوثر مظہری کا اردو تنقید کے افق پر ابھرتے ہوئے نسبتاً جواں سال ناقد کے نام اپنی کتاب کا انتساب کرنا ان کی ادبی دیانت داری پر دال ہے۔ 'بازدید اور تبصرے' صوری و معنوی ہر دو سطح پر انفرادیت رکھتی ہے۔ امید کہ اردو کے قارئین اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور تبصرہ نگاری کے باب میں یہ کتاب سنگِ میل ثابت ہوگی۔

چھتیس گڑھ میں اردو زبان و ادب کی صورتِ حال

مرتب: کاوش حیدری

صفحات: 126، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: چھتیس گڑھ راجیہ اردو اکادمی، رائے پور، چھتیس گڑھ

مبصر: محمد عبدالرحمن ارشد، ریسرچ اسکالر،
شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب سیمینار میں پڑھے گئے مقالوں کا مجموعہ ہے جسے کاوش حیدری نے ترتیب دیا ہے۔ اس کتاب میں کل 16 مضامین شامل ہیں جس میں چھتیس گڑھ میں اردو کی صورتِ حال کا مختلف زاویوں سے جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب امتیاز احمد انصاری کی تمہیدی تحریر نے چھتیس گڑھ کی تاریخ اجمالی طور پر بیان کی ہے۔ یہ مضمون معلوماتی نوعیت کا ہے۔

مضمون 'چھتیس گڑھ میں اردو کی ترویج و اشاعت کی صورتِ حال، سرگرمیاں اور مشورے' ڈاکٹر رضوان الحق کا یہ مضمون کئی سطحوں پر اردو کی اشاعت اور ترویج کا ایک خوبصورت

خاکہ پیش کرتا ہے۔ انھوں نے باشندگانِ چھتیس گڑھ کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو میں اعلیٰ تعلیم کے علاوہ اسکولی سطح پر بھی اردو زبان کی معیاری تعلیم کی وکالت کی ہے۔ حقِ تعلیم قانون کا حوالہ پیش کیا ہے جس میں بچوں کو مادری زبان میں تعلیم دینے کی بات کہی گئی ہے۔ اردو کو روزگار سے جوڑنے پر بھی زور دیا ہے۔

ڈاکٹر منظر حسین کا مضمون 'چھتیس گڑھ میں اردو شاعری کی صورتِ حال' اس صوبے کی ادبی صورتِ حال کی کامیاب تصویر پیش کرتا ہے۔ جناب حسین نے اردو شاعری بالخصوص غزل گوئی میں چھتیس گڑھ کے شعرا کی خدمات کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے آزادی کے قبل سے لے کر حال تک کے شعرا کا ذکر کیا ہے اور نمونے کے طور پر ان کے کلام بھی پیش کیے ہیں۔ مضمون میں صوبے کے غیر مسلم شعرا اور ان کے نمونۂ کلام اختصاص کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی صوبے میں اردو نثر نگاری کا بھی اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔

'چھتیس گڑھ صوبہ میں اردو تعلیم کی صورتِ حال' کے موضوع پر لکھتے ہوئے سخنور حسین نے اردو کی اسکولی تعلیم پر اظہارِ اطمینان کیا ہے۔ انھوں نے اسکول میں اردو کی تعلیم کو اردو زبان و ادب کی بقا کا ضامن قرار دیا ہے۔ کتاب کے مرتب کاوش حیدری کا مضمون اردو کی تعلیم، ادبی صورتِ حال اور اردو صحافت پر ایک اچھا جائزہ ہے۔ صحافی جناب حیدری اپنے مضمون میں اس صورتِ حال کو مایوس کن پاتے ہیں۔ مضمون میں آزادی سے قبل کے اردو کے روشن ماضی کا ذکر کرتے ہوئے جناب حیدری کہتے ہیں کہ اس زمانے میں ہندو تہواروں کے موقع سے بھی مشاعرے منعقد ہوا کرتے تھے جو یقینی طور پر قومی ایکتا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی بہترین مثال تھی۔ جناب حیدری نے چھتیس گڑھ میں اردو صحافت کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے اور صوبے کی اردو صحافت کی اجمالی تاریخ بھی پیش کی ہے۔ نیز صوبے میں ڈرامے کی تاریخ اور اس کی موجودہ صورتِ حال پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

رونق جمال کا مضمون 'چھتیس گڑھ میں افسانہ نگاری کی صورتِ حال' ہے۔ چھتیس گڑھ کے دیگر افسانہ نگار ماسٹر خورشید، خورشید حیات وغیرہ کا تذکرہ بھی انھوں نے کیا ہے۔ 'چھتیس گڑھ محسنِ ملت مولانا حامد علی فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی قومی اور ملی خدمات' حسان لکھیم پوری کا مرقومہ ہے۔ یہ مضمون جامعیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے مولانا حامد علی فاردقی کی قومی اور ملی خدمات کا اعادہ کرتا ہے۔ محمد ناصر خان کا مضمون صوبہ چھتیس گڑھ میں اردو کی ترویج و ترقی کا جامع جائزہ ہے۔

محمد منصور فریدی نے عبدالسمیع فیض بلاسپوری کی نظم نگاری پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ فریدی صاحب نے فیض بلاسپوری کی نظموں پر فیض احمد فیض کے اثرات کو دیکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔ فیض بلاسپوری کی نظموں کے موضوعات کی نشاندہی کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ ان کی نظموں میں مذہبی اور عارفانہ رنگ کے ساتھ ساتھ آس پاس کی ذاتی زندگی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ گوہر جمالی نے چھتیس گڑھ کے اہم غزل گو شاعروں پر اپنا مضمون قلم بند کیا ہے۔ اِنھوں نے صوبے کے پرانے غزل گو شاعروں کے علاوہ موجودہ دور کے شاعروں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ محمد خالد صدیقی نے صوبے کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر جگن ناتھ پرساد بھانو کی غزل گوئی کا تفصیلی تجزیہ پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری پر استاد شاعروں کے اثرات کی تلاش بھی کی ہے۔

منی بھوشن کمار کا مضمون 'رضا حیدری کی شعری کائنات' رضا حیدری کی شاعری بالخصوص ان کی غزلیہ شاعری کا موضوعی مطالعہ ہے۔ رضا حیدری کی شاعری میں میر، غالب، مومن جیسے شعرائے کرام کے مضامین کی نشاندہی کی ہے۔ غلام ربانی ایاز کا مضمون 1960 کے بعد کے صوبہ چھتیس گڑھ میں اردو شاعری کے منظرنامے کی پیش کش کرتا ہے۔ سید ناصر علی ناصر نے اپنے مضمون میں ادیب رائے پوری کی شخصیت اور فن پر جامع انداز سے گفتگو کی ہے۔ رؤف پرویز نے حبیب تنویر کی ڈرامہ نگاری کا اجمالی جائزہ لیا ہے۔ محمد حذیفہ نے رضا حیدری کی شاعری کے فکروفن پر الگ زاویے سے روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر مطیع النسا خان نے چھتیس گڑھ میں اردو درس و تدریس پر مضمون قلم بند کیا ہے۔ وہ اپنے مضمون میں اظہارِ افسوس کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ آج اردو سننے اور بولنے والے تو موجود ہیں لیکن پڑھنے والے کم ہوتے جا رہے ہیں۔

اس کتاب سے چھتیس گڑھ میں اردو کی تعلیم اور ادبی صورتِ حال پر تحقیق کر رہے طلبہ کو مدد ملے گی۔ پروف کی غلطیاں تھوڑی رہ گئیں ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب اردو حلقوں بالخصوص چھتیس گڑھ میں پسند کی جائے گی۔

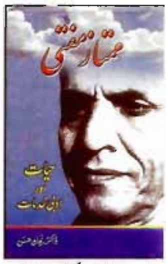

ممتاز مفتی: حیات اور ادبی خدمات

مصنف: ڈاکٹر ریحان حسن

صفحات: 519، قیمت: 400 روپے

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز دہلی

مبصر: ریاض الہاشم، 39 ٹی، سیکٹر 7، جسولا وہار، نئی دہلی

ڈاکٹر ریحان حسن اردو ادب کی نئی نسل کے نمائندہ ادیب ہیں۔ ان کے مضامین و مقالے اردو زبان کے رسالوں اور مجلوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مذکورہ کتاب مصنف کی ایک اہم کاوش ہے جس کی تصنیف میں انھوں نے بہت جدوجہد کی ہے۔ پاکستانی ادیب کے حوالے سے مواد کی فراہمی آج کے اس پرآشوب دور میں ایک دشوار کن مرحلہ ہے۔ ہندو پاک کے مابین کتب و رسائل کے ذرائع ابلاغ و ترسیل تقریباً بند ہیں۔ ڈاکٹر ریحان نے ممتاز مفتی کی تحریروں اور کتب و مقالات ان کی سوانح اور ادبی کارناموں کو قلمبند کر کے بہت کام انجام دیا ہے اور ان کی ہر نثری اصناف کو اہمیت دینے کی کوشش کی ہے اور اس میں تقریباً پورے طور پر کامیاب ہوئے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب 519 صفحات پر مشتمل ہے، جس کو آٹھ ابواب میں منقسم کر کے ممتاز مفتی کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ممتاز مفتی برصغیر کے ممتاز اور نامور ترین ادیبوں میں شامل ہیں۔ پاکستان کے ناقدین اور محققین نے انھیں پاکستانی ادبیات کا ایک اہم ستون کے طور پر تسلیم کیا ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ 1942 میں 'ان کہی' کے نام سے شائع ہوا اور اس کے بعد مسلسل یکے بعد دیگرے کئی مجموعے منظرِ عام پر آئے۔ عورتوں کے مسائل افسانہ کی تاریخ کا ایک اہم حصہ ہیں افسانہ کی زندہ اور دائمی بقا کے ضامن یہی مسائل ہیں چاہے وہ کردار مظلومیت کی شکل میں ہوں یا ظالمانہ۔ ہر حال میں عورتوں کے مسائل نے ہر دور میں رونق بخشی پریم چند سے لے کر اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ممتاز مفتی کے افسانوں کا موضوع بھی عورت، انسانی نفسیات اور جنسی مسائل ہیں۔ وہ جنسیات کو انسانی زندگی کا اہم جز قرار دیتے ہیں اور انسان کی فطرت جانتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں عورت کے دو کردار ہیں۔ ایک وہ عورت ہے جو صبر و ضبط کا مجسمہ ہے اور ایک وہ عورت جو جبر و تشدد کا مجسمہ ہے۔ ناول نگاری میں بھی انھوں نے عورتوں کے نفسیاتی مسائل پر بحث کی ہے اور ناول نگاری میں ناول کے اجزاء مثلاً پلاٹ کردار، زمان و مکاں وغیرہ میں اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی کہانی 'آپا' اور، ناول 'علی پور کا ایلی' ادبی نشستوں میں اپنی اہمیت منوا چکی ہیں۔ موصوف نے جس نوعیت سے ان کی نثری اصناف، خاکہ نگاری، انشائیہ نگاری، مضمون نگاری، اور سفرناموں کا تجزیہ کیا ہے اس سے قبل کسی محقق کے قلم نے نہیں کی ہے۔ کتاب کے پہلے باب میں ممتاز مفتی کی زندگی کے حالات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے اور سب سے پہلی ادبی تخلیق کا تذکرہ اور تخلیق کاروں کے درمیان رجحانات کے تصادم کا بھی اشارہ ملتا ہے۔ دوسرے باب میں افسانے کی مختصر تعریف اور افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ منٹو اور ان کے افسانوں کے موضوع کے مسائل کے درمیان فرق کو واضح کیا گیا ہے۔ ریحان حسن کا کہنا ہے کہ

ممتاز مفتی عورت کے جن جنسی مسائل کو افسانوں میں جگہ دیتے ہیں وہ عریانیت وفحاشیت سے پاک ہیں جبکہ منٹو کے افسانہ فحاشیت اور عریانیت سے پاک نہیں ہیں۔ نیز معاصرین کے درمیان ان کے درجہ کا تعین کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں ناول اور ہندوستان میں ناول نگاری کی ابتدا اور ارتقا پر ہندوستانی ناول نگاروں کے شاہکار ناول وفن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ممتاز مفتی کے ناولوں اور فن کی تکنیک اور اجزا مثلاً پلاٹ، کردار اور زمان وغیرہ پر تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں مختلف ممالک میں سفرنامہ کی روایت وفروغ ہندوستان میں سفرنامہ کی تاریخ کا ذکر، اس کی افادیت اور ان کے سفرناموں کا جائزہ لیتے ہوئے جدید طرز کے سفرنامہ نگار کے بانی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں خاکہ نگاری اور روایتی خاکہ نگاری کا تذکرہ کرتے ہوئے پیاز کے چھلکے اور اوکھے لوگ کا مختصر تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں انشائیہ نگاری کی تعریف پر بحث کی ہے اور ادب کے بہترین انشائیہ نگاروں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں باعتبار مضمون نگار اور طنز مزاح مفتی کی تحریر کی خوبی پر مصنف نے قلم اٹھایا ہے۔ آٹھویں باب میں فنی امتیاز کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آخر میں منابع کا ذکر کیا ہے جن سے کتاب کی تشکیل میں استفادہ کیا گیا ہے۔ مصنف نے ہر نثری اصناف کی تعریف اور اس کی اجمالی تاریخ بیان کی ہے لیکن ساتواں باب جو مفتی کی مقالہ نگاری سے منسوب ہے اس میں روایتی مقالہ نگاری کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً کتاب کی ضخامت اس کا سبب ہے۔ ریحان حسن کی زبان سلیس ہے اور سادہ وفصیح ہے۔ ممتاز مفتی کی خدمات کو منظر عام پر لانا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ مصنف نے اس کو بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ امید ہے کہ متبصرہ کتاب اکتسابان علم کے لیے سودمند اور ادبی مساکن میں مشتہر ہوگی۔

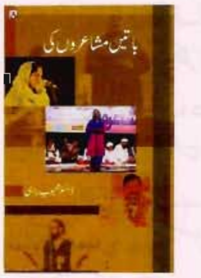

باتیں مشاعروں کی

مصنف: ڈاکٹر محبوب راہی

صفحات: 192، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013

ناشر: اوراق پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: محمد احسن، 504 / 29، وسیم لاج، شباب مارکیٹ، لکھنؤ

مشاعروں کی اہمیت ماضی میں کیا تھی اور حال میں کیا ہے، اس سے زبان وادب کا ادنی طالب علم بھی واقف ہے۔

'باتیں مشاعروں کی' 18 مضامین اور 3 نظموں پر مشتمل محبوب راہی کی ایسی تصنیف ہے جس میں مشاعروں کے زوال، متشاعروں کے کمال، منتظمین کے جمال اور نظما کے جلال کی داستانیں دہرائی گئی ہیں۔ صاحبِ کتاب بذاتِ خود مشاعروں کے 'شریکِ کار' رہے ہیں، اس لیے کتاب میں جابجا 'آپ بیتی' اور 'آنکھوں دیکھی' کا بیان دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

کتاب کا پہلا مضمون 'مشاعروں کے تعلق سے میرے دلچسپ تجربات' اور دوسرا مضمون 'مشاعرے صدارت نظامت' ایک دوسرے کا اجمال بھی ہیں اور تفصیل بھی۔ کچھ یہی صورت 'منور رانا کی تخلیقی شناخت کے چند روشن پہلو' اور 'بین الاقوامی مشاعروں میں مغربی بنگال کا نمائندہ منوّر رانا' میں پیش آئی ہے۔ معمولی ترمیم کے ساتھ پورے پورے پیراگراف ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ نقل (copy) کردیے گئے ہیں۔ عمر ڈھلنے کے ساتھ انسان خود کو دہرانے لگتا ہے، لیکن ایک زودنویس اور کثیر التصانیف قلم کار کے یہاں ایسی بداحتیاطی سخت صدمہ پہنچاتی ہے۔ گمان پڑتا ہے کہ جیسے ہر 'لاشے' کے لیے ایک سے 'اجزائے کفن' پیش تر تیار رکھے گئے ہوں، جس مزاج کا اور جس خدوخال کا 'لاشہ' آیا، وہی 'جز' زیبِ تن کردیا۔ نیاز فتح پوری اسے 'ادبی پھوہڑپن' سے موسوم کرتے تھے۔

نفسِ مضامین کے اعتبار سے کتاب کو اپنے نام سے مناسبت بھی محض جزوی ہی ہے، اس لیے کہ شروع کے دو مضامین میں تو مشاعروں کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے، بقیہ مضامین یا تو فرمائشی ہیں یا کسی کتاب کے دیباچے اور مقدمے کے طور پر لکھے گئے ہیں، البتہ تمام تر شعرا کا تعلق مشاعروں سے ضرور ہے۔ اس فہرست میں عالمگیر شہرت یافتہ شعرا کا بھی تذکرہ ہے اور نسبتاً کم معروف شاعروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ملک زادہ منظور احمد کی شخصیت کا احاطہ تین مضامین (شہرِ سخن، شہرِ ادب اور رقصِ شرر) کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ راحت اندوری پر لکھا گیا مضمون حاصلِ کتاب ہے۔

'مشاعرہ اور تحقیق دونوں میدانوں کا شہسوار۔ ڈاکٹر جلیل الرحمن جلیل برہان پوری' پڑھ کر نہ جانے کیوں مجھے ڈاکٹر جلیل مظلوم سے نظر آئے اور شدت سے یہ محسوس ہوا کہ مضمون زبردستی لکھا گیا ہے۔ مذکورہ بالا شعراء کے علاوہ اختر آصف برہان پوری، اقبال خلش، عظیم وقار، نعیم فراز، سفیان قاضی اور شمیم فرحت وغیرہ کے فن وشخصیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ نومشقوں کی محض حوصلہ افزائی کے لیے راہی زمین وآسمان کے قلابے ملادینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ تقریباً ایسا ہی معاملہ اردو اور فارسی الفاظ کی تراکیب کے صَرف کے ساتھ بھی ہے۔ ڈاکٹر راہی بے تکان غیر مربوط، غیر مناسب اور لاتعلق الفاظ کو اضافی صورت سے ترکیب میں ڈھال لیتے ہیں، بعض مرتبہ تو ایسی ترکیبیں بے انتہا بھونڈی اور بے معنی سی محسوس ہوتی ہیں۔

پروف کی غلطیاں بہت ہیں، صاف محسوس ہوتا ہے کہ پروف ریڈنگ کی زحمت نہیں کی گئی اور یہ غلطیاں اس وقت تکلیف دہ ہوجاتی ہیں جب واقعاتی تضاد سامنے آتا ہے مثلاً صفحہ 119 کی یہ عبارت ''1 اکتوبر کو دورانِ سفر ممبئی کے ایک اردو اخبار میں مراسلات کے کالم میں ایک نہایت مختصر مراسلہ اختر آصف برہان پوری کے انتقالِ پرملال کے تعلق سے پڑھ کر دل کو دھچکا سا لگا۔'' اور پھر چند سطروں کے بعد ہی موصوف تحریر فرماتے ہیں ''16 اکتوبر کو اختر آصف اس خودغرض اور ابن الوقت دنیا سے منہ موڑ چکے تھے''۔

ذیل کے چند جملے پڑھ کر فیصلہ کریں، کیا اس طرح کی غلطیاں ان کی شان کے خلاف نہیں ہیں۔

- ❖ میرا کچھ عرض کرنا سورجوں کو چراغ کے دکھلانے کے مترادف ہوگا۔ (ص: 51) ڈاکٹر موصوف تبدیلیِ صیغہ سے متعلق نہ جانے کس زبان کا قاعدہ لے آئے ہیں۔
- ❖ اپنے شب وروز کے احوال جس شرح وبسط، تفصیل وترتیل اور کلیات وجزئیات کے ساتھ موصوف نے بے کم وکاست بیان کیے ہیں۔ (ص:56، یہاں لفظ 'ترتیل' محلِ نظر ہے)
- ❖ مبارزت طلب مجاہدانہ آواز اور ہر بڑا کر جگادینے والے بلالی انداز سے قلب وجگر کا شکار کرنے والا۔۔۔۔۔۔۔ (ص:97، اب تک تو ہڑبڑا کر اٹھنا ہی پڑھتے سنتے آئے تھے)
- ❖ دیگر ادبی پروگراموں کے ساتھ ایک کُل ہند مشاعرہ بھی منعقد کروایا (ص:112) 'منعقد کروایا' اہل علم کی زبان نہیں ہے۔
- ❖ مائک پر اچھے اچھوں کی گھگھی بند ہورہی تھی (ص:112) خلاف ازمحاورہ ہے۔
- ❖ اس کی فکرونظر کے چراغ اس کے اشعار کی شکل میں برسوں حافظوں کو مہکاتے رہیں گے (ص:125، چراغ روشنی دیتے ہیں یا مہک؟)
- ❖ جدیدیت کی لایعنیت اور ابہام واہمال کی دھول بھی اب تھم چکی ہے (ص:180)

متذکرہ بالا معروضات کے علاوہ راہی صاحب نے بعض ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو کم ازکم میرے علم کے مطابق اُردو قواعد کی رُو سے درست نہیں ہیں، مثلاً اضلاعی، معیارات،

سوچوں، اور طنز آلودہ وغیرہ۔ ان چند فروگزاشتوں کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو کتاب قابلِ مطالعہ ٹھہرتی ہے۔

کرشن چندر کے ناولوں میں سماجی شعور

ناشر و مصنف: ڈاکٹر انور شفیق اعظمی
صفحات: 331، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2013
مبصر: ارشاد قمر
روم نمبر 429، مان سرور ہاسٹل، دہلی یونیورسٹی، دہلی

ڈاکٹر انور شفیق اعظمی کی زیرِ نظر کتاب دراصل ان کے پی، ایچ، ڈی کا مقالہ ہے جس کو انھوں نے کتابی شکل دے دی ہے۔ یہ کتاب فخر الدین علی احمد میموریل کمیٹی اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ موصوف نے جس طرح اپنے پی، ایچ، ڈی کے کام کی ابواب بندی کی تھی اسی ترتیب کو اپنی اس کتاب میں بھی برتا ہے۔ کتاب سات ابواب میں منقسم ہے پہلے باب میں کرشن چندر کے خاندانی حالات، بچپن، تعلیم، ملازمت کے علاوہ تصنیفی اور ادبی سرگرمیوں کا احاطہ کرنے کوشش کی گئی ہے۔ دوسرے باب کرشن چندر تک کے بیشتر اہم ناول نگاروں کی تخلیقات میں پیش کیے گئے سماجی شعور پر ہے۔ ہمارے ادیب ہمیشہ کوشاں رہے کہ سماج نکھرے اور سنورے۔ معاشرے میں ہونے والی ہر طرح کی تبدیلی اور بدلاؤ کو فنکار شدت سے محسوس کرتا ہے اور اسے ادب میں پیش کر دیتا ہے کرشن چندر نے بھی اس کو اپنی نگارشات میں برتا ہے۔ تیسرے باب میں کرشن چندر کے ناولوں میں ان مختلف سماجی طبقوں، علاقوں اور گروہوں کے معاشی مسائل پر روشنی ڈالی ہے جو اپنی بے راہ روی کی وجہ سے معاشرتی پریشانیوں میں مبتلا رہتے ہیں یا جھوٹی شان و شوکت کا شکار ہو کر اپنی اور اپنے کنبے کی مالی اور اقتصادی پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں۔ چوتھے باب میں مصنف نے کرشن چندر کے ناولوں کے حوالے سے اس وقت کی دیہی زندگی کی بیشتر سرگرمیوں کا احاطہ کرنے کی جانفشانی کی ہے۔ کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں ایک طرف دیہی زندگی کے مختلف مسائل مثلاً دیہات میں رہنے والے نچلے طبقے کے لوگوں کسانوں اور مزدوروں کی غربت، جہالت، سادہ لوحی وغیرہ کو پیش کیا ہے تو دوسری طرف ہندوستان کے مہاجن لوگ، زمیندار اور سرکاری عملے کی زیادتیوں اور بربرتیوں کا ذکر بڑے ہی خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ پانچویں باب میں خواتین کو درپیش چیلنجز اور روزمرہ کی زندگی میں جن آلائم و مصائب سے وہ دوچار ہوتی ہیں ان سب کا ذکر بڑے ہی عمدہ طریقے سے کیا ہے۔ کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں ہر طبقے کی خواتین کے مسائل کو جگہ دی ہے۔ خواہ وہ اعلی طبقے سے تعلق رکھتی ہوں یا کسی نچلے طبقے کی جھونپڑی یا فٹ پاتھ پر رہنے والی ہوں۔ ایک طرف انھوں نے شہروں میں تعلیم یافتہ لڑکیوں کے حالاتِ زندگی کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے تو دوسری طرف گاؤں میں رہنے والی غریب اور جاہل عورتوں کو بھی انھوں نے موضوعِ بحث بنایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے طوائفوں اور گری پڑی عورتوں کی زندگی کی عکاسی بھی کی ہے اور ان اسباب وعلل پر بھی روشنی ڈالی ہے جن کی وجہ سے وہ زندگی کی غلط راہوں پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتی ہیں کرشن چندر نے خواتین کے مسائل کو بڑے ہی حقیقت شعار انداز میں سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے انھوں اپنے ناولوں کے ذریعہ عورت اور لڑکی کی مظلومیت کو اتنے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے کہ انھیں پڑھتے ہوئے قارئین کی عورتوں سے ہمدردی بڑھنے لگتی ہے انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعہ خواتین کو انصاف، عزت، آزادی اور ان کے حقوق کو دلانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ چھٹے باب میں طبقاتی کشمکش و بیخ کنی کے کام کو بڑے ہی سلیقہ سے نمٹانے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ خود کرشن چندر کے خمیر میں انسان دوستی کا عنصر نمایاں دکھائی دیتا ہے اور بار بار قاری کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ انسانوں کے درمیان مذہب، زبان، علاقہ، ذات، برادری، رسم و رواج اور نسل کے نام پر کوئی تفریق نہیں ہونی چاہیے اور ساتویں باب میں اس بات کو ملحوظ خاطر رکھا ہے جو کہ ہندوستان کا ایک حصہ بن چکا ہے اور وہ ہے فرقہ واریت جس کی زد میں پورا ہندوستان ہے۔ اردو زبان و ادب کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو قلم کاروں نے ملکی و سماجی مسائل کے ساتھ فرقہ پرستی اور مذہبی تنگ نظری کے خلاف بھی آواز بلند کی ہے یہ ہمیشہ قومی یکجہتی پر زور دیتے رہے ہیں سدا وطن اور ملک کی خوشحالی کے گیت گائے ہیں۔ چھٹا اور ساتواں باب تقریباً ایک جیسا ہے فرق صرف اتنا ہے کہ طبقے کے بجائے اس باب میں مذہب اور فرقے کے نام پر ہونے والی تفریق اور تنگ نظری کو نشانہ بنایا ہے۔ مختصر یہ کہ کرشن چندر کے ناولوں نے نہ صرف اردو زبان و ادب کے دامن کو وسیع تر کیا بلکہ پورے ہندوستانی معاشرے کی خامیوں اور خوبیوں کو بھی اجاگر کیا ہے تقریباً نصف صدی تک ان کی تحریریں اپنی انفرادیت اور ہمہ گیر خوبیوں کی وجہ سے عوام وخواص میں مقبول رہی ہیں اور آئندہ بھی ان کی تحریروں کی معنویت باقی رہے گی کیونکہ ان میں عوامی مسائل کو نہایت فطری انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

انور شفیق نے بڑی دقت طلبی، محنت شاقہ اور جانفشانی کے ساتھ کرشن چندر کے گہرے سماجی شعور کو ناولوں میں تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ حتی المقدور ان کے ناولوں میں ہر طرح کے کرداروں کا تفصیلی جائزہ لینے کی جسارت کی ہے۔ جبکہ سچی بات یہ ہے کہ کرشن چندر جس قدر مقبولیت کے بامِ عروج پر اپنی کمندیں ڈالی ہیں اسی قدر معتوب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن وقت کا تقاضہ کچھ اور ہی ہے وہ یہ کہ تمام تر تعصّبات کو پس پشت ڈال کر کرشن چندر کے سرمایۂ ادب کو از سرِ نو دریافت کیا جائے اور اسے مناسب و معقول مقام دیا جائے۔ اس کارِ خیر میں انور شفیق کا یہ تحقیقی و تنقیدی مقالہ معاون و ممد ثابت ہوا اور ادبی حلقوں میں وہ مقبولیت ملے جس کا وہ کما حقہ مستحق ہے۔

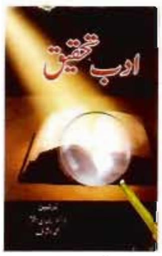

ادب تحقیق

مرتبین: ڈاکٹر رحمان اختر
صفحات: 208، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2013
ناشر: تخلیق کار پبلشرز، لکشمی نگر، نئی دہلی 92
مبصر: ڈاکٹر منظور حسن، سکریٹری پنجاب اردو اکادمی،

اردو کے مشہور محقق اور ماہر لسانیات حافظ محمود شیرانی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'پنجاب میں اُردو' میں اُردو کی پرورش و پرداخت کا رشتہ پنجاب سے جوڑ کر اس کے ادبی مقام کو جو سربلندی عطا کی ہے وہ قابلِ تحسین ہے کیونکہ پنجاب نے تقسیمِ وطن سے قبل تک اردو زبان و ادب کی جس ڈھنگ سے خدمت کی اسے اگر حیرت انگیز کارنامہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سرزمینِ پنجاب سے اردو شعر و ادب کے سرمائے کو بھرپور ڈھنگ سے مالا مال کرنے کی ہمیشہ سے ہی ڈھیروں کوششیں رہی ہیں مگر اب اس وقیع اور نہایت اہم سرمائے کا از سرِ نو جائزہ لینے کے لئے تحقیق و جستجو کے اچھے خاصے دروازے وا کرنے میں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ (پنجاب) کے شعبۂ فارسی، اردو و عربی نے صوبہ کی دیگر یونیورسٹیوں پر سبقت لے رکھی ہے اس لحاظ سے مذکورہ شعبہ واقعی مبارکباد کا مستحق ہے جو اپنی فعالیت کے لیے ایک شناخت قائم کر چکا ہے۔ اب تک اس شعبے میں پی ایچ ڈی کے کم وبیش 21 اور ایم فل کے 3 کے قریب مقالے لکھے جا چکے ہیں اور تقریباً اتنے ہی تحقیقی مقالے تحقیق و تنقید کے مختلف مراحل سے گزر رہے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب 'ادب تحقیق' میں سابق صدر شعبۂ فارسی، اردو وعربی پروفیسر ڈاکٹر محمد جمیل کا مضمون بعنوان 'شعبۂ فارسی اردو کا تحقیقی سفر' ہر لحاظ سے ایک مکمل اور معلومات افزا مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے پنجابی یونیورسٹی کے تعارفی خاکے کے بعد شعبۂ ہذا میں ہوئے تحقیقی کام کی ایک مکمل کارکردگی کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ شعبہ کی حصولیابیوں پر واقعی رشک ہوتا ہے۔

اردو ادب کے شاید ہی کوئی ایسی صنف ہوگی جو ابھی تک تحقیقی مرحلے تک نہ گزری ہو۔ اس طرح تحقیقی موضوعات کے اندر جو گونا گوں رنگارنگی جگہ بہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے نیز ہر تحقیقی مقالہ اپنے آپ میں موضوع اور مواد کے لحاظ سے بے حد متاثر کرتا ہے۔ تحقیقی تقاضوں کو مدِ نظر رکھ کر لکھے گئے یہ مختلف مقالے قاری کے فکر وخیال پر اہم اثرات مرتب کرنے کی بھر پور صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کتاب میں شعبۂ ہذا کے استاد ڈاکٹر رحمان اختر اور سینئر ریسرچ اسکالر محمد اشرف نے کم وبیش 21 مقالوں کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے مقالے بھی شامل کیے ہیں جن سے مذکورہ کتاب 'ادب تحقیق' کی قدر و قیمت اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کیونکہ سبھی مقالے بڑی جانفشانی اور تحقیق و تنقید کے معیاری اصولوں اور تقاضوں کے پیشِ نظر لکھے گئے ہیں۔ سبھی مقالہ نگاروں کے لکھے گئے مقالے اس جادو کی مانند ہیں جو واقعی سر چڑھ کر بولنے کی صلاحیت رکھتے ہیں مزید برآں خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ لائق وفائق اساتذہ ان نوجوان ریسرچ اسکالرز کو تحقیقی میدان میں انگلی پکڑ کر چلنا سکھا رہے ہیں۔ ان اساتذہ کی انھیں مکمل تعاون اور سرپرستی حاصل ہے، کہا جا سکتا ہے کہ شعبہ کے اساتذہ اور شاگرد فکر وآگہی کی ایک ایسی کشتی میں سوار ہیں جو تحقیق و جستجو کی نئی راہیں تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں۔ دونوں شعر وادب کے بحرِ بیکراں میں لعل وگوہر نکال کر ادب اور ادبی دنیا کی خدمت کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔

المختصر اس طرح کے تحقیقی کام کی ضرورت جہاں سبھی اردو طالبِ علموں کے لیے ہے وہیں نئے تحقیق کاروں کے لئے بھی ناگزیر ہے، اس طرح یہ کتاب (ادب تحقیق) یقیناً ہر اردو طالبِ علم کے لئے بڑی اہم اور مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔ لہٰذا اس کتاب کی جتنی بھی ادبی وعلمی حلقوں میں پذیرائی ہو وہ کم ہے کیونکہ سچ بات تو یہ ہے کہ اس طرح کا کارنامہ ادبی دنیا میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

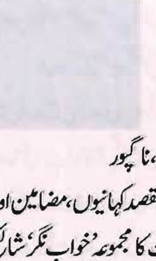

گپ شپ

مصنف: ڈاکٹر محمد اسد اللہ

صفحات: 40

ناشر: 30 گلستان کالونی، جعفر نگر، ناگپور 440013

مبصر: ڈاکٹر غیاث الرحمن، 10 گلستان کالونی، نزد پانڈے امرائی لان، ناگپور

'گپ شپ' بچوں کے لیے ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی دلچسپ اور بامقصد کہانیوں، مضامین اور ڈراموں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل بچوں کے لیے ان کی منظومات کا مجموعہ 'خواب نگر' شائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر محمد اسد اللہ انشائیہ نگاری کے ساتھ بچوں کے ادب کی طرف مائل ہونے والے اس علاقے کے معروف قلم کار ہیں۔ ان کی تحریر کی شگفتگی وہاں جو ہے یہاں بھی برقرار ہے۔

طالب علمی کے زمانے سے وہ انشائیہ نگار کی حیثیت سے ادبی دنیا سے متعارف ہوئے۔ اس زمانے سے انھوں نے بڑی سرعت کے ساتھ انشائیے تخلیق کیے، جو ہندو پاک کے معروف رسائل خصوصاً اوراق، تخلیق اور ادبِ لطیف جیسے رسائل میں شائع ہوئے۔ وزیر آغا اور انور سدید نے انھیں تخلیقی انشائیہ نگار تسلیم کرتے ہوئے ہندو پاک کے ممتاز انشائیہ نگاروں میں شامل کیا۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ کی تصانیف میں جمالِ ہمنشیں، دانت ہمارے (تراجم)، ہوائیاں، پر پرزے، اور بوڑھے کے رول میں (انشائیے) اور صبح زرنگار وغیرہ شامل ہیں۔

ذریعۂ معاش کے لیے انھوں نے مدرسی کا پیشہ اختیار کیا۔ ان کا واسطہ قوم کے نونہالوں اور نوجوانوں سے ہوا۔ وہ چونکہ ایک دیانت دار مدرس ہیں، انھوں نے اپنے شاگردوں کے مسائل، ان کی ضرورت اور فطرت اور ان کی نفسیات کے علاوہ ان کے تعلیمی نصاب اور وہ ادب جو ان کے نام سے شائع ہو رہا ہے، اس کا گہرا مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ اس بات کا اندازہ لگایا کہ یہ ان کے لیے کتنا مفید، موزوں ہے۔ انھیں احساس ہوا کہ اس میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ انھوں نے بچوں کے تمام مسائل اور ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے بچوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔ کہانیاں لکھیں، ڈرامے لکھے (ان ڈراموں کو اسٹیج پر پیش کیا) نظمیں لکھیں اسکول میں مختلف جلسے اور پروگرام منعقد کروائے اور بچوں کی تربیت کی بھرپور امکانی کوشش کرتے رہے۔ ان کی تخلیقی سوچ وفکر کا دائرہ وسیع ہوتا گیا۔ ان کا تخلیقی سفر نئی نئی سمتیں اور راہیں اختیار کرتا گیا۔

جہاں تک بچوں کے ادب کا تعلق ہے آج کل شعری ونثری کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بہت تیزی سے جاری ہے۔ قومی کونسل اور صوبائی اردو اکاڈمیز کی طرف سے دی جانے والی مالی اعانت سے ان کی اشاعت میں اور تیزی آ گئی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں بچوں کے لیے ادب کا انبار لگ گیا ہے۔ دانشوروں اور ماہرینِ تعلیمات کی جانب سے آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ یہ ادب جو 'ادب اطفال' کے نام پر شائع ہو رہا ہے ان کے لیے کتنا ضروری اور فائدہ مند ہے؟ بچوں کی ضروریات، ان کی نفسیات اور دلچسپی کے مطابق بھی ہے یا نہیں! سید صفدر اور اشفاق انجم نے اس موضوع پر جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ اس تناظر میں ڈاکٹر محمد اسد اللہ کا تخلیق کردہ ادب بچوں کے لیے ایک شعوری کوشش ہے۔ مواد زبان اور فنی خوبیوں سے آراستہ ان کی کہانیاں بچوں کے لیے نہایت موزوں ہیں اور ان کی دلچسپی اور نفسیات کو سامنے رکھ کر تخلیق کی گئیں۔ ان کہانیوں کا درجہ بچوں کے ادب میں متعین کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالرحیم نشتر نے کتاب کے دیباچے میں لکھا ہے:

آج کل کہانی کے نام پر عجیب وغریب تحریریں پڑھائی جا رہی ہیں لیکن جو لوگ گپ شپ میں شامل کہانیوں کا مطالعہ کریں گے وہ انھیں ان کے ہنر کی داد دیے بغیر نہیں رہیں گے۔ برسوں بعد بچوں کی کہانیوں کا تخلیقی مجموعہ سامنے آیا ہے۔

گپ شپ کی تمام مشمولات بامقصد تحریریں ہیں۔ بچوں کے لیے نہایت سبق آموز اور اخلاقی درس موجود ہے۔ ان میں بعض مسائل جو بچوں کے لیے لکھے گئے ہیں۔ دراصل قومی مسائل ہیں جنھیں ملک گیر پیمانے پر حل کرنے کی ضرورت ہے۔ مثلاً 'جی میاں کی کہانی' میں دیکھیے کتنے جی میاں شہروں، قصبوں اور گاؤں میں آپ کو مل جائیں گے جن میں نہ کچھ کرنے کی صلاحیت ہے نہ ہمت نہ حوصلہ ساری زندگی بیچارگی میں دوسروں کے رحم وکرم پر گزار دیتے ہیں۔ ان کو سہارا دینے کی ضرورت ہے اور ایسا پنجرہ فراہم کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ محفوظ رہ پائیں اور عزت وآبرو کی زندگی اس دنیا میں گزار سکیں۔ ڈاکٹر اسد اللہ نے جی میاں کی کہانی لکھ کر دراصل اس اہم قومی مسئلہ کی طرف نشاندہی کی ہے۔

گپ شپ اسی صفحات پر مشتمل سادہ جلد کے ساتھ عمدہ کاغذ اور صاف ستھری کتابت اور طباعت سے مزین کتاب ہے اس کا سرورق پہلی کہانی جی میاں کے پسِ منظر میں مصنف کے چھوٹے بیٹے محمد انس نے تیار کر کے اپنی آرٹسٹک صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کی کمپوزنگ توصیف احمد نے کی ہے۔ یہ کتاب بچوں کے لیے نہایت موزوں اور مفید تحفہ ہے۔ یہ کتاب ہر گھر میں رہنا چاہتے ہیں جہاں بچے رہتے ہیں اور اسکول جاتے ہیں۔■

عالمی اردو نامہ

یحییٰ نشیط

چند سیپیاں سمندروں کی

(پروین شیر کا ایک تخلیقی سفرنامہ)

’’قدرت کے سب نادر شاہ کاروں کو، اس خوبصورت دنیا کی تمام وسعتوں کو محدود آنکھیں کہاں دیکھ سکتی ہیں؟ یہ ایک ضخیم ناول کی مانند ہے۔ سمندروں پر تحریر کردہ سب لہروں کو، زمین پر کھلے ہوئے سب پھولوں کو، ہواؤں پہ رقم کی ہوئی تمام خوشبوؤں کو اور آبشاروں پہ لکھے ہوئے سارے نغموں کو یہ محدود آنکھیں کہاں پڑھ سکتی ہیں؟ ایک عمر اس ضخیم کتاب کے مطالعے کے لیے کہاں کافی ہے؟ صرف چند صفحات ہی تو پڑھے جا سکتے ہیں۔ یہ آنکھیں جو کھُلتے ہی تجسس کی بانہوں سے لپٹ گئیں، بے چین ہو گئیں، بے خبری کو آگہی میں بدلنے کی خواہاں ہو گئیں۔

قدرت کے نگار خانے کو دیکھ لینے کی تمنا۔ اتھاہ سمندروں سے آگہی کی سیپیاں چن لینے کی دیرینہ خواہش۔ افق افق سے نظروں کے دامن میں چاند اور سورج سمیٹنے کی خواہش، جن کی کرنیں علم کو زرافشاں کر دیں۔ جن کی روشنی مشعل راہ بنے۔ لیکن زمین کی یہ ضخیم کتاب مکمل پڑھ لینا کہاں ممکن ہے۔ کبھی کبھی، کسی ورق سے کچھ پیراگراف پڑھنے کی اجازت دیتی ہے یہ زندگی۔‘‘ (چند سیپیاں سمندروں سے: پروین شیر، ص 17)

اردو میں سفرنامہ نگاری کی تاریخ نہ زیادہ قدیم ہے نہ مغربی ادب کی نقالی ہے۔ اردو کا پہلا سفرنامہ یوسف خان کمبل پوش حیدرآبادی کا ’سفرنامہ عجائبات فرنگ‘ ہے۔ یہ 1847 میں ’تاریخ یوسفی‘ کے نام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں کلکتہ سے انگلستان تک کے بحری سفر کی روداد بیان ہوئی ہے۔ افریقہ کے سفر کی روداد ’منگو پارک کے سفرنامہ افریقہ‘ میں پیش کی گئی ہے۔ افریقہ کی روداد بیان کرنے والا یہ پہلا سفرنامہ ہے لیکن یہ انگریزی سے کیا ہوا اردو ترجمہ ہے۔ افسوس کہ اس سفرنامے

کے اردو مترجم کا نام آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ 1850 سے آج تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

سفرنامہ لکھنے کی روایت اردو میں مردوں کی طرح خواتین نے بھی قائم کی ہے۔ چنانچہ مولانا عبیداللہ عبیدی کی دختر اور سر زاہد سہروردی کی اہلیہ خجستہ اختر نے 1910 میں مسٹر اووڈ کے سفرنامے کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ بیسویں صدی کا پہلا مترجم سفرنامہ ہے، جو نسائی تحریر کا عمدہ نمونہ ہے۔ اس مترجم سفرنامے سے قبل اردو میں نازلی رفیعہ بیگم، ’سیر یورپ‘ کے عنوان سے ایک سفرنامہ لکھ چکی تھیں۔ یہ سفرنامہ 1908 میں لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اردو کے نسائی ادب میں اس سفرنامے کو اولیت حاصل ہے۔ اردو میں اس سے قبل کسی خاتون نے سفرنامہ نہیں لکھا تھا۔ بیسویں صدی کے ربع اول میں خواتین کے لکھے ہوئے بعض اہم سفرنامے منظر عام پر آئے تھے۔ ان میں شاہ بانو کا ’سیاحت سلطانی‘، نازلی رفیعہ سلطان بیگم کا ’سیر یورپ‘، نواب سلطان جہاں بیگم کا ’سفرنامہ حجاز و مصر و شام‘، عطیہ فیضی کا ’زمانہ تحصیل‘، صغریٰ بیگم حیا کا ’سفرنامہ یورپ‘ اور نشاط النساء بیگم کے سفرنامے بڑے اہم ہیں۔ بعد کی خواتین سفرنامہ نگاروں میں سلطانہ آصف علی، قرۃ العین حیدر، رضیہ اکبر، صالحہ عابد حسین، بشریٰ رحمن، صغرا مہدی، اے امیر النسائ، سعدیہ دہلوی وغیرہ کے سفرنامے اپنی علاحدہ شناخت رکھتے ہیں۔ آزادی کے بعد مختلف وجوہ سے مہاجرت اختیار کرنے والی بعض خاتون مصنّفین نے بھی سفرنامے لکھے ہیں۔ ان میں جرمنی میں مقیم نعیمہ ضیاء الدین کا سفرنامہ ’شہر پری تمثال‘ اور ابھی حال (2014) میں شائع ہوا پروین شیر کا سفرنامہ ’چند سیپیاں سمندروں سے‘ نہایت وقیع ہیں۔

’میں کیوں لکھتی ہوں؟‘ کے ضمن میں انھوں نے مایا انجیلو کے اِن الفاظ سے اپنے خیالات و تجربات سے مطابقت کی نشاندہی کرتے ہوئے سفرنامے کی پیش روی کی ہے:

’’ایک چڑیا اس لیے نہیں گاتی کہ اُس کے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ وہ اس لیے گاتی ہے کیونکہ اس کے پاس نغمے ہیں۔‘‘

’’اس سے زیادہ تکلیف دہ اور کچھ نہیں کہ اپنے اندران کہی کہانیاں اندر ہی رہ جائیں۔‘‘

پروین شیر نے یہاں ان جینوئن تخلیقی فن کاروں کی نمائندگی کی ہے جو ہمیشہ تخلیقیت سے سرشار ہوتے ہیں، اظہار اُن کی مجبوری ہوتی ہے۔ کبھی وہ پوری آواز سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں کبھی بہت سے خاموش گوشے درمیان میں چھوٹ

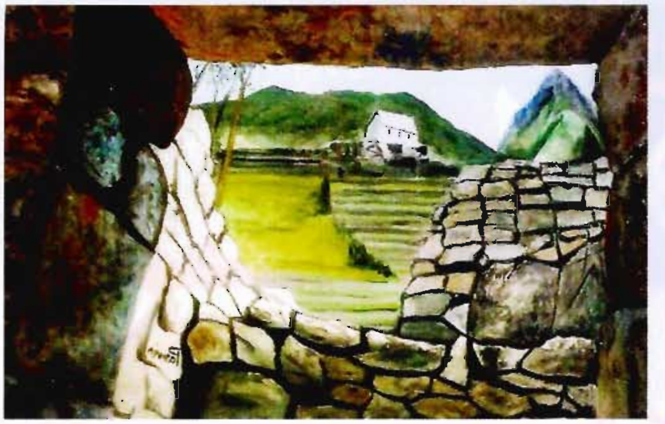

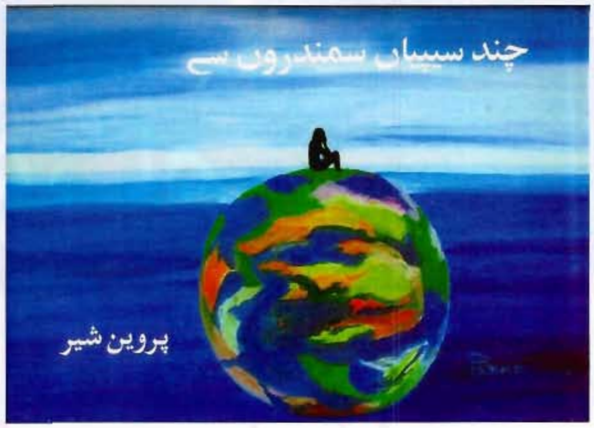

جاتے ہیں۔ بہت کچھ کہنے کے بعد بھی بہت کچھ اَن کہا رہ جاتا ہے اور یہ اَن کہا ہمیشہ ان کے اندرون میں اضطراب پیدا کرتا رہتا ہے۔ اسی لیے ہر فن کار روحانی سطح پر بے چین اور نا آسودہ ہی رہتا ہے۔ پروین شیر اپنے پورے وجود کے ساتھ اظہار کے درپے ہیں لیکن 'اَن کہی' کی ایک ایسی دنیا ان کے اندر موجیں مارتی رہتی ہے جو کبھی شاعری میں لفظوں کی شکل میں ہمارے سامنے آدھمکتی ہے، کبھی رنگوں اور خطوط کی زبان میں ہم سے خطاب کرنے لگتی ہے اور کبھی سفرنامے میں ایک auto-fiction کا روپ دھار لیتی ہے۔ پروین شیر نے اپنے تخلیقی عمل اور اس کے محرکات کے سلسلے میں جو باتیں کہی ہیں ان کا حوالہ پروین کی ذہنی ساخت اور ان کے زندگی کے تئیں رویے کو سمجھنے میں کلید کا حکم رکھتا ہے۔ وہ کہتی ہیں:

"دنیائے بیروں میرے لیے دنیائے دروں تخلیق کرتی ہے۔ یہ نئی بصیرت اور بحرِ محسوسات مہیا کرتی ہے۔ لامتناہی خلا کی گود میں ہمارا بے چین، چکراتا ہوا سیارہ... زمین، اور ہزاروں ستاروں کے جال، لاکھوں سوالات سے میرے ذہن کو الجھاتے ہیں۔ زندگی اور پرے زندگی کے اسرار، ربط اور بے ربطی، قدرت کے ساتھ عیاں اور نہاں تعامُل، زندگی کا تنوع اور دوہرے معیار کے متعلق مجھے سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ہمارے سیارے... زمین کے چہرے پر کہیں سیاہ دھبے ہیں کہیں گلابی چمک۔ یہ سب اُس ضرورت کو کریدتے ہیں کہ میں اپنی سوچ میں قاری کو شامل کروں۔ میرا قلم دل کے سمندر سے احساسات کے قطرے باہر انڈیل دیتا ہے۔ یہ مجھے ذات کی پاکیزگی اور قدروں کی سرفرازی سے آگاہ کرتا ہے۔ جب میں لکھتی ہوں تو داخلی اور خارجی، دونوں دنیاؤں کے سمندروں سے موتیوں والی سیپیاں چنتی ہوں جن کی مدد سے یہ تقویت ہوتی ہے کہ میرے قاری ان کہی سُن رہے ہیں، ان دیکھا دیکھ رہے ہیں، جو محسوس نہیں کیا وہ محسوس کر رہے ہیں، کٹے ہوؤں سے جُڑ رہے ہیں، جو نہیں سوچا وہ سوچ رہے ہیں۔"

(چند سیپیاں سمندروں سے، ص 8)

پروین شیر کناڈا میں مقیم ایسی ادیبہ ہیں جو فنِ مصوری سے آشنا ہیں، اچھی شاعرہ ہیں اور سیر و سیاحت کی شوقین بھی ہیں۔ مغربی ممالک میں وہ اپنی آبی اور روغنی پینٹنگز کے لیے مشہور ہیں۔ رنگ و روغن کا اتصال ان کی پینٹنگز کو ایسی صورت عطا کرتا ہے کہ تصویر ذی روح مجسمہ دکھائی دیتی ہے۔ اردو فارسی تہذیب میں شاعری کو مصوری سے اور مصوری کو شاعری سے مربوط کرنے کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ پروین شیر نے بھی اس روایت کو اپنایا ہے۔ 'کرچیاں' اور 'نہال دل پر سحاب جیسے' شعری مجموعے اس کی مثال ہے جس میں نطق و بصارت کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے، لیکن کمال تعجب یہ ہے کہ مصنفہ نے اپنے سفرنامے میں نثر کو بھی مصوری سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔

پروین شیر کا یہ سفرنامہ اس لیے اہم ہے کہ اس میں جنوبی نصف کرہ کے دو اہم براعظموں کے جنوبی خطوں کے سفر کی روداد ہے۔ اردو میں تا حال ان خطوں کی سیر کے واقعات قلم بند نہیں ہو سکے۔ پروین شیر نے جنوبی افریقہ کی گزشتہ ڈھائی تین سو برس قبل کی تاریخ اور جنوبی امریکہ کے خطہ پیرو کی قدیم

پروین شیر کی سیاحتی روداد سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ انہیں شہروں کے طمطراق، ہنگاموں، شہروں کی سڑکوں اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے ریستورانوں اور ہوٹلوں کی چمچماتی روشنی سے کوئی سروکار نہیں بلکہ گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی کچی سڑکوں، تنگ گلیوں اور بد رنگ چھوٹے گھروں میں ننگے پائوں، بوسیدہ کپڑوں میں کھیلتے بچوں، پژمردہ چہرہ بوڑھوں اور مفلوک الحال نوجوانوں کی تاریک زندگی کے پیش و پس سے غرض ہے

تہذیب اور وحشی تمدن میں جھانکنے کی کوشش کی ہے۔ یہ سفر نامہ اس لیے بھی اہم ہے کہ پروین شیر کی یہ "سیاحت برائے تفریح نہیں برائے تعلیم ہے۔ یہ مختلف ممالک کے چہروں پر غازے کا ملمع دیکھنے کے لیے نہیں غازے کے اندر چھپی ہوئی جلد دیکھنے کے لیے ہے۔" مصنفہ نے گوروں کے ہاتھوں سیاہ فاموں پر ڈھائے گئے مظالم کے مرتسم نقوش کو ان کے جسموں پر نہیں، روح کی گہرائیوں میں تلاش کرنے کے لیے سفر کیا ہے۔ پروین شیر Alex Haley کے ناول Roots میں بیان کردہ مظالم کے تاریخی حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے جنوبی افریقہ جاتی ہیں۔ انھیں جوہانس برگ کی سونے کی کانوں سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ اس سرزمین کو دیکھنے کی خواہش ہے جہاں انسانوں پر مظالم ڈھانا اور تشدد روا رکھنا قانوناً جائز اور رائج ہے۔ پروین شیر کی سیاحتی روداد سے یہ منکشف ہوتا ہے کہ انھیں شہروں کے طمطراق، ہنگاموں، شہروں کی سڑکوں اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والے ریستورانوں اور ہوٹلوں کی چمچماتی روشنی سے کوئی سروکار نہیں بلکہ گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی کچی سڑکوں، تنگ گلیوں اور بد رنگ چھوٹے گھروں میں ننگے پاؤں، بوسیدہ کپڑوں میں کھیلتے بچوں، پژمردہ چہرہ بوڑھوں اور مفلوک الحال نوجوانوں کی تاریک زندگی کے پیش و پس سے غرض ہے:

"یوپا نے وین سویٹو کے ایک مفلوک الحال علاقے میں روک دی تھی۔ سب سیاح باہر نکل کر کین کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی کچی سڑکیں، تنگ گلیاں ہی بد رنگ چھوٹے چھوٹے گھر۔ کہیں کہیں گڈھوں میں ساکت پانی۔ ننگے پاؤں بوسیدہ کپڑوں میں کھیلتے ہوئے بچے۔ گھر کے دروازوں پر بیٹھے ہوئے چائے پیتے ہوئے لوگ گپوں میں مصروف جنھیں زندگی کی دوڑ سے کوئی مطلب نہ تھا۔ مکانوں کے سامنے تاروں کے زنگ آلودہ فینس اور ہر گھر پر ٹین کی چھت جس سے پانی ٹپکتا رہتا ہے۔ کہیں چھوٹی چھوٹی دوکانیں اور اسٹال ہیں جہاں کھانے پینے کی اشیا نظر

آرہی تھیں۔ یہ علاقہ جوہانس برگ سے 20 میل دور ہے۔ اپارٹ ہائیڈ کے دوران کالوں کو اسی جگہ بھیج دیا گیا تھا۔ South Western Township یعنی Soweto۔ کینن سیاحوں کو ٹاؤن شپ ٹور کے لیے لایا تھا۔ وہاں کے ماحول، کچے راستے اور گلیوں سے اُڑتی ہوئی گرد کے ذرّے کہہ رہے تھے کہ کس طرح وہ ملک درد کا گہوارہ بنا تھا۔ ہواؤں کی لہروں پر ماضی کی کراہیں تیر رہی تھیں۔ گلی کی دھول پروین کے قدموں سے لپٹ رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ زندگی کی کتنی تہیں ہیں۔ ایک کے بعد ایک کھلتی جاتی ہیں۔ حیرتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ کہانیاں حقیقت بنتی جاتی ہیں۔ نیند سے جگاتی جاتی ہیں۔ سوئیٹو کی گلیوں نے اُس کو تھام کر یہ احساس جگایا تھا کہ سیاحت صرف جمالیاتی ذوق کی تسکین نہیں بلکہ کھردری بد صورتی کی آگہی کا نام بھی ہے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں برسوں پہلے دیے گئے زخم اب تک مندمل نہیں ہوئے تھے۔ خراشیں سطحی طور پر خشک تو ہوگئی تھیں لیکن اندر زخم تازہ تھے بلکہ اُس نے اپنے گروپ کے ہم سفر سیاحوں کی طرف دیکھا تھا قیمتی لباس کے خول کے اندر چھپے ہوئے جسم کی کھوکھلی روحوں کے رنگ چہروں پر عیاں تھے اُن کے بھی‘‘ (ایضاً ص 58)

کامیاب سفر ناموں میں بجائے مقامات کے وہاں کی عوامی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہاں کے معاشرتی حالات، اجتماعی افکار اور سماجی طور طریقوں کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ایسے سفر ناموں میں بہت کچھ قابل مطالعہ ہوتا ہے۔ انگریزی ادب کے سفر ناموں میں یہ عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس لیے وہاں بیسیوں کامیاب سفر نامے ملتے ہیں۔ نائپال کا سفر نامہ Among the Believers، جان فریز کا Cycling Round the World نوبل انعام یافتہ فین مین کا سفر نامہ رومانیہ اور مارس ہنڈس کا مستقبل کی تلاش وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ اچھے سفر نامے اثر آفرینی میں اپنی مثال ہوتے ہیں۔ ان میں بیانیہ کا عنصر شعریت لیے ہوتا ہے۔ ایسے سفر نامے تاسف، یاسیت اور پژمردگی کو بڑھاوا نہیں دیتے بلکہ عزم وحوصلہ اور نشاط آگیں امیدوں کو جلا دیتے ہیں۔ ان سفر ناموں میں حزن و ملال اور یاس انگیز شکست خوردہ افکار وکیفیات، سیاح کے مسرت افروز فقروں اور سحر آفریں اسلوب نگارش سے خس وخاشاک کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ پروین شیر کے سفر نامہ ’چند سیپیاں سمندروں سے‘ میں یہ ساری خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جنوبی افریقہ میں SOWETO (South Western Township) کی غبار آلود سڑکوں پر ہواؤں کے جھونکوں کے ساتھ اڑتی ہوئی دردناک ماضی کی کراہوں، بوڑھے درد کی تلخیوں اور بے چینیوں نیز کھردرے بدصورت جسم کی کھوکھلی روحوں کے کرب کو محسوس کرنے کے بعد مصنفہ اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ ’’سیاحت صرف جمالیاتی ذوق کی تسکین نہیں۔ کھردری بدصورتی کی آگہی کا نام ہے۔‘‘ سوئیٹو کے کرب و کراہ والے ماحول کی غمناکی دور کرنے کے لیے وہ پری ٹوریا اور پولا نگا میں اٹھتے سورج کی دھرتی پر بہار کا استقبال کرنے والے پیڑوں کے جھرمٹ سے جھانکتی ہیں تو ’خدا کی کھڑکی‘ سے لامتناہی پہاڑی جنگلات کے نظارے میں وہ محو ہو جاتی ہیں۔ پولا نگا کے اس وجد آفریں قدرتی مناظر کو دیکھنے ساری دنیا سے سیاح جوق در جوق آتے ہیں۔ اس طرح جنوبی افریقہ کا یہ علاقہ انسانوں کے مظالم اور سفاکیوں کی یاد تازہ کرتا ہے تو قدرت، فطرت کی حسن کاری سے انسانی دکھوں کا مداوا کرتی ہے۔ گویا ماتم اور مسرت کا یہ علاقہ حسین سنگم ہے۔ یہاں ’بلائیڈ‘ اور ٹریورندیوں کا سنگم بھی ہے۔ اول الذکر کے معنی دریائے مسرت اور ثانی الذکر دریائے ماتم کہلاتا ہے۔ پروین

پروین شیر نے اپنے سفر نامے میں انکا حکومت اور اس قوم کی تہذیب و تمدن کے آثار کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ انکا قبائل کے وہ لوگ جنھوں نے جدید اور سائنسی ایجادات کے دور میں بھی اپنے کلچر کو سینے سے لگائے رکھا، پروین شیر ان کے گائوں میں گھومیں، ان لوگوں سے ملاقاتیں کیں، ان کے آرٹ کو قریب سے دیکھا، پرکھا

شیر نے دریائے بلائیڈ کا تذکرہ اس طرح کیا ہے کہ ہماری آنکھوں کے سامنے وسط بھارت میں بہنے والی نربدا ندی کا سنگ مرمریں بھیڑا گھاٹ آگیا۔ پروین شیر نے بلائیڈ کی جس انداز میں تجسیم کاری کی ہے، اس میں محاکاتی شاعری کا عکس اتر آیا ہے۔ جنوبی افریقہ کے اس سفر میں پروین شیر کیپ ٹاؤن تک جا پہنچیں۔ چند سیپیاں سمندروں سے چننے کے لیے راس امید انھیں اس قدر راس آیا کہ سفر نامے میں پروین نما فکر وخیال کے گوہر آبدار بھی نظر آنے لگے۔ یہاں سفر نامے کا پہلا باب سیاہ روشنی (جنوبی افریقہ) ختم ہوتا ہے۔

اس کے بعد پروین شیر جنوبی امریکہ کے طلسمی جہاں یعنی ’پیرو‘ کا سفر کرتی ہیں۔ یہ ملک ’انکا‘ تہذیب کا خاص مرکز ہے اور آج بھی یہاں انکا کی قدیم تہذیب وتمدن اور اس کی روایات ورسومات عملی زندگی میں برتی جاتی ہیں۔ یہ قوم میکسیکو کی مایا قوم کی طرح آفتاب پرست تھی اور کیلنڈر سازی میں ید طولیٰ رکھتی تھی۔ ماچو پیچو کی عبادت گاہ کے کھنڈرات میں سورج کی کرنوں سے وقت کا تعین کرنے کے لیے وہاں ایک کھڑکی ہے۔ اس سے سورج کی کرنیں سورج دیوتا کی اس عبادت گاہ کے فرش پر بنی گرے نائٹ کی سل پر پڑتی ہیں۔ یہی سل انکا تہذیب کا کیلنڈر ہے۔ انکا قوم سورج کو اپنا معبود گردانتی تھی اور اسے ’انتی‘ کہتی تھی۔ ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ سورج دنیا کا خالق ہے اور ہر گرہن کے وقت اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ وہ دوبارہ زندہ ہوتا ہے سورج دیوتا کو وہ اپنا پالن ہار مانتی تھی اور اس کی عبادت گاہ میں بیش قیمت نذرانے چڑھاتی تھی۔ اس دولت کا اندازہ اس تاریخی واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس مندر کو اسپین کے لوگوں نے 1535 میں جب لوٹا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تو جو دولت ان کے ہاتھ آئی وہ 12 ملین ڈالرس کے برابر تھی۔

پروین شیر نے اپنے سفر نامے میں انکا حکومت اور اس قوم کی تہذیب وتمدن کے آثار کو بڑے دلنشین انداز میں بیان کیا ہے۔ انکا قبائل کے وہ لوگ جنھوں نے جدید اور سائنسی ایجادات کے دور میں بھی اپنے کلچر کو سینے سے لگائے رکھا، پروین شیر ان کے گاؤں میں گھومیں، ان لوگوں سے ملاقاتیں کیں، ان کے آرٹ کو قریب سے دیکھا، پرکھا۔ ان کے اعتقادات، رسومات اور رہن سہن کے طریقوں کو سمجھا اور ان کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آئیں۔ جنوبی امریکہ میں پیرو کی مٹتی ہوئی انکا تہذیب کے بیان میں پروین شیر کا قلم کچھ اس قدر رواں ہے کہ ہر واقعہ جو انھوں نے دیکھا، ہماری آنکھوں کے سامنے اس کی تصویر سی آجاتی ہے۔ مکئی کے دانوں کو موسل سے کوٹنے کا تجربہ جو پروین شیر نے انکا عورتوں کے ساتھ مل کر کیا، اسے نہ صرف یہ کہ بیان کرنے پر اکتفا کیا بلکہ اس کی خوب صورت تصویر بھی بنا ڈالی۔ انکا تہذیبی ماحول میں گھل مل جانے کی خوشی ان کے تصویری چہرے سے عیاں ہے۔ انھوں نے جھیل میں تیرتے گھروں کے صحن، کوچوں بازاروں میں اونی ملبوسات بنتی ہوئی عورتوں کی مسرتوں کو بھی اپنی قلمی تصویروں میں نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماجی ماحول کے علاوہ کھلی فضا اور قدرتی مناظر کو مصورانہ انداز میں انھوں نے اپنی نوک قلم سے اس سفر نامے میں پیش کیا ہے۔ دوران سفر وہ جن آثار قدیمہ سے گزرتی ہیں تو اس جہانِ دیدہ کی تاریخ کے اوراق بھی وہ بڑی مستعدی سے الٹتی ہیں اور ان قدیم تہذیبوں کا تقابل وتوازن تاریخ کے جھروکوں میں جھانک کر کرتی ہیں اور اس نتیجے پر پہنچتی ہیں کہ جنوبی امریکہ میں بھی مصر قدیم کی طرح اسلاف کی نعشوں کی ممیاں بنادی جاتی تھیں۔ فراعنہ مصر کی طرح انکا قوم کے لوگ بھی اپنے بزرگوں کے اہرام نما مقبرے بنایا کرتے تھے جن کی تعمیر میں ٹنوں وزنی پتھر پہاڑوں کی

اونچائیوں پر رسوں سے باندھ کر چڑھاتے تھے۔

یوں محسوس ہوتا ہے کہ پروین شیر سرد مقامات کے ماحول اور جنگلوں کی فضا کو بہت پسند کرتی ہیں۔ جنوبی امریکہ کا قدیم شہر ماچو پیچو جو سطح سمندر سے دو ہزار چار سو بتیس میٹر بلندی پر واقع ہے، انکا قبائل اسے روحانی شہر مانتے ہیں اور ماہرین عمرانیات اور مورخین اس شہر کو 'کھویا ہوا شہر' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ اگرچہ قدیم کھنڈرات سے گھرا ہوا تاریخی مقام ہے لیکن پہاڑی جنگلات کے درمیان بسا ہوا ہونے کی وجہ سے جنت نشان ہے۔ جنگلوں کے درمیان چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ومبابا ندی اور اس کے پیچ دار بہاؤ کے حسین نظاروں کو دیکھنے کے لیے پروین شیر اپنے اہل خانہ اور ساتھیوں کے ساتھ بارہ سو فٹ بلندی پر چار سو زینے طے کرتی ہوئی پہنچیں۔ ماچو پیچو کے کھنڈرات میں بسے قدرت کے اسرار و طلسمات کو نظر بھر کر دیکھنے کے بعد وہ سوچنے لگیں، ''انکا تہذیب کی سب سے حیرت انگیز نشانی یہی شہر ماچو پیچو ہے۔ دنیا سے الگ زندگی گزارنے کی ساری ضروریات یہاں موجود تھیں یہ ایک SECRET CITY تھا۔ اس ماضی کا راستہ کس قدر لمبا ہے۔ یہ زمین نہیں بلکہ آسمان کا شہر تھا۔ بادلوں سے آگے۔ دو بلند پہاڑیوں کے درمیان۔'' اتنی بلندی پر پہنچ کر وہ صرف قدرتی مناظر ہی سے لطف اندوز نہیں ہوئیں بلکہ ان کھنڈرات میں انکا قبائل کی تاریخ و ثقافت اور اساطیر و عقائد کا بھی مشاہدہ کرتی رہیں۔ پروین شیر کے اس نوع کے سفرنامے سے ہمیں کرہ جنوب کے دو براعظموں کے جنوبی حصے کے بہت سارے تاریخی و جغرافیائی احوال کا علم ہو جاتا ہے۔

مصنفہ نے اس سفرنامے کو مصوری اور شاعری ہر دو فنون سے مزین کر دیا ہے۔ یہ دونوں فن مصنفہ کے فکر و خیال کی توضیح بڑے مؤثر اور لطیف انداز میں کرتے ہیں۔ اس سفرنامے میں اسلوب نگارش نثر نگار سیاح کا نہیں ایک حساس شاعرہ کا ہے جو تاریخ کے گنجلک اور پیچیدہ واقعات کو بھی لطیف جذبات میں سمونے کا ہنر جانتی ہے۔ سفرنامے میں قدآور ناقدین خلیل مامون، پروفیسر عتیق اللہ، ابوالکلام قاسمی، پروفیسر مرزا حامد بیگ اور وارین کیریو کی آرا پروین شیر کے ادبی مقام کو سمجھنے میں معاونت کرتی ہیں۔ اس سفرنامے کا ذولسانی ایڈیشن اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ اردو کلچر کے ساتھ انگریزی کلچر بھی اس سے استفادہ کرسکتا ہے۔ آل انڈیا اردو منچ بنگلور کی یہ پیش کش واقعی قابل ستائش ہے۔

Dr. Syed Yahya Nasheet,
24 Kashana Kalgaon- 445203
YAVATMAL

کرشن چندر: خواجہ احمد عباس اور احسان دانش کا صد سالہ جشن

برلن: اردو کے تین عظیم ادیبوں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور احسان دانش کی صد سالہ سالگرہ کا جشن منانے کے لیے ایک تقریب یکم جون کو برلن میں اردو انجمن کی طرف سے منعقد کی گئی، جس میں بڑی تعداد میں برلن میں مقیم برصغیر کے علاوہ ہندوستان، پاکستان اور برطانیہ سے آئے مہمان دانشوروں نے شرکت کی۔ اس موقع پر اردو انجمن کے صدر عارف نقوی نے انڈین کونسل آف کلچرل ریلیشنز کے صدر کرن سنگھ ایم پی کا پیغام تہنیت پڑھ کر سنایا۔ اس کے بعد کرشن چندر، خواجہ احمد عباس اور احسان دانش کی تحریروں میں انسان، دوستی، امن اور سماجی انصاف کے پیغام کے موضوع پر مقالے پیش کیے گئے اور اردو انجمن کے نائب صدر انور ظہیر کی تیار کی ہوئی فلمی دستاویزات کے ساتھ ساز سنگیت کا پروگرام پیش کیا گیا اور آخر میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

دہلی یونیورسٹی کے ذاکر حسین کالج کے ڈاکٹر خالد علوی نے، جو مہمانِ اعزازی کی حیثیت سے شریک تھے، خواجہ احمد عباس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور ان کی ادبی، صحافتی و فلمی خدمات پر روشنی ڈالی۔

اس سے قبل پاکستان کے مبشر علی زیدی اور عارف نقوی نے کرشن چندر کی حیات و خدمات پر تقریریں کیں۔ مبشر علی زیدی نے، جو مہمان خصوصی تھے، کرشن چندر کے کئی مایہ ناز افسانوں کا ذکر کیا۔ جبکہ عارف نقوی نے خاص طور سے کرشن چندر کے ڈراموں کے بارے میں بتایا اور کہا کہ ان کے ڈرامے سرائے کے باہر اور کتے کی موت، جن کا عارف نقوی نے جرمن زبان میں ترجمہ کیا تھا، برلن ریڈیو سے براڈ کاسٹ ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ کرشن چندر کی کئی کہانیاں بھی جرمن رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ عشرت ظہیر سیما نے شاعر احسان دانش کی ترقی پسند شاعری پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ جلسے میں جرمن فنکار سیباستیان درائر اور آصف خان نے ستار اور طبلے سے لوگوں کے دلوں کو لبھایا، جب کہ گلوکار دھیرج رائے نے نظمیں پیش کیں۔ تقریب کا اختتام ایک مشاعرہ پر ہوا جس کی صدارت اردو انجمن کے صدر عارف نقوی نے کی۔ مشاعرہ میں مختلف مقامات سے آئے ہوئے شعرا نے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 8 جون 2014

'یہ میرا چمن ہے، میرا چمن' کی تقریبِ اجرا

اردو کی نئی بستی کے چمن میں ایک نیا پھول کھلا جو عنایت حسین عیدن کے دوسرے ناول 'یہ میرا چمن ہے، میرا چمن' کی شکل میں نمودار ہوا۔

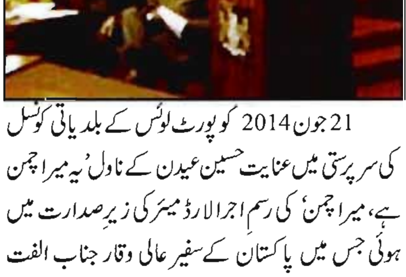

21 جون 2014 کو پورٹ لوئس کے بلدیاتی کونسل کی سرپرستی میں عنایت حسین عیدن کے ناول 'یہ میرا چمن ہے، میرا چمن' کی رسم اجرا لارڈ میئر کی زیر صدارت میں ہوئی جس میں پاکستان کے سفیر عالی وقار جناب الفت حسین، ہندوستان کے سفارت خانے کے نمائندے عالیجناب ممانسک اور کراچی فیڈرل اردو یونیورسٹی کے

وائس چانسلر پروفیسر ظفر اقبال نے شرکت کی۔
تقریب کا اہتمام بلدیاتی کونسل کے ہال میں کیا گیا۔تقریب کی نظامت جناب بشیر طالب نے انگریزی زبان میں کی جو اسلامک کلچرل کالج کے ریکٹر ہیں نیز علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق طالبِ علم بھی رہ چکے ہیں۔ بشیر طالب نے اپنی استقبالیہ تقریر کے دوران مصنف کی اردو سے بے انتہا محبت کا ذکر کیا۔

اردو اسپیکنگ یونین کے نائب صدر ڈاکٹر صابر گودڑ نے عنایت حسین عیدن کی ادبی وعلمی خدمات پر روشنی ڈالی جو نصف صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مجاز کو شاید یہ گمان نہیں تھا کہ ترانۂ علی گڑھ میں بنے ہوئے خواب کی تعبیر جزیرۂ ماریشس میں بھی ہوگی۔ علی گڑھ کی تہذیب مصنف کی شخصیت میں رچی بسی ہے اور اس کا اظہار ناول کے ذریعہ ہوا ہے۔ان کی تخلیقی ذہن نے مختلف مناظر اور کرداروں کے حوالے سے چمنِ علی گڑھ سے ایک ایسا خوبصورت گلدستہ تیار کیا جس میں ہندوستان، افریقہ، یورپ اور ماریشس کے پھول شامل ہیں۔ ان کے مطابق یہ ایک سوانحی ناول سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ پاکستان کے سفیر اعلیٰ ذی وقار جناب الفت حسین نے کہا کہ عنایت حسین عیدن کی مختلف تصانیف کی ورق گردانیوں کے ذریعے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کو وقت اور نسلی فاصلہ کا ادراک ہے، وقت کے ساتھ ارتقا کا فہم اور شعور بھی ہے۔ ان کے ناول 'یہ میرا چمن ہے میرا چمن' پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ اس میں دوستی، امن وآشتی، بھائی چارے اور ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کا ایک پیغام ہے۔ ہندوستانی سفارت خانے کے نمائندے عالی جناب مہانسک نے فخریہ انداز میں کہا کہ مصنف کا ناول ان کے ملک کی ایک مقبول یونیورسٹی کے پس منظر پر مبنی ہے۔ وہ مصنف کے شکرگزار ہیں کہ انھیں اپنی مادر درسگاہ سے اتنی عقیدت ہے۔ کراچی فیڈرل اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ظفر اقبال نے کہا کہ عنایت حسین عیدن کا 'یہ میرا چمن ہے، میرا چمن' بنیادی طور پر جس تہذیبی پس منظر میں یہ ناول لکھا گیا وہ تہذیب بہت طاقتور ہے اور اس کے اثرات دیر تک مرتب ہوتے رہے۔ ناول کے کردار دنیا کے تین کونے سے آتے ہیں اور تمام ظاہری شناخت ختم کر کے صرف ایک طالبِ علم کی حیثیت سے وہاں کی سرگرمی اور ماحول میں جذب ہونے سے ایک نئی زندگی آگے بڑھتی ہے تو گویا علی گیرین جب بھی ملیں گے تو زندگی کو مثبت طریقے سے آگے بڑھائیں گے۔

جب کوئی ادب پارہ زندگی کو آگے بڑھاتا ہے، زندگی کی مثبت قدروں کو اجاگر کرتا ہے تو درحقیقت وہ زندگی کا ترجمان بنتا ہے۔

عنایت حسین عیدن کی شریکِ حیات محترمہ ریحانہ عیدن چالیس سالوں سے ان کے دوش بدوش چل رہی ہیں۔ تقریبِ اجرا میں انھی کی زبانی شرکائے جلسہ پر مصنف کی شخصیت کے مختلف پہلو منکشف ہوئے جن میں سے ایک علی گڑھ کی شدید محبت شامل ہے۔ انھوں نے علی گڑھ کی تہذیب پر مبنی ناول لکھنے کے محرکات بھی ظاہر کیے۔ وہ مزید کہتی ہیں کہ مصنف کی رگوں میں علی گڑھ کی تہذیب بہتی ہے۔ اس پراثر تقریر کے بعد شرکائے جلسہ کو ترانۂ علی گڑھ سماعت کرنے اور اس سے محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ ناول کے مصنف عنایت حسین عیدن نے لارڈ میئر، تمام منتظمین، مقررین، مدگار اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے کہا کہ ناول لکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ علی گڑھ کی تہذیب تمام لوگوں کے ساتھ شیئر کرنا چاہتے ہیں۔ لارڈ میئر محترمہ کریچیان دورین چکوری نے حاضرین سے مخاطب ہوکر کہا کہ مصنف نے اپنے طالبِ علمی کے زمانے سے متاثر ہوکر یہ ناول لکھا ہے۔ ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ پورٹ لوئس کی بلدیاتی کونسل مقامی مصنّفین کو تعاون کرتی ہے۔ ان کے مطابق اکیسویں صدی میں اعلیٰ ادبی صلاحیت کی سخت ضرورت ہے تاکہ جدید دنیا کا مقابلہ کیا جاسکے۔ مصنف کے فرزند ڈاکٹر ندیم عیدن نے تشکر کے کلمات پیش کیے۔

پریس ریلیز، گلناز جومن ایجیوکیٹر، ماریشس، 2 جولائی 2014

■

ریاض میں ادارہ ہدف کا عالمی مشاعرہ

ریاض: علامہ اقبال کے 'روحانی وطن' عرب کی سرزمین میں علامہ اقبال کی یاد میں ایک یادگار عالمی مشاعرہ منعقد ہوا، جہاں شخصیت سازی کے ادارہ 'ہدف' کی دعوت پر مشاعرہ گاہ میں عالمی شہرت یافتہ شعرا نے شرکت کی۔ پردیس میں آباد نئی اردو کی بستیوں میں اردو کے فروغ اور اس کے بقا کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ جہاں صفی حیدر نے شہ نشین کو ادب کے کہکشانوں سے سجایا وہیں انجینئر عمر جاوید نے آیاتِ بینات کی تلاوت کی، جس کے بعد

تنظیم کے روح رواں اور نائب صدر اصغر الدین احمد نے ہدف کا تعارف پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان کے اعلیٰ عہدوں تک رسائی نئی زمینوں اور نئے علاقوں کی فتح کے معرکوں سے زیادہ اہم ہے۔ ہندوستان خصوصاً شہر حیدرآباد میں اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بے سہارا، لیکن اعلیٰ نمبرات سے کامیاب ہونے والے طلبہ کی فیس ادارہ ہدف ادا کر رہا ہے۔ اصغر نے کہا کہ مسلمانوں کی تکریم سونے چاندی کے بازاروں سے نہیں تھی، بلکہ اکتساب علم وہنر کے سبب تھی۔ سرسید احمد خان نے کہا تھا کہ ''مغربی قوموں کی ترقی کا راز ان کے پڑھے لکھے افراد کے ایثار کا نتیجہ ہے۔''

ہدف کے اس عالمی مشاعرے کے معاون وشریک مہم تجارتی اداروں کو نائب صدر اصغر الدین نے پبلک آف کمٹمنٹ کے یادگار مومنٹوز پیش کیے۔ ادارے کے مرکزی قائد نعیم جاوید نے وسیم بریلوی کے ہاتھوں صدرنگ دیدہ زیب مجلہ 'سوغاتِ حجاز' کی رسم اجرا کروائی اور پورے مشاعرے میں سیکڑوں کی تعداد میں تقسیم کروائی۔

شیراز مہدی ضیا ناظم، باقر نقوی، سہیل ثاقب، طاہر فراز، سردار اثر، اقبال اشہر، نعیم جاوید وغیرہ نے اپنے اپنے کلام پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جون 2014

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ
قومی اردو کونسل کے تعاون سے

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

منگلور، اتراکھنڈ: شاہ ولایت گرلز ہائی اسکول میں این، سی، پی، یو، ایل اور نائلٹ کے اشتراک سے چلنے والے ایک سالہ کمپیوٹر ڈپلوما کے امتحانات کا انعقاد کیا گیا۔ شاہ ولایت تعلیمی اور سماجی تنظیم کے علاوہ ہری دوار ضلع کے فیضان کمپیوٹر سوسائٹی بہاری گڑھ اور سٹیزن ویلفیئر سوسائٹی کلیر شریف کے طلبہ اور طالبات بھی امتحان میں شریک ہوئے۔ ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کی طرف سے محترمہ آبگینہ مبصر کے طور پر اس سینٹر پر تشریف فرما ہیں، محترمہ آبگینہ نے بڑی تعداد میں طالبات کی شمولیت پر خوشی کا اظہار کیا وہیں انھوں نے دیگر اقلیتوں میں عیسائی اور سکھ نوجوانوں کی شرکت پر ادارہ کے سربراہ پروفیسر تنویر چشتی کو مبارکباد پیش کی اور کہا کہ اردو ہم سب کی زبان ہیش، اس کا واضح ثبوت اس سینٹر کے طلبہ و طالبات ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر تنویر چشتی نے کہا کہ ہمیں کوالٹی ایجوکیشن کی طرف توجہ کرنی چاہیے تا کہ ہم عالمی معیار کے مسابقوں میں کامیابی حاصل کر سکیں۔ تابش چشتی نے کہا کہ آج کمپیوٹر تعلیم کا جز ولاینفک ہے اور انھوں نے ان پیج اردو کے بارے میں بتایا کہ یہ سافٹ ویئر عربی، فارسی، سندھی، کشمیری، قندھاری اور ازبیک غرض بہت سی زبانوں میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مولانا آفتاب اظہر کشن گنجوی نے این سی پی یو ایل کے حوالے سے کہا کہ اس ادارے نے اقلیتوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے، ہمیں ان پروگراموں سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ اس موقعے پر کمپیوٹر اساتذہ بلال احمد، سنجیو کمار، امت کمار، عظیم انصاری کے علاوہ مولانا فیضان، مولانا ڈاکٹر اسلم قاسمی، مولانا عرشی کلیری، علامہ شمیم قریشی ابروی، قاری سلیم، حافظ عبدالصمد، حافظ غلام علی وغیرہ موجود تھے۔

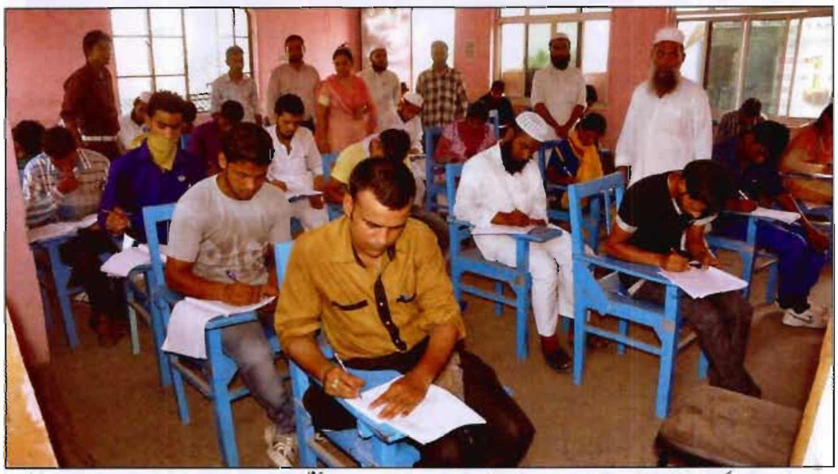

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 27 جون 2014

گزارش

ہمارے کالم کتابوں کی دنیا کا مقصد یہ ہے کہ نئی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جائیں تا کہ قارئین کتابوں تک رسائی حاصل کریں۔ کتابوں کے مصنفین، مرتبین اور شعرائے کرام سے درخواست ہے کہ وہ نئی کتابیں ہی بھیجا کریں اور تبصرے کی جلدی اشاعت کے لیے زور نہ ڈالیں۔ ہمارے یہاں درجنوں کتابیں ہر ہفتے موصول ہوتی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھیں کہ ہر کتاب پر تبصرہ شائع نہیں کیا جاسکتا۔ پھر بھی ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ تبصرے ہر ماہ شائع کریں۔

(ادارہ)

اردو نصاب: ضرورت وافادیت

ارریا: غیر ملحقہ مدارس جس خاموشی کے ساتھ اردو کی آبیاری کر رہے ہیں اور اپنا ذریعہ تعلیم بنا کر اسے فروغ دے رہے ہیں یہ مثالی قدم ہے۔ سچ یہ ہے کہ آج اردو ان ہی خاموش محنت کرنے والے اداروں سے زندہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار دعوت القرآن ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے اشتراک سے 12 جون کو جامعہ دعوت القرآن ملت نگر پھیلکی چوک ڈوبا ارریا میں منعقد سیمینار (غیر ملحقہ میں اردو نصاب: ضرورت و افادیت) سے خطاب کرتے ہوئے متعدد دانشوران نے کیا۔ ماہر تعلیم مولانا نعیم الدین قاسمی نے کہا کہ اردو ہماری نہ صرف تہذیب اور ثقافت کی زبان ہے بلکہ مذہب کا بہت سارا اثاثہ اس میں محفوظ ہے۔ اس لیے بھی اس زبان کی حفاظت اور اس کا فروغ ہماری ذمہ داری ہے۔

انھوں نے کہا کہ دینی مدارس میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ہے کہ اردو کا اپنے پورے خدوخال کے ساتھ یہاں فروغ ہو رہا ہے۔ پروفیسر عبدالحنان نے کہا کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ بنیادی سطح پر اردو کی تعلیم پر توجہ دی جائے تبھی یہ زبان باقی رہ سکتی ہے۔ ماسٹر شمیم اختر نے کہا کہ سرکاری سطح پر اس علاقے میں پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا نظم ضرور ہے لیکن اس کے معیار پر توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل آہستہ آہستہ اردو کے بجائے ہندی کی طرف مائل ہو رہی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 جون 2014

'خبر نامہ' اور 'عالمی اردو نامہ' کے تحت ملک کے مختلف اردو اخبارات میں اردو کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کا ڈائجسٹ ہر ماہ اس لیے پیش کیا جاتا ہے تا کہ پورے ملک میں اردو سرگرمیوں کی مجموعی صورت حال سامنے آسکے۔ خبروں میں دیے گئے تمام حقائق اور تبصروں کے لیے متعلقہ اخبارات ذمے دار ہیں اور اس سلسلے میں رابطہ کیا جانا چاہیے۔ (ادارہ)

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی جنرل باڈی میٹنگ

نئی دھلی: مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن اب اسکولوں کے ساتھ ساتھ پرائیویٹ یونیورسٹیوں کو بھی مالی مدد فراہم کرائے گا۔ یہ مالی مدد معمول کی مدد سے زیادہ بھی دی جاسکتی ہے۔ یہ فیصلہ ایم اے ای ایف کی جنرل باڈی میٹنگ میں لیا گیا، جس کی سربراہی اقلیتی امور کی وزیر نجمہ ہبت اللہ نے کی۔ میٹنگ کے بعد انقلاب سے خصوصی بات کرتے ہوئے اقلیتی وزیر نجمہ ہبت اللہ نے بتایا کہ 'اسکولوں کو مالی مدد فراہم کرانے کی اسکیم تو فاؤنڈیشن میں بہت پہلے سے چل رہی ہے، مگر اداروں اور تنظیموں کی جانب سے اراضی فراہم کرائے جانے کے بعد اسکول کی تعمیر کے لیے خطیر امداد فراہم کرنے کو ہماری باڈی نے ہری جھنڈی دے دی ہے۔' انھوں نے بتایا کہ 'درگاہ کمیٹی کے ذریعے مجوزہ اسکول کے منصوبے کو بھی منظوری مل گئی ہے۔''

نجمہ ہبت اللہ نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ ''میرا مقصد اقلیتوں کو تعلیمی میدان میں دیگر قوموں کے ہم پلہ بنانا ہے، تاکہ مسلم اقلیتیں بھی قومی دھارے میں شامل ہوسکیں۔'' انھوں نے کہا کہ ''ایم اے ای ایف کے ذریعے اسکالرشپ اسکیم، اسکول انفراسٹرکچر ڈیولپمنٹ اسکیم اور دیگر اداروں کو مالی مدد فراہم کرانے کی اسکیمیں اسی لیے چلائی جارہی ہیں تاکہ ہمارا تعلیمی معیار بہتر ہوسکے۔''

اقلیتی وزیر نے مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کو فعال بنانے پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ''ایم اے ای ایف کے اندر فعالیت لانے پر ہم مسلسل کام کررہے ہیں، اس تعلق سے میں نے کئی میٹنگیں بھی کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ''میری پوری توجہ اس بات پر ہے کہ مسلم اقلیتیں تعلیمی میدان میں بہتر مظاہرہ کرنے کی اہل بن جائیں، اس کے لیے جو بھی قدم اٹھانے پڑیں گے وہ اٹھائے جائیں گے۔

ایم اے ای ایف کی جنرل باڈی کی میٹنگ کا ایک منظر

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جون 2014

مولانا آزاد اسکول کے قیام کا منصوبہ

نئی دھلی: کندریہ ودیالیہ کی طرز پر مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن (ایم اے ای ایف) کے ذریعہ مسلم اکثریتی علاقوں میں مولانا آزاد رہائشی اسکولوں کے قیام کا منصوبہ ایک طویل عرصہ سے سردمہری کا شکار تھا۔ اب اسے لانچ کرنے کی تیاری کی جارہی ہے۔ مولانا آزاد رہائشی اسکول کے قیام کے منصوبہ کے مطابق جس طرح ملک بھر میں کندریہ ودیالیہ اسکولوں کا جال ((1090 پھیلا ہوا ہے، اسی طرح مولانا آزاد اسکولوں کا نیٹ ورک پھیلایا جائے گا۔ اس منصوبہ کی شروعات کے لیے سابقہ حکومت نے فاؤنڈیشن کے رواں مالی سال 14-2013 کے بجٹ میں اضافہ بھی کیا تھا مگر تکنیکی دشواریوں کی وجہ سے اس پر کام شروع نہیں ہو پایا مگر اب پتہ چلا ہے کہ اقلیتی وزارت نے خصوصی دلچسپی کے ساتھ اس اسکیم کو لانچ کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس کے تحت رواں سال میں 10 اسکولوں کے قیام کا ٹارگیٹ رکھا گیا ہے۔ ذرائع کے مطابق مولانا آزاد اسکول منصوبہ کو ایم اے ای ایف کی جنرل باڈی اور گورننگ باڈی کی میٹنگ میں رکھا جانا ہے۔ جہاں ہری جھنڈی دیے جانے کا حتمی امکان ہے۔ ہر اسکول کے قیام کے لیے ایم ای ایف 5 کروڑ روپے کا مالی تعاون پیش کرے گا اور اس اسکول میں فاؤنڈیشن کا کردار ایک حصہ دار کے طور پر ہوگا۔ فاؤنڈیشن کے ذریعے اسکولوں کے قیام کا جو ابتدائی معیار طے کیا گیا ہے اس کے مطابق 'اسکول کے قیام کے لیے پہلی شرط 3 ایکڑ اراضی کی فراہمی ہے، جس کی ذمے داری این جی او یا درخواست گزار ادارے کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 23 جون 2014

'نظیر اکبرآبادی: فن وشخصیت' پر قومی سیمینار

نئی دھلی: نظیر اکبرآبادی کی شاعری زندہ معاشرے کی تصویر ہے جہاں فرقہ واریت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ نظیر کے یہاں زبان کی تفریق نہیں ہے، انھوں نے اردو، ہندی اور دیگر زبانوں کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے ادبی دیانت داری کا اظہار کیا ہے۔ نظیر کی شاعری میں عوام وخواص کا تصور نہیں کیا جاسکتا ہے وہ سبھی کے شاعر ہیں۔ ان خیالات کا اظہار اردو اکادمی کے زیر اہتمام 'نظیر اکبرآبادی: فن وشخصیت' کے عنوان سے منعقد دو روزہ قومی سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں مقررین نے کیا۔ صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد ذاکر نے کی جبکہ ممتاز ادیب و دانشور اشوک واجپئی نے سیمینار کا افتتاح کیا۔ نظامت کے فرائض اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے انجام دیے۔

'نظیر اکبرآبادی: فن و شخصیت' پر سیمینار کے دوران خطاب کرتے ہوئے پروفیسر شمیم حنفی جبکہ اسٹیج پر پروفیسر محمد ذاکر، اشوک واجپئی اور پروفیسر خالد محمود و دیگر

سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اشوک واجپئی نے کہا کہ بڑی شاعری محض ایک طبقے کو مخاطب نہیں کرتی بلکہ پورے معاشرے، تہذیب اور تمام مذہبی طبقوں سے مخاطب ہوا کرتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی وہ شاعر ہے جس کا مطالعہ کرنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے درمیان موجود ہیں۔ معروف نقاد اور ادیب پروفیسر شمیم حنفی نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ نظیر کی شاعری ایک منفرد مقام رکھتی ہے، یہ شاعری بالکل مختلف ہے جسے قبول کرنا بہت ہی مشکل عمل ہے۔ نظیر نے روایت سے ہٹ کر شاعری کی ہے۔ 18ویں صدی ((1835-1740 جس میں نظیر اکبرآبادی نے زندگی بسر کی وہ شاعری کی سب سے بڑی صدی تھی۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر محمد ذاکر نے کہا کہ ہندوستان اور ہندوستانیت نظیر کی شاعری کا نقش اعظم ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے یہاں جو اخوت اور بھائی چارہ ملتا ہے وہ ہندوستانیت کو اونچے مقام پر فائز کر دیتا ہے۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے خیر مقدمی کلمات پیش کیے۔ جب کہ تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے سیمینار کمیٹی کے کنوینر پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ اس مختصر عرصے میں ہم نے اس سیمینار کا انعقاد کیا ہے اور لوگ دور دراز سے آئے ہیں میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آخر میں اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے اظہارِ تشکر کیا۔ افتتاحی اجلاس کے بعد پہلا اجلاس منعقد کیا گیا، جس کی صدارت ڈاکٹر جی آر کنول اور پروفیسر شہپر رسول نے کی جبکہ نظامت اشفاق عارفی نے کی۔ پروفیسر آفاق، پروفیسر علی احمد فاطمی اور ڈاکٹر صفدر امام قادری نے پرمغز مقالات پیش کیے۔

دوسرے دن کے پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انجمن ترقی اردو (ہند) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کہا کہ جب بھی گنگا جمنی تہذیب کی گفتگو کی جائے گی تو نظیر اکبرآبادی کا نام فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے، لیکن المیہ یہ ہے کہ مشترکہ تہذیب اور گنگا جمنی تہذیب کو سیاسی جملہ بناتے ہوئے اردو کو بھی مسلمان بنا دیا گیا ہے۔ مجلس صدارت کے دوسرے رکن پروفیسر شہزاد انجم نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت ڈاکٹر مشتاق صدف نے کی۔ اجلاس میں کل 9 مقالے پیش کیے گئے ہیں جن میں پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، ڈاکٹر قمرالہدیٰ فریدی، ڈاکٹر ناشر نقوی، پروفیسر نعمان خان، ڈاکٹر طاہرہ پروین، ڈاکٹر شگفتہ یاسمین نے مقالات پڑھے۔ اجلاس کے اختتام پر حبیب تنویر کے ڈراما 'آگرہ بازار' میں فقیر کا کردار ادا کرنے والے کا کا پرشوتم بھٹ نے نظیر کی نظم 'روٹی نامہ اور آدمی نامہ' پیش کی۔ واضح رہے کہ کا کا پرشوتم بھٹ نے یہ نظمیں حبیب تنویر کے ڈرامے 'آگرہ بازار' میں فقیر کے کردار میں گائی تھیں۔ سیمینار کے آخری اجلاس کی صدارت جے این یو کے استاذ پروفیسر معین الدین جینا بڑے اور عشرت ظفر نے کی جبکہ نظامت ڈی یو کے استاد ڈاکٹر ارشاد نیازی نے کی۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر مولا بخش، ڈاکٹر مظہر احمد، ڈاکٹر شاہینہ تبسم، ڈاکٹر احمد محفوظ، ڈاکٹر ابوبکر عباد، ڈاکٹر علی جاوید نے پرمغز مقالے پیش کیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 28و29 جون 2014

نئے پرانے چراغ

نئی دهلی: اردو اکادمی دہلی کے زیر اہتمام مقبول ترین سہ روزہ 19واں پروگرام 'نئے پرانے چراغ' کا افتتاح قمر رئیس سلور جوبلی آڈیٹوریم میں کیا گیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق وائس چانسلر سید شاہد مہدی مدعو تھے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر شفیع ایوب نے انجام دیے۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے خیر مقدمی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان کی متحرک و فعال اکادمی کا وائس چیئرمین ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ اس کے بعد سیمینار کمیٹی کے کنوینر پروفیسر عبدالحق نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ دہلی کے تمام اردو اداروں کے درمیان باہمی تعلقات وقت کی ضرورت ہے، جس سے اردو کا مزید فروغ ہوگا۔ مہمان خصوصی سید شاہد مہدی نے کہا کہ پروفیسر خالد محمود کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے مکتبہ جامعہ کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں وہ بھی قابل تعریف ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر قمر رئیس کے غیر اشاعتی سرمائے کو منظر عام پر لائیں تاکہ ان کی خدمات کا بھی اعتراف کیا جاسکے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ ہندوستان کی سب سے متحرک اردو اکادمی دہلی ہے، جہاں ہر سال اس کی سرگرمیوں میں اضافہ اور توسیع ہو رہی ہے۔ اردو اکادمی دہلی کے سکریٹری انیس اعظمی نے اظہار تشکر کیا۔

دوسرے دن کے تحقیقی اور تنقیدی اجلاس کی صدارت ہندوستانی زبانوں کے مرکز جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے پروفیسر محمد شاہد حسین، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صدر شعبہ اردو پروفیسر وہاج الدین علوی اور ڈاکٹر محمد فیروز دہلوی نے کی اور مہمان اعزازی کی حیثیت سے غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر سید رضا حیدر نے شرکت کی جب کہ نظامت ڈاکٹر خالد مبشر نے کی۔ تحقیقی اور تنقیدی اجلاس کے مقالہ نگاروں میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے ڈاکٹر انوارالحق، ثاقب عمران، شہنواز فیاض، سلمٰی رفیق شامل تھے۔ جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی سے ڈاکٹر عبدالرافع، دھرم ویر سنگھ، فاروق اعظم مشکی پوری، فیاض احمد وجیہ، جب کہ دہلی یونی ورسٹی سے ڈاکٹر شازیہ عمیر، ڈاکٹر سرفراز اور عزیر احمد نے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ سبھی مقالے اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد تھے۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے کہا کہ اکادمی کی

'نئے پرانے چراغ' کے افتتاحی پروگرام کا منظر

جانب سے مقالے لکھوائے جائیں، جس پر نقد انعام بھی رکھا جائے تا کہ نوجوانوں میں مقابلے کا جذبہ بھی پیدا ہو سکے۔ ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی سے نئے پرانے چراغ وابستہ ہو چکا ہے، جس کا انتظار اساتذہ اور اسکالروں کو پورے سال رہا کرتا ہے۔ کسی بھی زبان میں ریسرچ اسکالروں کا اتنا بڑا اجتماع دیکھنے کو نہیں ملتا ہے۔ آخری اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر شمس الحق عثمانی، پیغام آفاقی، پروفیسر عراق رضا زیدی شامل تھے جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ابوظہیر ربانی نے انجام دیے۔ اس تخلیقی اجلاس کے افسانہ نگاروں میں پروفیسر غضنفر، پروفیسر ابن کنول، مشرف عالم ذوقی، جی آر سید، ڈاکٹر نگار عظیم، ڈاکٹر غزالہ قمر، ڈاکٹر پرویز شہریار، ڈاکٹر نشاں زیدی اور ذاکر فیضی نے اپنے افسانے پیش کیے۔ صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر شمس الحق عثمانی نے کہا کہ ادبی دنیا میں صنف افسانہ کا تناسب کافی کم رہ گیا ہے۔ یہ پورے معاشرے کی پیدا کردہ کوتاہی ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ آج کم از کم غلام عباس اور بلونت سنگھ بھی پیدا نہیں ہو پا رہے ہیں۔ پروفیسر عراق رضا زیدی نے کہا کہ بلاشبہ اردو اکادمی دہلی کا یہ سہ روزہ سیمینار نئے پرانے چراغ تربیت کا ذریعہ ہے۔ پیغام آفاقی نے کہا کہ نئے پرانے چراغ روایت کی حیثیت اختیار کر چکا ہے عمدہ روایت اردو اکادمی دہلی کے لوگوں کی محنتوں کا ثمرہ ہیں۔

'نئے پرانے چراغ' کا تحقیقی و تنقیدی اور تخلیقی اجلاس نہایت تزک و احتشام کے ساتھ اختتام پذیر ہوا جس میں کم و بیش 50 مقالے اور افسانے پیش کیے گئے۔ تحقیقی و تنقیدی اجلاس کی صدارت این سی ای آر ٹی کے پروفیسر محمد نعمان خان، ہندوستانی زبانوں کے مرکز جواہر لعل نہرو یونی ورسٹی کے استاذ پروفیسر مظہر مہدی اور شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کے سابق صدر پروفیسر توقیر احمد خاں نے کی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے شرکت کی جب کہ نظامت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ریسرچ اسکالر سلمان فیصل نے کی۔ اس سیشن میں جامعہ ملیہ اسلامیہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی اور دہلی یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالرز نے اپنے اپنے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر نعمان خاں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ سیمیناروں میں محققین، ناقدین، افسانہ نگاروں، اور شاعروں کو سننے کا موقع ملتا ہے جو کہ ماہرین کی صف میں شمار ہوا کرتے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر مظہر مہدی نے کہا کہ سبھی مقالات کافی پرمغز اور معیاری تھے جنھیں سن کر یہ اعتراف لازمی ہے کہ اسکالرز محنت کر رہے ہیں۔ انھوں نے فرداً فرداً سبھی مقالات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ تیسرے صدر پروفیسر توقیر احمد خاں نے کہا کہ موضوعات اور زبان و بیان سبھی لحاظ سے مقالے بہت ہی اچھے تھے۔ مہمانِ خصوصی پروفیسر خواجہ اکرام نے کہا کہ سبھی مقالے بڑی محنت کے ساتھ قلم بند کیے گئے ہیں جو خوش آئند بات ہے۔ تیسرے دن کے آخری اجلاس کی مجلس صدارت میں پروفیسر صادق، ترنم ریاض اور شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی کے استاذ ڈاکٹر علی جاوید شامل تھے جب کہ نظامت نوشاد منظر نے کی۔ انور نزہت، انجم عثمانی، اقبال مہدی، رخشندہ روحی، نعیمہ جعفری پاشا، ڈاکٹر شعیب رضا خان وارثی، نورین علی حق، شاداب تبسم نے افسانے پڑھے۔ پروفیسر صادق نے کہا کہ اقبال مہدی کا انداز اور اسلوب لاجواب تھا۔ انھوں نے جو کردار پیش کیا ہے وہ معدوم ہوتا جا رہا ہے۔ معروف افسانہ نگار ترنم ریاض نے کہا کہ خواتین افسانہ نگار کافی متحرک ہیں، جنھوں نے زندگی کے تمام پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ نورین نے نوجوانوں کے درد کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر علی جاوید نے کہا کہ اس تخلیقی اجلاس میں جو افسانے پیش کیے گئے وہ کافی اچھے اور تازہ ترین موضوعات پر مبنی تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18، 19، 20 جون 2014

غالب انسٹی ٹیوٹ اور رامپور رضا لائبریری کے زیر اہتمام مخطوطات کی اہمیت پر منعقدہ سیمینار میں مائک پر: پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی، ڈاکٹر رضا حیدر، پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، پروفیسر عرفان حبیب، شاہد ماہلی

مخطوطات کی اہمیت

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ اور رامپور رضا لائبریری کے زیر اہتمام 'رامپور رضا لائبریری اور غالب انسٹی ٹیوٹ میں موجود فارسی اور اردو کے مخطوطات، تاریخ، ادب اور ثقافت کے مآخذ' کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں انسٹی ٹیوٹ آف پرشین ریسرچ (اے ایم یو) کی ڈائرکٹر پروفیسر آذرمی دخت صفوی نے رام پور رضا لائبریری اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے مخطوطات کا تفصیلی جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان دونوں لائبریریوں میں رکھے ہوئے مخطوطات ہماری علمی، ادبی، تہذیبی اور تاریخی زندگی کا نہایت قیمتی سرمایہ ہے۔ انھوں نے رضا لائبریری کے مخطوطات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ یہاں رکھے ہوئے مخطوطات اتنے نادر اور نایاب ہیں کہ اس کی مثال دنیا کے کسی خطے کی لائبریری میں کم ہی دکھائی دیتی ہے۔ اس موقعے پر رام پور رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کہا کہ رضا لائبریری رام پور میں موجود بیشتر مخطوطات ایسے ہیں جن کا پوری دنیا میں کوئی دوسرا نسخہ موجود نہیں ہے۔ یہاں عربی، فارسی، ارو، پشتو، سنسکرت، ترکی اور دیگر زبانوں کے تقریباً 17 ہزار مخطوطات ہیں جو اپنے سرمایہ کے اعتبار سے پورے برصغیر میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ یقیناً یہ سیمینار طلبہ، ریسرچ اسکالر، اساتذہ اور اہل علم کے لیے کافی معاون ثابت ہوگا۔ مہمان خصوصی پروفیسر سید عرفان حبیب نے اس بات پر زور دیا کہ آج بھی اس ملک میں مخطوطات کا اتنا عظیم سرمایہ موجود ہے کہ جتنا اہم اور معتبر سرمایہ دنیا کے کسی ملک میں کم ہی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے کہا کہ مخطوطات ہماری علمی ادبی، تہذیبی اور تاریخی وراثت کا اتنا عظیم سرمایہ ہیں کہ اگر ہم نے ان پر توجہ نہیں دی تو ہم ماضی سے کٹ جائیں گے اور ہماری شناخت ختم ہو جائے گی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد دو اور اجلاس ہوئے جس میں پروفیسر شریف حسین قاسمی، پروفیسر ریحانہ خاتون، پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر نسیم احمد نے صدارتی فریضے کو انجام دیا اور ڈاکر کلیم اصغر، ڈاکٹر اخلاق احمد آہن، شاہد ماہلی، ڈاکٹر ارشاد ندوی، پریتی اگروال اور سید نوید قیصر شاہ نے مقالات پیش کیے۔ ان دونوں اجلاس کی نظامت ڈاکٹر کلیم اصغر اور سید نوید قیصر شاہ نے کی۔

سیمینار کے دوسرے دن اردو و فارسی کے اہم اسکالرز نے رضا لائبریری رامپور اور غالب انسٹی ٹیوٹ میں موجود مخطوطات کی اہمیت و افادیت پر اہم گفتگو کی۔ دوسرے دن کے پہلے اجلاس میں ڈاکٹر قمر عالم، ڈاکٹر احتشام الدین، پروفیسر حسن عباس، ڈاکٹر شمس بدایونی، پروفیسر عراق رضا زیدی، پروفیسر ریحانہ خاتون، پروفیسر چندر شیکھر، پروفیسر شریف حسین قاسمی نے رامپور رضا لائبریری اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ان ہم مخطوطات پر گفتگو کی۔ اس اجلاس کی

صدارت پروفیسر آذرمی دُخت صفوی اور پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کی اور نظامت ڈاکٹر شعیب رضا خان نے کی۔ سیمینار کے آخری اجلاس میں ہیمنت شکلا، ساجدہ شیروانی، ڈاکٹر تبسم صابر، ڈاکٹر مشتاق تجاروی، ڈاکٹر وسیم بیگم اور پروفیسر نسیم احمد نے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ڈاکٹر وسیم نے 400 صفحات پر مشتمل غالب انسٹی ٹیوٹ سے شائع 'دیوانِ عارف' کا جائزہ لیا جسے انھوں نے خود ترتیب دیا ہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر شمس بدایونی، پروفیسر حسن عباس اور پروفیسر چندر شیکھر نے صدارتی فریضے کو انجام دیا اور نظامت ڈاکٹر سہیل انور نے کی۔ سیمینار کا اختتام رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر سید محمد عزیز الدین اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر کے اظہار تشکر سے ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15، 16 جون 2014

امیر خسرو اور موسیقی

رام پور: رضا لائبریری میں 'امیر خسرو اور موسیقی' پر لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ وشو بھارتی یونیورسٹی کولکاتا میں شعبہ موسیقی کی پروفیسر ڈاکٹر موسمی رائے نے حضرت امیر خسرو پر اپنے توسیعی خطبہ میں کہا کہ خسرو ایک اچھے گلوکار اور موسیقی کے استاد

پروفیسر ڈاکٹر موسمی رائے حضرت امیر خسروؒ پر توسیعی خطبہ پیش کرتے ہوئے

تھے۔ انھوں نے بتایا کہ وینا ہندوستان کا قدیمی ستار تھا لیکن خسرو نے تین تاروں کا باجہ بنایا جو آگے چل کر ست تار کا بن گیا۔ انھوں نے بتایا کہ فقیر اللہ کے ذریعہ راگ درشن نام سے اورنگ زیب کے زمانہ میں کیے گئے فارسی ترجمہ میں کہا گیا ہے کہ امیر خسرو بہت اچھے گلوکار تھے اور اپنے دور کے مشہور گویئے گوپال نائک کو ہرا کر انھوں نے نائک کا مرتبہ حاصل کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ امیر خسرو کی خصوصیت یہ تھی کہ کہ وہ ایرانی اور ہندوستانی موسیقی میں بے مثال تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ فارسی کے صدر پروفیسر سید عراق رضا زیدی نے کہا کہ امیر خسرو کا اصل مقصد ہندوستان میں ایسی تہذیب کو قائم کرنا تھا۔ ہر شخص جسے اپنا کلچر سمجھے۔ انھوں نے بتایا کہ خسرو نے موسیقی کے ذریعہ اپنا پیغام دنیا میں پھیلایا۔ انکم ٹیکس کمشنر اجے کمار نے کہا کہ امیر خسرو کی موسیقی اور طلبہ کو تو ہم یاد کر رہے ہیں لیکن ان کے صوفیانہ خیالات کو فراموش کر رہے ہیں جس نے ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو میل محبت کا پیغام دیا۔ ڈائرکٹر رضا لائبریری پروفیسر سید محمد عزیز الدین حسین نے کہا کہ حضرت نظام الدین اولیا اور امیر خسرو کے دہلی آنے سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ حضرت نظام الدین اولیا حضرت امیر خسرو سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ تب ہی نظام الدین اولیا نے کہا تھا اگر شریعت اجازت دے تو میں وصیت کرتا ہوں کہ امیر خسرو کو میری قبر میں دفن کیا جائے۔ آخر میں امیر خسرو کا کلام ڈاکٹر موسمی رائے نے سنایا۔ اس موقع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر اقتدار محمد خاں، اظہر عنایتی، انکم ٹیکس افسر مصطفی علی خاں، آکاش وانی کے ڈائرکٹر ثروت عثمانی، ڈاکٹر مہدی حسن وغیرہ موجود تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 9 جون 2014

'شمیم کرہانی صدی تقریبات' سیمینار میں شمیم حنفی خطاب کرتے ہوئے جبکہ اسٹیج پر پروفیسر علی احمد فاطمی، خواجہ محمد اکرام الدین، آصف اعظمی، معید رشیدی ودیگر

شمیم کرہانی صدی تقریبات

نئی دہلی: ممتاز شاعر شمیم کرہانی نے ہماری روایت کی توسیع کی ہے جو ایک بہت بڑی خدمت ہے اس لیے ہم سب پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ ہم ایسے لوگوں کو ہمیشہ یاد رکھیں۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شمیم حنفی نے غالب انسٹی ٹیوٹ میں کیا۔ وہ شمیم کرہانی میموریل ٹرسٹ باشتراک عبدالرحیم میموریل ایجوکیشنل ٹرسٹ کے زیر اہتمام ممتاز اردو شاعر شمیم کرہانی کی صدی تقریبات کے موقع پر منعقد قومی سیمینار سے خطاب کر رہے تھے۔ اس تقریب کی صدارت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے کی۔ اس موقع پر استقبالیہ کلمات آئیڈیا کمیونیکیشنز کے ڈائرکٹر اور پروگرام آرگنائزنگ کمیٹی کے چیئرمین آصف اعظمی نے پیش کیے۔ نظامت معید رشیدی نے کی۔

پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ شمیم کرہانی نے بنیادی اور مرکزی روایت کی ترقی میں معنی خیز کردار ادا کیا ہے جس سے ہماری نئی نسل کو مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔ اپنے صدارتی خطبے میں ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ آج شمیم کرہانی کو یاد کیا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اپنے اسلاف کو یاد رکھنا ہماری ذمے داری ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ شمیم کرہانی کی شاعری ایک دور کا اعلانیہ ہے۔ ان کی شاعری ہر دور میں دل و دماغ کو گرماتی رہے گی، جسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ سیمینار میں عابد کرہانی، ڈاکٹر حسن مثنیٰ، ڈاکٹر عمیر منظر، ڈاکٹر محمد اختر نے شمیم کرہانی کی حیات وخدمات پر مقالے پیش کیے۔ اس موقع پر بڑی تعداد میں محبانِ اردو نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 جون 2014

رسالہ 'تہذیب الاخلاق' اب انٹرنیٹ پر

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ماہانہ اردو رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کو آن لائن کر دیا گیا ہے تاکہ دنیا بھر کے اردو قارئین کو 144 سالہ قدیم یہ اردو ماہنامہ اب انٹرنیٹ کے توسط سے پڑھنے کا موقع مل سکے۔ ملک کے عظیم مصلح قوم سرسید احمد خاں نے 1870 میں پہلی بار یہ ماہنامہ شائع کیا تھا۔ جدید تعلیم کی ترویج واشاعت اور قوم کی اصلاح کے لیے سرسید احمد خاں نے صحافت کو وسیلہ بنایا تھا۔ سرسید کے انتقال کے بعد بھی یہ ماہنامہ 1907 تک شائع ہوتا رہا۔ سید حامد کے وائس چانسلر کے دور میں اس کی اشاعت پھر سے عمل میں آئی جو مسلسل جاری ہے۔

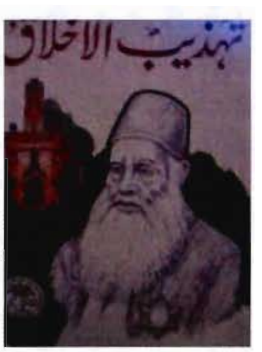

وائس چانسلر (ر) ضمیر الدین شاہ نے سرسید کے مشن کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے اس ماہنامہ کے موجودہ مدیر پروفیسر صغیر افراہیم کو 'تہذیب الاخلاق' کو آن لائن کیے جانے کے احکامات جاری کیے تھے جن کے تحت جون

2014 سے اس 144 سال قدیم ماہنامہ کو آن لائن کر کے یونیورسٹی ویب سائٹ پر مہیا کرا دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اے ایم یو گزٹ کو بھی آن لائن کر دیا گیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گزٹ بھی 1866 میں سرسید احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے شروع کیا تھا تا کہ سائنٹفک سوسائٹی کی سرگرمیوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ قارئین میں سائنسی بیداری پیدا کی جاسکے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 جون 2014

شہید وطن مجو خاں کی یاد میں سیمینار کا انعقاد

مراد آباد: شہید وطن نواب مجید الدین عرف مجو خاں کی یاد میں ایک سیمینار اور کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ شہید وطن نواب مجو خاں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے بڑی تعداد میں اہل علم اور شعرائے کرام نے تاریخی عمارت مراد آباد گورنمنٹ انٹر کالج کے میدان میں جمع ہوئے۔ اس موقعے پر ضلع انتظامیہ کے تمام عہدیداران نے شرکت کی۔ مراد آباد کی تاریخ میں 1947 کے بعد پہلی مرتبہ گورنمنٹ کالج میں مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا۔ نواب مجید الدین عرف مجو خاں نے مادر وطن کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان کو قربان کر دیا وہ انگریزوں کے خلاف بڑی بہادری کے ساتھ لڑے جس کے بعد انگریزوں نے کچھ غداروں کو ملا کر دھوکہ سے انھیں گرفتار کر لیا اور انھیں شہید کر دیا گیا انھوں نے بہت سارے انگریز فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ مجو خاں کی یاد میں مشاعرہ کی صدارت مشہور صحافی عزیز برنی نے کی، نظامت کے فرائض جاوید رشید عامر نے انجام دیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 16 جون 2014

اودے پور میں انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ کا قیام

راجستھان/اودے پور: انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخوں کے احیا کے سلسلے کے نتیجے میں راجستھان کے شہر اودے پور میں انجمن کی شاخ کا قیام تزک و احتشام کے ساتھ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کی قیادت میں ہوا۔ اس موقعے پر مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی بھی موجود تھے۔ اس موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو کے ڈائرکٹر نے اس بات کا اعلان کیا کہ قومی اردو کونسل جو شمال مشرقی ریاستوں میں بھی تمام تر مشکلات کے باوجود قابل ذکر کام کر رہی ہے، وہ اودے پور کو اردو کے نئے مرکز کے طور پر فروغ دے گی۔ انھوں نے اودے پور میں تین سالانہ لیکچرز کروانے کا اعلان کیا، جس میں سے ایک موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی میں مخمور سعیدی کے نام موسوم ہوگا۔ ایک لیکچر انجمن ترقی اردو اودے پور شاخ اور ایک گورنمنٹ میرا گرلس کالج میں منعقد ہوگا۔ انھوں نے اردو خطاطی اور عربی و فارسی کے فروغ کے لیے قومی اردو کونسل کے مراکز کے قیام کا بھی اعلان کیا۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی اودے پور شاخ کے تاسیسی جلسے کی صدارت مرکزی انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ثروت خاں، پروفیسر پریم سنگھ بھنڈاری اور پروفیسر فاروق بخشی کے اسمائے گرامی بھی قابل ذکر ہیں، جنھوں نے اپنے مفکرانہ خیالات سے ناظرین کو اس بات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی کہ کس طرح اردو کی ہمہ جہت ترقی ہوسکتی ہے۔ موہن لال سکھاڈیا یونیورسٹی میں صدرِ شعبۂ اردو پروفیسر فاروق بخشی نے اردو کی ترقی و فروغ کے لیے متعدد تجاویز پیش کیں۔ اس موقعے پر مستان چنچل نے ایک فی البدیہہ نظم موقعے کی مناسبت سے پیش کی اور محترمہ زہرہ خاں نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ انجمن ترقی اردو شاخ اودے پور کے سکریٹری پروفیسر پریم سنگھ بھنڈاری کے شکریے پر یہ جلسہ اختتام پذیر ہوا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 جون 2014

انڈونیشیائی وفد کے ساتھ پروفیسر وہاج الدین علوی، پروفیسر اقتدار محمد خاں، ڈین فیکلٹی اور مختلف شعبوں کے صدور دیکھے جاسکتے ہیں

انڈونیشیائی وفد کا جامعہ ملیہ اسلامیہ کا دورہ

نئی دهلی: اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ فار اسلامک اسٹڈیز آف نارتھ سماترا، انڈونیشیا اور محمدیہ تحریک کی علمی سرگرمیوں پر مشتمل ایک وفد نے پروفیسر ڈاکٹر الہام الدین ایم اے وائس ریکٹر کی رہنمائی میں جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فیکلٹی آف ہیومنٹیز اینڈ لینگویجز کے ڈین کے دفتر میں فیکلٹی کے مختلف شعبوں کے صدور سے ملاقات کی۔ وفد میں آئے مہمانوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ عربی اور فارسی کے بعد اردو ایک ایسی زبان ہے جس میں اسلامی امور و علوم کا عظیم ذخیرہ موجود ہے اور اسی وجہ سے وہ ہندوستان آئے ہیں تا کہ یہاں سے اردو اور اسلامک اسٹڈیز کا بڑا تجربہ حاصل کر کے اپنے ملک واپس یونیورسٹی میں اس طرزِ تعلیم کو عام کریں۔ وفد نے مزید اعادہ کیا کہ ہم وہاں اسلامک اسٹڈیز کی تعلیم و تدریس کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی تعلیم عام کرنا چاہتے ہیں۔ انڈونیشیائی وفد کے رہنما پروفیسر ڈاکٹر الہام الدین اور ڈین فیکلٹی آف ہیومنٹیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے درمیان باہمی تعاون کے معاہدے پر دستخط ہوئے اور اس بات پر اصرار رہا کہ دونوں ممالک کے اساتذہ، ریسرچ اسکالرس اور طلبہ باہم ایک دوسرے ملک کے تعلیمی اداروں میں علمی سفر کریں گے اور ایک دوسرے سے استفادہ کریں گے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 جون 2014

فلم 'لطیف' میں اقبال کی نظم

ممبئی: ممبئی کے کرشنا آڈیو اسٹوڈیو (گوریگاؤں) میں آنے والی فلم 'لطیف: دی کنگ آف کرائم' کے لیے علامہ اقبال کی مشہور نظم 'لب پہ آتی ہے دعا' گلوکار شاہد ملیا کی آواز میں ریکارڈ کی گئی۔ شاہد ملیا 'غنڈے'، 'میلا پگلا دیوانہ' اور 'اسٹوڈنٹس آف دی ایئر' جیسی فلموں میں گیت گا چکے ہیں۔ مذکورہ بالا نظم کی کمپوزنگ موسیقار سلیم سین نے کی ہے۔ اس بابت فلمساز کیول کرشنا نے کہا "علامہ اقبال کی نظم 'لب پہ آتی ہے دعا' میں امن کا پیغام دیا گیا ہے۔ ہم اس نظم کو فلم کے آخر میں پیش کریں گے کیونکہ امن ہی فلم بنانے کا ہمارا مقصد ہے۔"

'لطیف: دی کنگ آف کرائم' میں مرکزی کردار حمید خان ادا کر رہے ہیں۔ اس فلم کے ہدایت کار شارق منہاج نے اس نظم کے بارے میں کہا "ہندوستان اور پاکستان کے مدارس میں اس نظم کے ذریعے دن کی شروعات کی جاتی ہے۔ ہم اسے فلم میں استعمال کر کے اُسے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' جیسی مقبولیت دلانا چاہتے ہیں۔"

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 جون 2014

دهلی:

رابطہ ادب اسلامی دہلی کا جلسہ

نئی دهلی: "مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی نگارشات کا امتیازی وصف ان کی ادبیت اور انشا پردازیت ہے انھیں پڑھ کر علمی اضافہ کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق سلیم کی تسکین بھی ہوتی ہے۔ ان کا یہ وصف ان کی قرآن فہمی اور قرآنی آیات کی لغوی ادبی اور ابلاغی تشریحات میں بھی نمایاں ہو کر دلکشی و

دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔'' ان خیالات کے ساتھ رابطہ ادب اسلامی ہند، نئی دہلی کے سیمینار ہال واقع ڈی 223، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر میں ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی (سکریٹری تصنیفی اکادمی جماعت اسلامی ہند) نے اپنے مقالے کا آغاز کیا۔ انھوں نے مولانا کے کیے ہوئے قرآنی آیات کے تراجم کی روشنی میں برصغیر ہند و پاک کے مختلف مترجمین کے درمیان موازنہ پیش کیا، اور بتایا کہ ان سب کے تراجم قابل قدر اور عظیم الشان ہیں۔ نائب صدر رابطہ ادب اسلامی ہند پروفیسر شفیق احمد خاں ندوی (پروفیسر ایمریٹس عربی/یو جی سی، جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے افتتاحی کلمات کے طور پر کہا کہ مولانا کا اصل جوہر تو ان کی ادبی تعبیرات ہی میں جلوہ گر ہوتا ہے الفاظ و معانی کا حسن امتزاج، جذبات کی قوت، صداقت، تعبیر کا تنوع اور فکر کی بلند پروازی کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، ہندی، اردو زبانوں کی مٹھاس اور دلکشی و رعنائی جس طرح ان کی ترجمانی و تعبیر میں منعکس ہوتی ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ جلسہ کا آغاز ڈاکٹر قمر شعبان ندوی کی تلاوت کلام پاک سے اور اختتام رابطہ کے سکریٹری غیاث الاسلام صدیقی ندوی کے اظہار تشکر پر ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 جون 2014

دہلی میں اردو کی زبوں حالی پر اردو طبقہ میں بے چینی

نئی دھلی: دہلی میں سرکاری مشینری کے ذریعے اردو کو آہستہ آہستہ ختم کرنے کی سازش سے اردو حلقہ میں بے چینی

خواجہ محمد اکرام الدین، انیس اعظمی، ڈاکٹر سید احمد خاں، ماسٹر فرید احمد

کے ساتھ ساتھ غم و غصہ بھی پایا جارہا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ متعلقہ افسران خود اس بات کا اعتراف کر رہے ہیں کہ اردو اساتذہ کی کافی کمی ہے اس کے باوجود بھی وہ ان کی بحالی پر توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ یہ معاملہ صرف دہلی حکومت کے ماتحت اسکولوں کا ہی نہیں بلکہ کارپوریشن کے اسکولوں کا بھی یہی حال ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ بطور لینگویج اردو اساتذہ کا تو تقرر ہوتا رہا ہے مگر اردو سبجیکٹ ٹیچر کا تقرر 1995 سے نہیں کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میڈیم اسکولوں میں بھی ایسے ٹیچر پڑھا رہے ہیں جن کا اردو سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کو اس معاملے میں سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں (شاعر، ادیب، اداروں وغیرہ) کو متحد ہو کر اپنی آواز حکومت کے کانوں تک پہنچانی چاہیے۔

دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی نے کہا کہ ان سب حالات پر نظر رکھنے کے لیے ایک کمیٹی بننی چاہیے اور ریسرچ کرکے یہ دیکھنا چاہیے کہ کہاں کہاں کیا ضرورت ہے۔ حق تعلیم ایکٹ کے تحت سبھی بچوں کو بنیادی تعلیم ملنی چاہیے اور یہ ان کا حق ہے۔ یہ ملک نوجوانوں کا ہے اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق تعلیم دی جانی چاہیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 جون 2014

اردو ڈراما فیسٹول کا اختتام

نئی دھلی: اردو اکادمی دہلی کے زیراہتمام اردو میڈیم اسکول کے بچوں کے لیے گرمی کی چھٹیوں میں لگائی گئی ایک ماہ کی تھیٹر ورکشاپ اور اس کے بعد منعقد کیا گیا۔ 2 روزہ اردو ڈراما فیسٹول اختتام پذیر ہوگیا۔

اکادمی نے اس سال پہلی بار لڑکیوں کے لیے علیحدہ تھیٹر ورکشاپ سینٹر قائم کیا جو ایس کے وی نمبر 2 جامع مسجد دہلی میں تھا۔ اس کیمپ کی ڈائرکٹر و اسسٹنٹ ڈائرکٹر بھی خواتین تھیں۔ دوسرا سینٹر آغا خاں فاؤنڈیشن فار کلچر کے اشتراک سے بستی حضرت نظام الدین میں قائم کیا گیا تھا۔ ایک ماہ کے ڈراما تربیتی پروگرام میں ڈرامے کو اسٹیج کرنا بھی شامل کیا گیا تھا۔ جن کا مظاہرہ ان بچوں نے 20 اور 21 جون

کی شام لودھی روڈ پر واقع چنمیا مشن آڈیٹوریم میں کیا۔ 20 جون کو نشا ترویدی کی ہدایت میں ''دادی اماں مان بھی جاؤ'' پیش کیا گیا۔ جس میں تعلیم کی اہمیت اور افادیت کو بہت موثر طریقے سے بیان کیا گیا۔ ڈرامے کی زبان 50 سال پہلے کی پرانی دلی کی زبان تھی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ دادی کے کردار میں ادیبہ ناز اماں کے کردار میں سامعہ ناز اور دادی کی تین پوتیوں ثمینہ، فہمینہ اور روبینہ یعنی سمن رانی، غانیہ عتیق اور ہاجرہ خلیق نے بے حد متاثر کیا۔ بستی حضرت نظام الدین مرکز کی ڈراما ورکشاپ میں تیار کردہ مزاحیہ ڈراما 'گڑبڑ جھالا' پیش کیا گیا جو زمانہ قدیم میں ایک کم عقل بادشاہ اور ایک بے پناہ چالاک مکار اور عیار مالشیے کی داستان پر بنی تھا۔ اس کے ہدایت کار محمد ندیم خان تھے۔ اس ڈرامے میں تقریباً 42 بچے تھے اور سبھی کی اداکاری نے سامعین کو متاثر کیا۔ ان ننھے منے اداکاروں میں راجا کے کردار میں سمیر، مالشیے کے کردار میں دلیپ کمار اور اُس کی بیوی کے کردار میں صفیہ انصاری، وزیر اعظم کے کردار میں سلمان خان اور وزیر کی بیٹی کے کردار میں ایمن صدیقی نے بے پناہ متاثر کیا۔ دونوں ڈراموں کی اسکرپٹ انیس اعظمی کی تحریر کردہ تھیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 29 جون 2014

ہندی، اردو، پنجابی شعری نشست کے انعقاد کا منظر

ہندی، اردو، پنجابی شعری نشست

نئی دھلی: سہ لسانی شعرا کی مشترکہ بزم محفل گنگ وجمن کی شعری نشست کا انعقاد غالب اکادمی میں کیا گیا جس کی صدارت دہلی کے استاد شاعر وقار مانوی نے اور نظامت ڈاکٹر ظفر مرادآبادی نے کی۔ مہمان خصوصی میں اے رحمن، چیئرمین عالمی اردو ٹرسٹ، سردار ہربجن سنگھ رتن، آدیش تیاگی اور ڈاکٹر عقیل احمد سکریٹری غالب اکادمی اس پروگرام میں موجود تھے۔ اس موقعے پر اے رحمن نے سہ لسانی شعرا پر مشتمل ایک وفد پاکستان بھیجنے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس سلسلے میں کوشش کر رہے ہیں اور عنقریب اس کے نتائج سامنے آئیں گے۔ اس شعری نشست میں وقار مانوی، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی، عادل رشید، احمد علی برقی اعظمی، عرفان طالب، نعیم بدایونی، ناگیش چندر، شیام نندہ نور، وشال باغ، پرمود شرما اثر، آرسی ورما ساحل، ظہیر راہی، میناکشی جیوی شی، عبدالرحمن منصور، متین امروہوی کے علاوہ اور دیگر شعرا شریک تھے۔ ظفر مرادآبادی کے شکریے کے ساتھ اس محفل کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 10 جون 2014

اردو ہندی ایکتا منچ کی ادبی نشست

نئی دھلی: اردو ہندی ایکتا منچ کے زیر اہتمام اردو بازار میں محمد ذاکر حسین کی رہائش گاہ پر ادبی پروگرام میں محمد فرید قریشی نے اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین خالد محمود کی قیادت میں اردو زبان کے فروغ کے حوالے سے امید ظاہر کی کہ دہلی اردو اکادمی اپنی روایت کے پیش نظر اردو کی ترقی و فروغ میں بے لوث خدمت انجام دے گی۔ مہمان خصوصی اسلم بیتاب کے اعزاز میں اس ادبی نشست میں انھوں نے کہا کہ مستقبل میں مسلم بچے ترقی کے میدان میں مزید نام روشن کر سکیں گے۔ اسلم بیتاب نے مذکورہ تنظیم کے ادبی کاموں کی ستائش کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا اور توقع ظاہر کی کہ تنظیم اردو کی ترقی میں اپنی خدمات انجام دے گی۔ اس موقعے پر اردو ہندی منچ کے صدر محمد فرید قریشی نے اعلان کیا کہ وہ دہلی کے علاقوں میں جا کر اردو کی بقا و ترقی کے لیے کوی سمیلن اور مشاعروں کے لیے زمین ہموار کریں گے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 جون 2014

اتر پردیش:

اتر پردیش اردو اکادمی کا آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر

لکھنؤ: اتر پردیش اردو اکادمی، اردو مضمون کے ساتھ سول سروسیز کا امتحان دینے کے خواہشمند طلبہ کے لیے 'اردو آئی اے ایس اسٹڈی سنٹر' شروع کرنے جا رہی ہے جس کے لیے ریاستی حکومت نے یکمشت گرانٹ کے طور پر ایک کروڑ روپے منظور کیے ہیں۔ یہ اسٹڈی سنٹر اردو مضمون کے ساتھ سول سروسیز (آئی اے ایس، آئی پی ایس، آئی ایف ایس وغیرہ) مقابلہ جاتی امتحان دینے کے خواہشمند طلبہ و طالبات کے لیے قائم کیا جا رہا ہے، جس میں کوچنگ کے لیے کوئی فیس نہیں لی جائے گی، تا کہ غریب طلبہ بھی اس سے فیض یاب ہو سکیں اور اردو مضمون کے ساتھ اعلیٰ ترین ایڈمنسٹریٹو سروس میں جانے کا موقع دستیاب ہو سکے اور اس کا فائدہ لسانی اقلیتیں اٹھا سکیں۔ یوپی اردو اکادمی کے چیئرمین نواز دیوبندی نے یہ اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ اردو اکادمی کا

دائرۂ کار اتر پردیش ہے، مگر اس سنٹر کا دائرہ کار پورا ہندوستان ہوگا اور کسی بھی ریاست کا امیدوار یہاں آ کر آئی اے ایس کی کوچنگ لے سکتا ہے۔ یوپی اردو اکادمی، سول سروسیز مقابلہ جاتی امتحان کا اسٹڈی سنٹر شروع کرنے والی پہلی سرکاری اکادمی ہوگی۔ نواز دیوبندی نے بتایا کہ ابتدائی مرحلہ میں 50 سے 60 سیٹیں رکھی جائیں گی جس میں طلبہ کا انتخاب داخلہ امتحان کے ذریعہ کیا جائے گا۔ اس کوچنگ میں وہ لوگ بھی شریک ہو سکتے ہیں جو اردو مضمون کے ساتھ انگریزی میڈیم سے امتحان دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اسٹڈی سنٹر کی فیکلٹی قابل ہاتھوں میں دی جائے گی تا کہ یہاں کے طلبہ کی کامیابی کا تناسب بہتر رہے۔

ایڈوائزری کمیٹی کے فیصلے کے مطابق تین ممبران پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی ہے جس میں ریٹائرڈ آئی اے ایس انیس انصاری، زہیر بن صغیر اور آر پی شکلا شامل ہیں۔ یہ کمیٹی داخلہ کے ضوابط اور شرطیں تیار کر کے ایڈوائزری کمیٹی کے اراکین کو بھیجے گی۔ چیئرمین اردو اکادمی نے اراکین کو یقین دلایا کہ کوچنگ سینٹر کو معیاری بنایا جائے گا، جس میں تعلیم اور کوچنگ سے وابستہ افراد سے صلاح و مشورہ لیا جاتا رہے گا۔ ایڈوائزری کمیٹی کی میٹنگ میں ریٹائرڈ آئی پی ایس منظور احمد، رضوان احمد، ریٹائرڈ آئی اے ایس بابو رام، آئی اے ایس زہیر بن صغیر، پروفیسر روپ ریکھا ورما، این سی پی یو ایل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی، ڈاکٹر انیس انصاری اور آر پی شکلا شریک تھے۔ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر شمیم احمد نے بتایا کہ کوچنگ سنٹر کا کام تیزی سے جاری ہے اور ستمبر میں داخلے شروع ہونے کی امید ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 و 28 جون 2014

اردو کی ترقی کے لیے مکاتب و مدارس کی بقا ضروری

سدھارتھ نگر: اردو کی ترقی کے لیے مکاتب و مدارس کی بقا بے حد ضروری ہے۔ مکاتب مسلم معاشرہ کے لیے وہ قلعے ہیں، جہاں سے مسلمانوں کے اندر دینی جذبہ اور عقائد کی تعلیم دی جاتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ مدارس کی تعلیم کو پختہ اور منظم بنایا جائے، تا کہ جو لوگ بہتر تعلیم کے لیے عصری اسکولوں کا رخ کرتے ہیں وہ مدارس کا رخ کریں اور یہ اس وقت ممکن ہے جب مکاتب و مدارس کی تعلیم بہتر ہو۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مولانا عبدالرحمن نوری نے مدرسہ فیضان مصطفی ویلفیئر اینڈ ایجوکیشنل سوسائٹی میں تقریب اسناد و انعامات کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے کہا کہ مکاتب سے بچوں کے بنیادی عقائد درست ہوتے ہیں اور دین کی باتوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ اخبارات کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس بات کا اندازہ ضرور ہوگا کہ اردو کی بقا کے لیے ہمارے آبا و اجداد نے کتنی قربانیاں دی ہیں جب کہ اردو زبان صرف مسلمانوں کی میراث نہیں بلکہ سب کی ہے، اس لیے آزادی سے قبل سبھی مذاہب کے لوگ چاہے وہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی ہوں، اردو میں تعلیم حاصل کرتے تھے، لیکن آزادی کے بعد کچھ لوگوں نے اردو کو صرف مسلمانوں کی زبان بنا دیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 جون 2014

نور امروہوی کو استقبالیہ

امروھه: عالمی شہرت یافتہ شاعر اور امریکہ میں مسلسل گیارہ سالوں سے اردو زبان اور تہذیب کی شمع روشن کرنے والی امروہہ کی ممتاز شخصیت نور امروہی کے ہندوستان دورے پر انجمن ترقی اردو ریاست اتر پردیش نے ان کو ایک استقبالیہ پیش کیا۔ اپنے دو روزہ ہندوستانی دورے پر امروہہ پہنچے نور امروہی کے استقبال میں حکیم سراج الدین ہاشمی کی صدارت میں ایک جلسے کا انعقاد ہوا جس کا افتتاح نعت سرورِ کونین سے اسلم بقائی امروہی نے کیا جس کے بعد مولانا سعد امروہی و مہمان خصوصی نور امروہی نے بھی تحفہ نعت کا نذرانہ پیش کیا۔ ناظم جلسہ شوق امروہی نے نور امروہی کی علمی، ادبی ثقافتی و صحافتی خدمات سے شرکا جلسے کو روشناس کیا جس کے بعد دیگر مقررین نے بھی نور امروہی کو علم ادب امروہہ کی نئی نسل میں ادبی روایت کا پاسدار قرار دیتے ہوئے ان کو عالمی پیمانے پر زبان اردو کا دوست قرار دیا۔ نور امروہی نے اپنی تقریر میں کہا کہ امروہہ وہ مردم خیز بستی ہے جس نے تہذیب و ادب کے ساتھ فنون کی دنیا میں ہر دور میں اپنا منفرد مقام قائم کیا ہے۔ مزید اپنی تقریر میں اپنے ادارے آل نور کے حوالے سے نور امروہی نے کہا کہ آل نور کی کوشش ہے کہ مغربی دنیا کے کونے کونے میں اردو زبان کی چاشنی پہنچ جائے اور ادب سے وابستہ لوگ اس سے منسلک ہو جائیں۔ صدر جلسہ ڈاکٹر ہاشمی نے اس سلسلے میں مہمان خصوصی کو اعزاز سے سرفراز کرنے کے بعد ان کی شخصیت کا تحقیقی جائزہ پیش کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 28 جون 2014

بہار:

پروفیسر منصور عمر پر علمی مذاکرہ

دربھنگہ: مقامی ڈان باسکو اسکول میں پروفیسر منصور عمر: حیات و خدمات کے عنوان سے یکم جون 2014 کو ایک علمی مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت پروفیسر انیس صدری نے جبکہ نظامت کے فرائض شکیل احمد سلفی نے انجام دیے۔ پروگرام میں پروفیسر انیس صدری، پروفیسر عبدالمنان

پروفیسر منصور عمر پر علمی مذاکرے کا منظر

طرزی، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، پروفیسر شاکر خلیق ڈاکٹر ارشد جمیل، عطا عابدی، ڈاکٹر مجیر احمد آزاد، ڈاکٹر قیام نیر، ڈاکٹر امام اعظم، پروفیسر کمال الدین، شکیل احمد سلفی، احسان عالم، احتشام الحق، محمود بھارتی اور علاء الدین حیدر وارثی سمیت درجن بھر سے زائد اساتذہ، دانشوران اور اسکالر نے موضوع کی مناسبت سے مختلف عنوانات کے تحت مقالے پیش کر کے پروفیسر منصور عمر کی ادبی و علمی خدمات کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا۔ اس مذاکرہ میں شکیل احمد سلفی نے اپنی تمہیدی گفتگو میں منصور عمر کی ادبی وتنقیدی خدمات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ مشرقی ومغربی تنقیدی نظریات پر ان کی نہ صرف گہری نظر تھی بلکہ اردو ادب میں ان سے کس حد کام لیا جاسکتا ہے اور کون سا نظریہ اردو زبان وادب کے مزاج سے کتنا میل کھاتا ہے اس پر ان کا نظریہ واضح تھا۔ ڈاکٹر عبدالمنان طرزی نے اپنے طویل منظوم کلام میں پروفیسر منصور عمر کی شخصیت، ان کے افکار وخیالات، ذہن ومزاج اور عادتوں اور ان کے فکر وفن کی گرہ کشائی کی۔ پروفیسر شاکر خلیق نے منظوم کلام میں اپنے تاثرات پیش کیے جبکہ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، عطا عابدی اور ڈاکٹر امام اعظم کے مقالات میں منصور عمر کی شاعری کے مختلف ابعاد کو پیش کیا گیا۔ پروفیسر انیس صدری نے اپنے صدارتی خطبے میں منصور عمر کی شخصیت اور ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

پریس ریلیز، احتشام الحق، دربھنگہ بہار، 16 جون 2014

جموں و کشمیر:

کلچرل اکادمی سری نگر میں جلسہ تقسیم اعزازات

سرینگر: کلچرل اکادمی سرینگر میں ایک تقسیم اعزازات کی تقریب منعقد کی گئی جس میں وادی سے تعلق رکھنے والے فن کاروں قلم کاروں صحافیوں اور ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انھیں نقد انعامات اور اسناد کے علاوہ توصیفی سارٹیفکیٹ دیے گئے۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے ریاستی چیئرمین غلام نبی خیال کی سربراہی میں کلچرل اکادمی سرینگر میں ایک جلسہ تقسیم اعزازات منعقد کیا گیا جس میں وادی اور بیرون وادی کے نامور دانشور، صحافی، قلمکار، اور فن کاروں کی کثیر تعداد نے شرکت کی تقریب میں مہمان خصوصی معروف سینئر صحافی وید بھسین تھے ان کے علاوہ تقریب میں عالمی اردو ٹرسٹ کے مرکزی چیئرمین اے رحمن، قدوس جاوید، جی آر حسرت گھڑا، سرینگر ٹائمز کے کارٹونسٹ بشیر احمد بشیر، فاروقی نازکی بشیر عارف، میڈیا گلڈ کے ریاستی صدر بلال بزاز، وجہی اندرابی کے علاوہ دیگر لوگوں نے شرکت کی۔ عالمی اردو ٹرسٹ کے چیئرمین اے رحمن نے کہا کہ میں کشمیر آکر بہت خوش ہوا کیوں کہ یہاں پر ہوائی اڈے سے اتر کر ہی اردو میں سائن بورڈ لگے ہیں دکانوں اور دفتروں کے باہر بھی اردو میں ہی بورڈ دیکھنے کو ملتے ہیں جس کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ہم اردو کی وادیوں میں پہنچ گئے ہیں۔ کشمیر ٹائمز گروپ کے بانی وید بھسین نے کہا کہ اردو ایک میٹھی اور شیریں زبان ہے جس کو ریاستی سرکاروں نے نابود کرنے کے لیے کوئی کسر باقی نہیں رکھی ہے انھوں نے کہا کہ اردو زبان ریاست کے تینوں صوبہ، جموں کشمیر اور لداخ کو آپس میں جڑے رکھنے میں اہم رول ادا کر رہی ہے اور تینوں صوبوں کو ملانے کے لیے یہاں زبان ایک پل کا کام کر رہی ہے۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 22 جون 2014

اعزاز و اکرام:

یوپی اردو اکادمی کے انعامات برائے کتب

لکھنؤ: اردو اکادمی کی مجلس منتظمہ نے 2011 سے 2013 تک شائع شدہ اور انعامات کے لیے موصول کتابوں میں سے منتخب کتابوں پر انعامات کا اعلان کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ اردو اکادمی کی مجلس منتظمہ کی تشکیل نہ ہونے اور پارلیمانی انتخابات کے سبب ضابطہ اخلاق نافذ ہونے کی وجہ سے اکادمی کو موصول کتابوں پر انعامات کا اعلان نہیں کیا جاسکا تھا۔ اکادمی کی مجلس منتظمہ نے منتخب کتابوں پر 20 ہزار روپے، 15 ہزار روپے، 10 ہزار روپے اور 5 ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا ہے۔ 12-2011 کے لیے 20 ہزار روپے کا اعلان بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر و ادیب پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کو ان کی تصنیف 'شہر ادب' (تنقید) کے لیے دیا گیا۔ اسی طرح 'امعان نظر' (تنقید) کے لیے سید فضل امام رضوی 'امام ابوحنیفہ' (سوانح) ڈاکٹر مولوی محمد اسماعیل 'کہیں کچھ کھو گیا ہے' (افسانہ) انجم عثمانی اور موت کی کتاب (ناول) کے لیے خالد جاوید کو بھی 20-20 ہزار روپے کے انعامات دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ 12-2011 کے لیے دس کتابوں پر 15 ہزار روپے، 15 کتابوں پر 10 ہزار روپے اور 56 کتابوں پر پانچ ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔

اکادمی کی مجلس منتظمہ نے 13-2012 کے لیے جن پانچ کتابوں پر 20 ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا ہے ان میں تنقید و تفہیم (تنقید): قاضی عبیدالرحمن ہاشمی، سرسید اور جدیدیت (تحقیق و تنقید): پروفیسر افتخار عالم خاں، مرد حریت ٹیپو سلطان (تحقیق وتنقید): ڈاکٹر سی وائی ایس خاں، بیانات (تحقیق وتنقید): عتیق احمد اور کثرت تعبیر (تحقیق و تنقید: ابوالکلام قاسمی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ 13-2012 کے لیے کتابوں پر 15 ہزار روپے، 15 کتابوں پر 10 ہزار روپے اور 53 کتابوں پر 5 ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔ اسی طرح 14-2013 کے لیے تیزاب میں تیرتے پھول، اور شعری کلیات حصہ دوم (شاعری)، مظفر حنفی، تحقیق وتعارف (تحقیق) حنیف نقوی، اردو شاعری میں گیتا (ترجمہ) انور جلال پوری، اردو شاعری میں واقعات کربلا (تنقید) نسیم نکہت، عربی تنقید کا اثر (تنقید) مامون رشید کو 20 ہزار روپے کا انعام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ 10 کتابوں پر 15 ہزار روپے، 15 کتابوں پر 10 ہزار روپے اور 46 کتابو ں پر پانچ ہزار ردپے کے انعامات کا اعلان کیا گیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 جون 2014

صلاح الدین نیر کو حکومت تلنگانہ کا اعزاز

ممتاز شاعر و صحافی صلاح الدین نیر کو تاسیس تلنگانہ کے موقعے پر حکومت تلنگانہ کی جانب سے کلکٹر حیدرآباد مسٹر مکیش کمار مینا نے تہنیت پیش کرتے ہوئے باوقار اعزاز

جامعہ ابوہریرہ اسلامیہ لال گوپال گنج میں علمی وادبی تقریب کے انعقاد پر ڈاکٹر تابش مہدی اپنا کلام پیش کرتے ہوئے

سے نوازا۔ اس موقعے پر تلنگانہ مجاہدین آزادی کے علاوہ اردو اور تلگو کے شاعروں اور فنکاروں کو اعزازات پیش کیے گئے۔ جناب صلاح الدین نیر کو شاعر کی حیثیت سے یہ ایوارڈ پیش کیا گیا۔ فنکاروں کے زمرے میں خان اطہر کو اور شعبہ خواتین کے نمائندگی کے سلسلے میں محترمہ تسنیم جوہر کو تہنیت پیش کی گئی۔ جناب صلاح الدین نیر کو ماضی میں آندھرا پردیش کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر شیکھر ریڈی اور مسٹر چندرابابو نائیڈو نے بھی ریاست کے بہترین شاعر کا ایوارڈ پیش کیا تھا۔ تلگو یونیورسٹی اور ہندی یونیورسٹی کی جانب سے بھی اعزازات پیش کیے جا چکے ہیں۔ جس میں 20 شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی ادارت میں خوشبو کا سفر 17 برس سے لگاتار شائع ہو رہا ہے۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 4 جون 2014

اسرار جامعی کو استقبالیہ

نئی دہلی: یونائیٹڈ اکانومک فورم کے زیر اہتمام لودھی روڈ واقع انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں طنز و مزاح کے معروف شاعر اسرار جامعی کے اعزاز میں استقبالیہ اور مذاکرہ بعنوان 'اردو مزاحیہ شاعری: ماضی اور حال' کا انعقاد کیا گیا، جس کی صدارت پروفیسر محمد فاروق نے کی، جبکہ مہمانانِ ذی وقار کے طور پر ایڈیشنل ڈی سی پی محمد علی، صحافی خرم رضا اور شاعر و ادیب سید تالیف حیدر شامل تھے۔ نظامت ہمالیہ ڈرگ کمپنی دہرہ دون کے سربراہ ڈاکٹر سید فاروق نے کی، جبکہ فورم کے جنرل سکریٹری آصف اعظمی نے کلمات تشکر ادا کیے۔ اس موقعے پر اسرار جامعی کی خدمت میں دس ہزار روپے نقد،

پھل پھول اور دیگر میوہ جات پیش کیے گئے۔ مذاکرہ میں اردو زبان و ادب سے جڑی چند اہم شخصیات نے مزاحیہ شاعری کے گرتے معیار کو اردو کے زوال کی علامت قرار دیا۔ اس موقعے پر پروفیسر محمد فاروق نے کہا کہ "اردو میں جس طرح روز بروز مزاحیہ شاعری صرف لطیفوں تک محدود ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ ہمیں اردو زبان و ادب میں مزاح نگاری کے معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ایسے شعرا اور ادبا درکار ہیں جنھیں گزشتہ مزاح نگاروں کی طرح شعر گوئی کا سلیقہ آتا ہو۔ تالیف حیدر نے اس بات پر زور دیا کہ "مزاح نگاری اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک کسی شاعر کو معاشرے کی صحیح صورت حال کا علم نہ ہو۔ ایڈیشنل ڈی سی پی محمد علی نے ساغر خیامی کا ایک قطعہ پیش کیا اور نئے لکھنے والوں کو پرانے مزاح نگاروں کے ادب کا مطالعہ کرنے کی تلقین کی۔ اسرار جامعی نے اپنی اختتامیہ تقریر میں مزاح نگاری کو ادب کا مشکل ترین حصہ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ "لوگوں کو ہنسانا لوگوں کو رلانے سے کہیں زیادہ مشکل ہے، جس کام میں میں نے اپنی پوری زندگی خرچ کر دی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 جون 2014

تابش مہدی کو فریوائی ایوارڈ

لال گوپال گنج، الہ آباد: قصبہ کا مشہور و معروف تعلیمی ادارہ جامعہ ابوہریرہ الاسلامیہ (ترابا) میں ناظمِ جامعہ مولانا محمد حسان سلفی کی صدارت میں ایک علمی و ادبی تقریب منعقد کی گئی۔ اس میں ذمے دارانِ جامعہ سمیت اساتذہ وطلبہ کے علاوہ علاقہ کے معززین نے شرکت کی۔ اس تقریب میں معروف ادیب، شاعر، محقق و نقاد ڈاکٹر تابش مہدی کو ان کی ادبی خدمات کے صلہ میں (عبدالجبار فریوائی ایوارڈ) سے نوازا گیا۔ یہ ایوارڈ فریوائی اکادمی پریوانرائن پور، لال گوپال گنج الہ آباد (یوپی) کی جانب سے ہر سال کسی نہ کسی علمی شخصیت کو ان کی خدمات کے اعتراف میں پیش کیا جاتا ہے۔

جامعہ کے بانی و سرپرست اور فریوائی اکادمی کے ڈائرکٹر عبدالرحمن بن عبدالجبار فریوائی پروفیسر امام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی ریاض (سعودی عرب) نے ایوارڈ کے اغراض ومقاصد بیان کیے اور ساتھ ہی ڈاکٹر تابش مہدی کی شاعری اور فکر و فن پر روشنی ڈالی۔ صدر مجلس مولانا محمد حسان سلفی نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ آخر میں عبیدالرحمن خاں (نائب ناظم جامعہ) کے بدست ڈاکٹر تابش مہدی کو سندِ توصیفی سے نوازا گیا۔ بعد ازاں ڈاکٹر تابش مہدی نے اپنے تاثرات پیش کیے اور اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس تقریب کی نظامت مولانا صہیب حسن مدنی نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دلی، 14 جون 2014

مجلس فخر بحرین کے سرپرست شکیل احمد کو استقبالیہ

نئی دہلی: اردو زبان وادب کے قیمتی اثاثہ کی حفاظت اور اس کی تہذیبی روایات کی پاسداری اردو والوں کا عین فریضہ ہے۔ ان خیالات کا اظہار بحرین میں مقیم معروف ہندوستانی تاجر اور مجلس فخر بحرین کے سرپرست شکیل احمد نے انڈیا اسلامک سینٹر میں منعقد اپنی استقبالیہ تقریب سے کیا۔ تقریب کی نظامت آئیڈیا کمیونی کیشن کے ڈائرکٹر اور میزبان آصف اعظمی نے کیا۔ جبکہ تقریب کے اہم شرکا میں معروف نقاد پروفیسر شمیم حنفی، کمشنر لنگوسٹک مائنارٹیز پروفیسر اختر الواسع، انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے نائب صدر صفدر حسین خاں، روزنامہ راشٹریہ سہارا اور عالمی سہارا کے گروپ ایڈیٹر سید فیصل علی، روزنامہ سیاست کے مینیجنگ ایڈیٹر ظہیر علی خاں، ریلوے بورڈ کے ایگزیکیٹیو ڈائرکٹر گیانند پرشاد، این سی ای کے سابق سکریٹری حسیب احمد، ڈاکٹر رحمان مصور، طیب خاں وغیرہ شامل تھے۔ میزبان آصف اعظمی نے تعارفی کلمات پیش کیے اور کہا کہ شکیل احمد بڑی خاموشی سے بحرین میں اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر پروفیسر شمیم حنفی نے شکیل احمد کے نظم اور سلیقہ کی تعریف کرتے ہوئے ان کی خدمات کو سراہا۔ پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ اردو والے خود اردو سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ رائے شماری کے وقت بھی اردو کو مادری زبان درج کرانے میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ انھوں نے شکیل احمد کے کاموں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ اردو کو ایسے ہی سچے خادموں کی ضرورت ہے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 25 جون 2014

شمیم احمد کو مجاہد اردو کا ایوارڈ

کلکتہ: پندرہ روزہ سرپرست کے دو سالہ جشن میں مغربی بنگال سمیت ہندوستان بھر میں اردو کے فروغ کے لیے جدوجہد کرنے والے ہیومن رائٹس پروٹیکشن ایسوسی ایشن

کے قومی صدر اور قائد اردو شمیم احمد کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مقررین نے کہا کہ مغربی بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا جو درجہ ملا ہے وہ شمیم احمد کی مخلصانہ قیادت اور ان کی مثالی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ شمیم احمد کو مجاہد اردو ایوارڈ سے نوازا گیا اور ان کی اردو خدمات کی ستائش کی گئی۔ اس موقعے پر خطاب کرتے ہوئے شمیم احمد نے کہا کہ اردو زبان ایک مشترکہ تہذیب کی علامت ہے وہ مشترکہ تہذیب جس میں سنکھ وناقوس کی آواز اذان کی آواز میں شامل ہوکر پوری دنیا کو یہ باور کراتی ہے کہ قومیت کے جھگڑوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہم تو اس ملک میں لوگوں کو جوڑنے کے لیے ہیں۔ اس زبان کو جس قدر فنا کرنے کی کوشش ہوتی ہے تو وہیں اردو کی نئی بستیاں آباد ہوتی ہیں۔ شمیم احمد نے کہا کہ اردو دنیا کی تیسری سب سے بڑی زبان بن چکی ہے۔ اس موقعے پر ریاستی وزیر جاوید احمد خان نے اپنی تقریر میں کہا کہ مغربی بنگال میں ممتا بنرجی اقتدار میں آئیں تو اردو کو دوسری سرکاری زبان کا قانونی درجہ دیا۔ اس پروگرام کے مقررین میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر خواجہ اکرام، ممبر پارلیمنٹ ایڈوکیٹ ادریس علی، ڈپٹی میئر کولکاتا میونسپل کارپوریشن فرزانہ عالم، ترنمول لیڈر معین الدین شمس نے بھی اپنی تقریروں میں شمیم احمد کی خدمات کا اعتراف کیا۔ خیال رہے کہ شمیم احمد کی اردو خدمات کے اعتراف میں اس سے قبل بھی ملک کی تنظیموں نے ایوارڈ سے نوازا ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 25 جون 2014

محمد قیوم میو کو وقارِ ادب ایوارڈ

مالیگاؤں: انجمن ترقی اردو (ہند) کی مالیگاؤں شاخ کے زیرِ اہتمام مہاراشٹر راجیہ اردو ساہتیہ اکادمی اور اردو لائبریری ٹرسٹ مالیگاؤں کے اشتراک سے اردو لائبریری کے مسلم ہال میں 'مہاراشٹر میں افسانہ اور افسانچہ نگاری کی روایت' کے عنوان سے 22 جون 2014 کو ایک روزہ سیمینار منعقد کیا گیا۔ جس کا اہتمام جناب خیال انصاری (مدیر خیر اندیش) ہفتہ روزہ نے کیا۔ اس موقعے پر محمد قیوم میو کی تین کتابوں کا رسم اجرا بھی عمل میں آیا۔ 'بازیگر' افسانوی مجموعہ 'بدست ڈاکٹر مشتاق احمد وانی (جموں)، 'پتھر جیسے لوگ' (افسانوی مجموعہ) بدست جناب رونق جمال (دُرگ) ماڈرن اولادیں طنز و مزاح (ہندی) بدست الحاج محمد اسحق سیٹھ زری والا صاحب کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ پروگرام کے آخر میں محفلِ افسانہ اور افسانچہ خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر عمائدین شہر کے علاوہ کافی تعداد میں طلبہ اور طالبات موجود تھے۔

بذریعہ ڈاک: فرحان حنیف وارثی، مہاراشٹر، 30 جون 2014

ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی کی کتاب 'جنگ و امن کا تصور: اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات کے تناظر میں' کا اجرا

رسم اجرا:

جنگ و امن کا تصور: اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات کے تناظر میں

علی گڑھ: مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے دینی مدارس کے طلبا کے لیے برج کورس شروع کرکے ایک بڑی اہم ضرورت کو پورا کیا ہے جس کے لیے مدارس سے تعلق رکھنے والی یونیورسٹی برادری خصوصی طور پر ان کی ممنون و مشکور ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اسلامیات کے پروفیسر ظفرالاسلام نے کیا۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دینیات فیکلٹی کے زیراہتمام ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی کی کتاب 'جنگ و امن کا تصور: اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات کے تناظر میں' کی رسم اجرا تقریب سے خطاب کررہے تھے۔ شعبۂ دینیات کے استاد ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی نے کہا کہ اسلام کو دہشت گردی سے جوڑ کر دیکھا جارہا جب کہ اسلام کے معنی امن کے ہیں وہیں اسلام نے آئیڈیل معاشرہ کے لیے عدل و انصاف اور حقوق انسانی کے تحفظ پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ امن کے استحکام کے لیے جنگ بھی لڑی جاسکتی ہے۔ دینیات فیکلٹی کے ڈین پروفیسر علی محمد نقوی نے مہمانوں کا خیرمقدم کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی یونیورسٹی کی شہرت اس کے تحقیقی مقالوں کی اشاعت اور تحقیقی سرگرمیوں سے ہوتی ہے۔

وائس چانسلر ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ ہم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ تعلیمی جہاد میں فتح کے لیے دماغ کا استعمال کریں کیونکہ تعلیمی جہاد سے ہی یہاں کے طلبا کامیاب ہوسکتے ہیں۔ وائس چانسلر نے اس اہم موضوع پر کتاب کے مصنف ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی کو دلی مبارکباد پیش کی۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا جب کہ ڈاکٹر شارق عقیل نے پروگرام کی نظامت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر محمد زاہد، ڈاکٹر عبیداللہ فہد، ڈاکٹر جمشید صدیقی، ڈاکٹر ثمینہ خاں، ڈاکٹر وسیم راجہ، ڈاکٹر حافظ محمد الیاس، پروفیسر رحیم اللہ خاں، ناظم دینیات، ڈاکٹر محبوب الرحمن، ڈاکٹر راحت ابرار، ڈاکٹر فاطمہ زہرہ، طلبہ لیڈر توصیف عالم اور منظر حسین وغیرہ موجود تھے۔ پروگرام کا آغاز محمد ریحان اختر کی تلاوت کلام پاک سے ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 6 جون 2014

بیاول میں محفل افسانہ اور رسم رونمائی

اردو سوشل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر اکادمی یاول کے زیراہتمام مورخہ 23 جون 2014 بروز پیر مولانا آزاد ہال یاول میں آل انڈیا افسانچہ اکادمی کے صدر رونق جمال اور معروف قلمکار محمد قیوم میو کے اعزاز میں ایک محفل افسانہ احمد کلیم فیض پوری کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ اس محفل افسانہ کا افتتاح سماج سیوا ایوا منڈل کے صدر جناب ایم رفیق نے کیا۔ جب کہ محمد اسمٰعیل، اقبال الدین شیخ، جی این خان، عبدالروف شیخ بحیثیت مہمان خصوصی شریک تھے۔ اس موقعے پر جناب محمد قیوم میو کی تین کتب (1) پتھر جیسے لوگ (افسانے) (2)

بازی گر (افسانے) اور (3) ماڈرن اولادیں (طنز و مزاح) کی رسم رونمائی بالترتیب جناب رونق جمال، عبدالروف شیخ اور جناب ایس ایم انور کے ہاتھوں انجام پائی۔

پریس ریلیز، رحیم رضا، بیاول، مہاراشٹر، 27 جون 2014

پتھر بولتا ہے

الہ آباد: رجحان پبلی کیشن کے زیراہتمام سینئر شاعر افضل جائسی کے شعری مجموعہ 'پتھر بولتا ہے' کا رسم اجرا عسکری مارکٹ کریلی واقع اوپن ڈیل کلاسیس میں ہوا۔ اس کی صدارت سینئر نقاد پروفیسر سید محمد عقیل رضوی نے کی اور

نظامت پروفیسر علی احمد فاطمی نے کی۔ خصوصی مقرر کے طور پر کہنہ مشق شاعر و سینئر ایڈوکیٹ ہائی کورٹ ایم اے قدیر نے شرکت کی۔ پروفیسر سید محمد عقیل رضوی کے ہاتھوں رسم اجرا عمل میں آیا۔ ڈاکٹر نغمہ جائسی نے ایک مضمون پیش کیا جس میں انھوں نے اپنے والد افضل جائسی کی شخصیت اور شاعری پر مختصراً روشنی ڈالی۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اپنی تقریر میں کہا کہ افضل جائسی نے کبھی خود بڑے شاعر کا لیبل نہیں لگایا۔ ہمیشہ انکساری سے کام لیا۔ انھوں نے کہا کہ جب شاعر کی فکر میں انقلاب، جذبے میں شدت، اور زبان میں روانی پیدا ہوجاتی ہے تو پھر پتھر بھی بولنے لگتا ہے۔ پنجاب سے آئے ہوئے آئی پی ایس فیاض فاروقی نے اپنی تقریر میں کہا کہ شعر وادب کی جو تہذیب ختم ہورہی ہے، اسے زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سید محمد عقیل رضوی، آخر میں خود افضل جائسی نے کہا کہ میں نے جو بھی شاعری کی جو بھی سیکھا وہ بزرگوں کی صحبت اور خدمت کا طفیل ہے۔ بقول فاطمی
'پاؤں دابے ہیں بزرگوں کے تو فن آیا ہے میری شاعری جو بھی ہے آپ کے سامنے ہے اور مقررین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 17 جون 2014

عبدالودود انصاری کی کتاب 'ترقی کے زینے - سائنس اور ٹیکنالوجی' کے اجرا کا منظر

ترقی کے زینے - سائنس اور ٹیکنالوجی

کولکاتا: ہندوستان کے نامور سائنسی ادیب پرنسپل عبدالودود انصاری کی نئی کتاب 'ترقی کے زینے - سائنس اور ٹیکنالوجی' کی رسم اجرا یکم جون 2014 کو مغربی بنگال اردو اکادمی کے مولانا ابوالکلام آزاد آڈیٹوریم ہال میں پروفیسر عبدالرحیم خان کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ صدارت پروفیسر محمد منصور عالم (سابق ممبر پبلک سروس کمیشن وسکریٹری ایران سوسائٹی، کولکاتا) نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر پروفیسر منال شاہ القادری (وائس چیئرمین، مغربی بنگال اردو اکادمی) موجود تھے۔ دیگر مہمانوں میں پروفیسر شمیم انور، پروفیسر احسن شفیق، پروفیسر شاہد اختر، مصطفیٰ اکبر، حشمت کمال پاشا اور ایم علی بزم میں شریک تھے۔ نقابت خواجہ احمد حسین نے کی۔ پروگرام میں سبھی مقررین نے اپنی اپنی تقریروں میں ایک بات مشترک کہی کہ عبدالودود انصاری نے اپنی تحریروں میں سائنس اور ادب کا امتزاج بڑی خوبصورتی پیش کیا ہے۔ اسی لیے سائنس جیسے مشکل مضامین کو سہل نگاری کے ذریعے بچوں کو سامنے پیش کرنے میں عبدالودود کامیاب ہیں۔ آخر میں صدر نے یہ بات کہی کہ عبدالودود کی یہ کتاب ہندوستان کے سائنسی ادب برائے اطفال میں بہترین اضافہ ہے۔

بذریعہ ڈاک: محمد نسیم، استاذ: ڈاکٹر اے ایم اوغنی میموریل پرائمری اسکول، 26 دلکشا اسٹریٹ، کولکاتا، 10 جون 2014

عرفان اہل بیت

نوگانواں سادات: بتاریخ 9 شعبان المعظم مسجد قدرت علی محلہ بازار نوگانواں سادات میں ایک محفل مقاصدہ بنام یوم حسین منعقد کی گئی جس میں عالمی شہرت یافتہ اور بے نظیر و بے مثال لب ولہجہ رکھنے والے اردو ادب کے ماہر جناب شعیب عابدی نوگانوی کا مجموعہ کلام عرفان اہل بیت کا رسم اجرا کیا گیا اس رسم اجرا کے موقعے پر ہندوستان کے معزز ترین شعرا و ادیب اور سیاسی دنیا سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات موجود تھیں اس موقعے پر ڈاکٹر سید حسن اختر عابدی مدرس جامعہ باب العلم نوگانواں سادات نے اپنی تقریر کے دوران اس نظمی مجموعہ کی بے پناہ تعریف کی اور کہا کہ اتنی کم عمر میں اس عظیم شاہکار مجموعہ کا پیش کرنا خود بہت بڑا کمال ہے۔ قابل ذکر بات ہے کہ شعیب نوگانوی مسلسل کئی دہائیوں سے اردو شاعری اور رثائی شاعری کی دنیا میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں اور بیرون ملک میں قطر، دبئی، بحرین، پاکستان، جدہ وغیرہ کا دورہ کر چکے ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 جون 2014

وابستہ

نئی دہلی: مسجد باب العلم اوکھلا وہار دہلی میں سادات امروہہ ویلفیئر آرگنائزیشن دہلی کے زیر اہتمام ماہنامہ وابستہ

آئینہ منصور

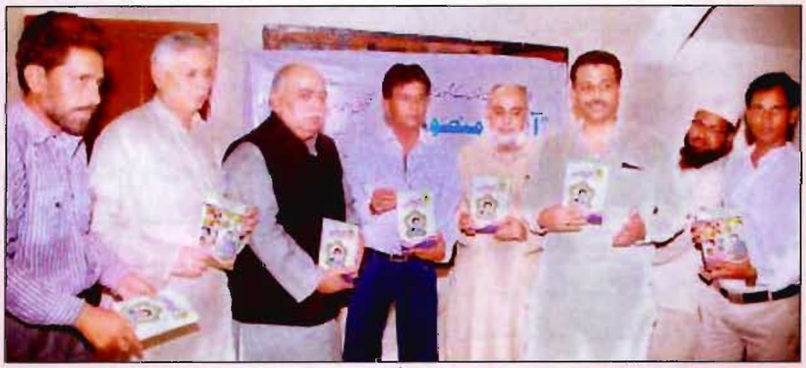

لکھنؤ: سید عبدالعزیز ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام سنکھری ہاؤس، کریم گنج میں ڈاکٹر منصور حسن خاں کے شعری مجموعۂ کلام 'آئینہ منصور' کی تقریب رسم اجرا پورے تزک واحتشام سے عمل میں آئی۔ اس شعری وادبی تقریب کی صدارت شکیل احمد سید ایڈوکیٹ سپریم کورٹ نے کی جب کہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے ظفریاب جیلانی ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل اتر پردیش، عالمی شہرت یافتہ شاعر وادیب وسابق صدر اتر پردیش اردو اکادمی منور رانا اور ایم ایل سی سہارنپور مشتاق چودھری شریک ہوئے۔ نظامت قاری رضی الدین صدیقی نے کی۔ تقریب کا آغاز مولانا انجم الحق کی تلاوت کلام پاک اور مجیب فتح پوری کی نعت پاک سے ہوا۔ مہمانوں کا پرجوش استقبال سید حسیب احمد عرف گڈو نے کیا۔ دیگر خصوصی شرکا میں ڈاکٹر ثروت تقی کے علاوہ مسعود جیلانی اڈیٹر اردو روزنامہ 'قومی سالار' دلشاد حسین ایڈوکیٹ، ڈاکٹر نسیم احمد انصاری، شیخ عبداللہ، عمر علی، انور حبیب علوی، حافظ ابوالکلام، محمد رضوان ملیح آبادی، محمد کلیم خاں، مجیب احمد ایڈوکیٹ، ڈاکٹر زبیر ملک، عقیل حسین، محمد سفیان اور رشید حسین کے نام قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 جون 2014

کے پہلے شمارے کا رسم اجرا بدست مولانا ڈاکٹر شہوار نقوی امام جمعہ شیعہ جامع مسجد مراد آباد عمل میں آیا۔ اس رسم اجرا کے موقعے پر ڈاکٹر عظیم امروہوی، شان حیدر بیباک امروہوی، غلام سجاد، ڈاکٹر لاڈلے رہبر، ایڈیٹر حسن بن علی رضن، چیف ایڈیٹر علی ظہیر نقوی، سید عباس رضا راجو سید رضی رکن مجلس ادارت کے علاوہ اقبال رضا، حسن ضیا، موسیٰ رضا، مظفر محسن موجود تھے۔ اس موقعے پر سید غلام سجاد نگراں و سرپرست ادارہ سادات امروہہ ویلفیئر آرگنائزیشن نے کہا کہ ماہنامہ وابستہ کی اشاعت کا مقصد نوجوانوں میں اخلاقی اقدار و اسلامی تعلیمات کے ساتھ تعلیمی امور اور کیریئر سے متعلق رہنمائی کرنا ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 جون 2014

نئے دور کی تعمیر

مبارکپور، اعظم گڑھ: نگر پالیکا پریشد مبارکپور و بزم محسن اسلام پورہ مبارکپور کے زیر اہتمام منعقدہ تقریب رسم اجرا میں ڈاکٹر محسن ادیبی کے مجموعہ کلام 'نئے دور کی تعمیر' کی رسم رونمائی بدست ڈاکٹر شمیم احمد چیئرمین نگر پالیکا پریشد مبارکپور عمل میں آئی۔ رسم اجرا کے بعد ڈاکٹر شمیم احمد نے محسن ادیبی کی ادبی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ محسن ادیبی نے اپنی اعلیٰ شاعری کے ذریعے اردو کو جس ارتقائی منزلوں سے گزارا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔ یہ کتاب سرمایہ ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اس مجموعے میں ایسے تخلیقی شہ پارے موجود ہیں جس سے نئی نسلیں استفادہ کرتی رہیں گی۔ عمار ادیبی نے کتاب اور صاحب کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ محسن ادیبی کی شاعری قدیم و جدید ادب سے ہم آہنگ ہے۔ ان کا کلام سماج کا آئینہ دار بھی ہے اور حالات حاضرہ کا عکاس بھی۔ ان کے مجموعے کا ایک ایک شعر ان کے آفاقی تخیلات اور ذہنی بالیدگی کا ترجمان ہے۔ مولانا قمرالزماں مبارکپوری نے کہا کہ ڈاکٹر محسن ادیبی نے مبارک پوری کے ادبی ماحول کو اپنی شعری ضیا پاشی سے منور کیا۔ اس کے علاوہ دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جون 2014

وفیات

مشہور اداکارہ زہرہ سہگل کا انتقال

نئی دہلی: مشہور فلم اداکارہ اور تھیٹر آرٹسٹ زہرا سہگل کا 10 جولائی 2014 کو 102 سال کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہوگیا۔ زہرا سہگل کی بیٹی کرن نے بتایا کہ زہرا سہگل کا انتقال دہلی کے میکس اسپتال میں ہوا۔ انھوں نے بتایا کہ شام کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ وہ گزشتہ تین چار دن سے بیمار چل رہی تھیں۔ سہگل کی آخری رسم لودھی روڈ شمشان

گھاٹ میں ادا کی گئی۔ ہندوستانی سنیما کی تجربہ کار اداکارہ زہرا سہگل جنوبی دہلی کے مندا کنی انکلیو میں اپنی بیٹی کرن سہگل کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ انھیں پدم وبھوشن سے نوازا گیا تھا۔ زہرا نے اپنے کریئر کا آغاز ایک رقاصہ اور ڈانس ڈائریکٹر کے طور پر کیا تھا۔ ان کی پیدائش 27 اپریل 1912 کو اتر پردیش کے سہارنپور میں ہوئی تھی۔ زہرا نے ادے شنکر کی رقص ٹیم میں رقاصہ کے طور پر اپنے کریئر کا آغاز کیا۔ بعد میں وہ پرتھوی راج کپور کے پرتھوی تھیٹر سے منسلک ہوگئیں اور وہاں انھوں نے کئی ڈراموں میں کام کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جولائی 2014

مشتاق پردیسی

لکھنؤ: معروف صحافی، مفکر، شاعر و ادیب اور روزنامہ راشٹریہ سہارا کے سابق ایڈیٹوریل ایڈوائزر مشتاق پردیسی کا طویل علالت کے بعد 12 جون کو موتی جھیل کالونی، عیش باغ میں واقع ان کے مکان پر انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 84 برس تھی۔ مشتاق پردیسی کا شمار اردو کے معروف صحافیوں میں ہوتا تھا۔ انھوں نے عشرت علی صدیقی اور حیات اللہ انصاری کے ساتھ کام کیا تھا۔ وہ انتہائی ملنسار، خوش اخلاق اور نیک طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے انتقال سے اردو صحافت کے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا۔ ان کی صحافتی زندگی تقریباً 40 برس پر محیط ہے۔ انھوں نے قومی آواز، نیشنل ہیرالڈ میں اپنی خدمات انجام دیں۔ دوردرشن اور آکاش وانی سے تقریباً 15 سے 20 برسوں تک وابستہ رہے۔ انھیں ایک درجن سے زائد ایوارڈ سے بھی نوازا گیا تھا۔ ان کا شعری مجموعہ 'دیوان خاص' کے نام سے شائع ہوکر منظر عام پر آچکا ہے۔ مزاحیہ شاعری میں بھی انھوں نے اپنی منفرد شناخت بنائی۔ پسماندگان میں 4 بیٹے اور ایک بیٹی ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 13 جون 2014

محی الدین عالمگیر

نئی دہلی: سینئر صحافی محی الدین عالم گیر کا 9 جون کو انتقال ہوگیا۔ ان کی تدفین بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔ محی الدین عالم گیر 1980 میں اردو صحافت سے وابستہ ہوئے اور آزاد ہند، اخبار مشرق اور آبشار سے وابستہ رہے، بعد ازاں 1997 میں یو این آئی اردو سے وابستہ ہوگئے۔ ذرائع کے مطابق طبیعت خراب ہونے پر ان کو الشفا اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا مگر ڈاکٹروں نے ان کو ایسکارٹ لے جانے کی صلاح دی جہاں پہنچ کر انھوں نے آخری سانس لی۔ عالمگیر 1957 میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوی کے علاوہ دو بیٹے دو بیٹیاں شامل ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 11 جون 2014

خراج عقیدت

سکندر احمد کی پہلی برسی

دھولیہ (شعیب انصاری): اردو کے معروف نقاد جناب سکندر احمد مرحوم کی پہلی برسی کے موقعے پر انھیں خراج پیش کرنے کے لیے ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن شولاپور کے زیر اہتمام، مہر فاؤنڈیشن دھولیہ، مائنارٹی ویلفیئر ایجوکیشن سوسائٹی دھولیہ کے اشتراک سے بروز جمعہ 9 مئی 2014 مہر فاؤنڈیشن ہال دھولیہ میں تعزیتی جلسہ سکندر احمد کے نام منعقد کیا گیا جس کی صدارت دھولیہ کے سابق میونسپل کارپوریشن ڈپٹی میئر جناب شوال امین نے کی۔ شولاپور سے تشریف لائے ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن کے صدر سلطان اختر نے سکندر احمد کے تئیں والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدور پیدا ہوا۔ سکندر مرحوم غیر معمولی صلاحیت، بیباکانہ ونڈر مزاج کے مالک تھے۔ بہت ہی مختصر عرصے میں انھوں نے بحیثیت نقاد اپنا مقام بنایا۔ انھوں نے اپنی مختصر زندگی میں جو کچھ بھی لکھا وہ شاہکار ادب کا درجہ رکھتا ہے۔ مہر فاؤنڈیشن کے صدر ڈاکٹر شبیر اقبال نے سکندر احمد کے انتقال کو اردو زبان و ادب کا خسارہ قرار دیتے ہوئے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ سکندر احمد چوٹی کے نقاد تھے۔ انھوں نے اپنے رشحات قلم سے اردو زبان کی جو خدمت کی ہے اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی اہلیہ غزالہ سکندر احمد مبارکباد کی مستحق ہیں کہ انھوں نے مرحوم کے مضامین کو 500 صفحات پر مبنی کتاب 'مضامین سکندر احمد' مرتب کیا۔ صدر جلسہ شوال امین نے تمام مقررین کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے سکندر احمد مرحوم کی خدمات کا اعتراف کیا اور انھیں اس دور کا جید نقاد دانشور قرار دیا۔ نظامت کے فرائض جاوید حسین جاوید نے بحسن خوبی انجام دیے اس موقعے پر عابد حسین اسمٰعیل شاد (نامہ نگار 'انقلاب') نثار احمد پپو، نواب سر، مسعود اختر (شہادہ) اصحاب بھیا، شکیل انصاری، ارباز عارج، عبدالحفیظ کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ موجود تھے۔

بذریعہ ڈاک: مہر فاؤنڈیشن، 15 مئی 2014